سلسبیل

پرویز

طلوعِ اسلام ٹرسٹ ۲۵ بی، گلبرگ ۲ لاہور

فہرست مضامین

باسمہٖ تعالیٰ

پیش لفظ

"تاریخ کے ہر بے حس موڑ پر ایسے محروم الارث بچّے ملیں گے جو اپنے ماضی کے ترکے کو خود چھوڑ چکے ہوں (کیونکہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کے قابل نہیں تھے) اور جو کچھ مستقبل میں سامنے آنے والا ہو، اس کی نمود میں ابھی دیر ہو۔"

یہ تھے وہ حقیقت افروز اور فکر انگیز الفاظ جو جرمنی کے مشہور شاعرِ انقلاب، رلکے (RILKE) نے بیسویں صدی کے طلوعِ سحر کے وقت آنے والی نسل کے ذہنی اور قلبی اضطراب کو سامنے رکھ کر انتہائی درد و کرب میں ڈوب کر کہے تھے۔ جرمنی کی نئی نسل ان دنوں جس کرب و اضطراب میں مبتلا تھی، ہمیں اپنے پیشِ نظر موضوع میں اس کا تذکرہ مقصود نہیں۔ ہمارے سامنے خود اپنی ملّت کی وہ داستانِ غم ہے جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس برِصغیر کے ہر قلبِ حسّاس کو خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ جن دنوں جرمنی کا یہ شاعرِ انقلاب اپنی نئی نسل کے داخلی ہیجان و اضطراب کا مرثیہ پڑھ رہا تھا، انہی دنوں ہمارے ہاں بھی، رنگون سے لے کر پشاور تک، ذہنی شکست اور فکری جمود کی دردناک تاریکیاں چھا رہی تھیں۔ اور نئی نسل قلب و نگاہ کی شدید کشمکش میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔ وقت کے تقاضوں نے ہمیں اس نازک مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں فکر و بصیرت کی روشنی میں ہی مستقبل کے سفر کا تعین ممکن تھا لیکن ہماری تربیت گاہیں، مسلکِ تقلید اور قدامت پسندی کی مقدس بارگاہوں سے جو ورثہ پا رہی تھیں اس میں اور تو بہت کچھ رطب و یابس موجود تھا، فکر و بصیرت کی روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ پوری ملّت ذلّت اور شکست کے زخموں سے مضمحل اور نڈھال ہوئی جا رہی تھی اور ملّت کے پیشوا موت کا وہی پرانا راگ الاپ رہے تھے کہ آنکھیں بند کئے اسلاف کی ان پامال راہوں پر قدم اٹھاتے چلے جاؤ اور جو کچھ لٹتا ہے لُٹ جانے دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کی اس گردشِ دولابی میں افرادِ ملّت کے سامنے نہ کوئی منزل رہی اور نہ دلوں میں ذوقِ

سفر کی امنگیں اور ولولے۔

حیاتِ ملّی کا یہی وہ صبر آزما اور جانگسل مرحلہ تھا جب اس کے مطلعِ تقدیر پر صبحِ اُمید کا ایک روشن ستارہ جلوہ بار ہوا۔ یہ سرسیّد علیہ الرحمۃ کی جلیل القدر اور گرانمایہ شخصیت تھی جس نے زمانے کے چیلنج کو مردانہ وار لبیک کہتے ہوئے ابھرتی ہوئی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کا حیات آفریں منصوبہ ترتیب دیا اور ملّت کے بے بال و پر شاہین بچوں کو ذوقِ پرواز سے مالا مال کرنے کی گراں قدر سعی و کاوش کی۔ دوسری طرف اس مسیحائے ملت نے فکر و اجتہاد کے صدیوں کے بند دروازوں کو مومنانہ فراست اور جرأت سے کھول کر رکھ دیا۔ اس قابلِ رشک "جرم" کے لئے سرسیّد کو مذہبی پیشوائیت کی بارگاہ سے کتنی بڑی "سزا" قبول کرنی پڑی، یہ بجائے خود ایک المناک داستان ہے لیکن سرسیّد کی اس جرأت و فراست پر ملّت کا سلام ہو کہ اس نے سب کچھ مردانہ وار گوارا کیا اور کاروانِ ملّت کو ذہنی شکست اور موت کے قبرستانوں سے بچا کر فکر و بصیرت، ذوقِ انقلاب اور جوششِ کردار کی درخشندہ اور بسیط کارگہِ حیات میں لے آیا۔ ہماری نشاۃ ثانیہ کی یہ پہلی منزل تھی اور یہ پہلا میرِ کارواں جب دنیا سے رخصت ہو رہا تھا، تو اس کی قوم اپنے نئے ماحول کی اُبھرتی ہوئی روشنی میں درخشندہ مستقبل کی منزلوں پر نگہِ امید جمائے ہوئے تھی۔

سرسیّدؒ قوم کو نئی منزلوں کا ذوقِ سفر عطا کر کے رخصت ہو گئے۔ علی گڑھ کی تربیت گاہ ان کے فکر و عمل کا نادر روزگار شاہکار بن کر قوم کا گراں قدر ورثہ قرار پا گئی اور اس کی کشت زارِ علم و بصیرت سے ہزاروں لالہ و گل ابھر ابھر کر نئی بہاروں کے نقیب بننے لگے۔ انہی لالہ زاروں سے لونِ نکہت کی دلکشائیاں لئے ایک نیا گلِ سرسبد مسکرایا اور انقلابِ نو کے اس طائرِ پیشرس نے اپنے نغمۂ انقلاب سے فضائے چمن میں زندگی کی شمیم جانفزا کو متحرک کر دیا۔ یہ گراں مایہ شخصیت علاّمہ اقبالؒ کی تھی جنھوں نے نئی نسل کے قلب و نگاہ کو اپنی بصیرتِ قرآنی سے منوّر کیا۔ اس کے ذوقِ عمل کو نئی حرارت عطا کی اور اس کی امنگوں اور ولولوں کو موجِ دریا کی طرح بڑھنے لیکن اقدارِ حیات کے ساحلوں میں پابند رہنے کی حکمت سمجھائی۔ اقبالؒ کے نغمے قرآن کی دعوتِ انقلاب کے سچے ترجمان تھے اور ان کی حیات بخشیوں اور روح نوازیوں میں عظمتِ رفتہ کی بازآفرینیوں کے لئے ایک مردِ مومن کی تڑپ اور سوز و ساز انگڑائیاں لے رہا تھا۔ ایسا حکیمِ انقلاب صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور اس کے سانحۂ رحلت پر یہ اندیشے ابھر آئے تھے کہ اس کے فکر و بصیرت کی عطا کردہ روشنی کہیں مذہبی پیشوائیت کے پھیلائے ہوئے اندھیروں کی زد میں نہ آ جائے۔

لیکن المنۃ للہ کہ یہ اندیشے غلط ثابت ہوئے اور عین اس وقت جبکہ "دگر دانائے راز آید کہ ناید" کے دھڑکے ملّت کے سینے میں ایک کشمکشِ اضطراب برپا کئے ہوئے تھے، "طلوعِ اسلام" کی یہ پہلی کرن دارالسلطنت دہلی سے

ابھری ـــــ اور اس کی بیتاب نگاہوں کے سامنے آگئی۔ یہی تھی وہ " دولتِ پرویز " جسے اقبالؒ کی " نواؤں کی بہا " بننا تھا۔ کچھ مدت پہلے ہی تو اس مردِ قلندر نے کہا تھا کہ

بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

اور موت سے پہلے یہی " دولتِ پرویز " طلوعِ اسلام کی پہلی اشاعت کی صورت میں اقبالؒ کے ہاتھوں میں تھی۔

اقبالؒ و پرویز کے فکری تعلقات، ان کے قلب و نگاہ کی ہم آہنگی اور ہم نوائی، قرآن سے عشق کا گہرا رشتہ اور ملت کی عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے ربطِ باہمی کی تڑپ اور خلش، یہ سب کچھ اس خوش آئند حقیقت کی نشاندہی کر رہا تھا کہ اقبال نے خونِ جگر سے جس شمع کو روشن کیا تھا، وہ بجھ نہیں سکے گی بلکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کی ضو فشانیاں بڑھتی اور پھیلتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ جب علامہ مرحوم کی وفات کے بعد بھی مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے معرکۂ دین و وطن کی بحث کو از سرِ نو چھیڑ دیا تو پرویز صاحب نے اپنے جوابی بیان میں مولانا مرحوم کو یہ حقیقت یاد دلاتے ہوئے لکھا تھا کہ

اگرچہ مے کدہ سے اٹھ کے چل دیا ساقی وہ مے، وہ خم، وہ صراحی، وہ جام باقی ہے

اللہ کا احسان ہے کہ اس جام و سبو کی گردش کا سلسلہ اب بھری محفلوں میں جاری و ساری ہے اور صرف اقبالؒ کے پاکستان میں ہی محدود نہیں بلکہ اس کی کیف انگیزیاں امریکہ، برطانیہ اور سعودی عرب تک کیف و مستی کی بساط بچھائے ہوئے ہیں اور ہماری نئی نسل کے " سلیم بیٹے " اور " طاہرہ بیٹیاں " دینِ خداوندی سے جذب و انہماک کی سچی تڑپ دلوں میں لئے اس خمکدۂ قرآنی کا رُخ کر رہی ہیں جو حیاتِ انسانی میں حسین ترین انقلاب لانے کا داعی ہے۔

اپنی اس جہاں آرا دعوتِ قرآنی کی بنا پر آج پرویز صاحب کو عصرِ حاضر کے ایک شہرۂ آفاق مفکرِ قرآن کا مقام و منصب حاصل ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے اربابِ فکر و نظر ان کی وساطت سے قرآن کی دعوتِ انقلاب کے مضمرات کو سمجھنے کے لئے متمنی دکھائی دے رہے ہیں اور اسی بنا پر دعوتِ قرآنی کے ان شہ پاروں کو جو پرویز کے قلم سے منظرِ اشاعت پر آئے، انگریزی زبان میں منتقل کرنے کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ معراجِ انسانیت، جوئے نور، برقِ طور، شعلۂ مستور، ابلیس و آدم، من و یزداں، انسان نے کیا سوچا؟، نظامِ ربوبیت، سلیم کے نام خطوط، طاہرہ کے نام خطوط، لغات القرآن، مفہوم القرآن، اسبابِ زوالِ اُمت دعوتِ قرآنی کے وہ نمایاں شاہکار ہیں جن میں سے بعض کئی کئی ایڈیشنوں میں منظرِ اشاعت پر آ چکے ہیں۔ اسلام کیا ہے؟ ان کی تازہ تصنیف ہے۔ جسے بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ سب قلمی کاوشیں، قرآنی فکر و بصیرت کے درخشاں چراغ ہیں جو ہر محفلِ انسانی کو نئی روشنی عطا کرتے رہیں گے اور علم و بصیرت کی ہر بارگاہ ان سے کسبِ نور کی سعادت حاصل کرے گی۔

ان گرانقدر تصانیف کے علاوہ گذشتہ پچیس تیس برس میں جو اہم مسائل انسانی زندگی میں ابھرے، ان پر قرآن کا نقطۂ نظر پرویز صاحب کے ان مضامین، مقالات، خطابات اور تقاریر کی صورت میں سامنے آتا رہا جو مختلف اوقات میں ریڈیو پر نشر ہوتے، پبلک اجتماعات میں سنے گئے اور طلوعِ اسلام کے کالموں میں شائع ہوتے رہے۔ مدت ہوئی ان شاہپاروں کو "فردوسِ گم گشتہ" کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ جب یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ بک گئی، تو کئی سال کے وقفے کے بعد پچھلے سال ان مقالات کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ایک نئی ترتیب دی گئی۔ اس سلسلۂ ترتیب کا پہلا حصہ "فردوسِ گم گشتہ" کے دوسرے ایڈیشن کے نام سے پچھلے سال شائع کر دیا گیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب "سلسبیل" اسی کا دوسرا حصہ ہے اور اس میں پرویز صاحب کے بڑے گرانقدر مضامین آ گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پرویز صاحب کے دیگر شاہپاروں کی طرح یہ اہم تالیف بھی قارئین کو عصرِ حاضر کے پیش آمدہ مسائل کے بارے میں ایک نئی روشنی عطا کرے گی جس سے مسائلِ زندگی کے بہت سے گوشے نکھر کر سامنے آ جائیں گے اور قلب و نگاہ کو ایک نئی آب و تاب میسر آئے گی۔

اس کے بعد مقالاتِ پرویز کا تیسرا مجموعہ بھی اپنے وقت پر شائع ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شمعِ قرآنی کو تادیر روشن رکھے۔ والسلام۔

۲۵۔ بی، گلبرگ، لاہور۔
مارچ ۱۹۶۴ء۔

(صفدر سلیمی)
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

مِیثاقِ خُداوندی

(جولائی ۱۹۴۹ء)

عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی حکومت کی ملازمت اختیار کرتا ہے تو اسے ایک ایسا منشور دیا جاتا ہے جس میں اس کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کی تصریح اور اس کے حقوق و واجبات کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ اس منشور کی ایک ایک شق کو بغور پڑھے اور اس کے بعد اپنے عرصۂ ملازمت میں ان پر کاربند رہے۔ گویا یہ منشور ایک عہدنامہ ہوتا ہے جو حکومت اور اس کے عمّال کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اگر کہیں اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے عمال کو کس قسم کے منشورِ حقوق و فرائض کا پابند ہونا پڑے گا اور وہ کون سا عہدنامہ ہوگا جس کی پابندی ان پر لازم ہوگی؟ اس منشور کی ترتیب کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی حکومت کا مدار قرآنی آئین پر ہوگا اور قرآن نے ان تمام فرائض و واجبات کی بھی تصریح کر دی ہے جو اس حکومت کے اربابِ نظم و نسق پر عائد ہوں گے۔ لہٰذا یہ منشور قرآن کے مطالعہ سے بآسانی مرتّب ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ہم اسی قسم کے منشور کا ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ عمّالِ حکومتِ اسلامیہ کا یہ عہدنامہ ان کے اور حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ (یعنی ان کے خدا) کے مابین ہوگا، اس لئے ہم نے اس کا عنوان ”میثاقِ خداوندی“ مناسب سمجھا ہے۔

یہ میثاق یوں مرتّب کیا جا سکے گا۔

۱۔ بنیادی اصول تم ایک ایسی حکومت کے اربابِ حل و عقد کے زمرہ میں داخل ہو رہے ہو جو اس ابدی صداقت پر قائم ہے کہ حکومت کی سزاوار صرف خدا کی ذات ہے۔ (۱۲/۴۰)

اس سے مفہوم یہ ہے کہ تمھیں اپنے معاملات اور کاروبار، احکام اور فیصلوں میں ان غیر متبدل قوانین کا اتباع کرنا ہوگا، جو

خدائے حکیم و بصیر نے انسانی معاملات کے حل اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لئے (قرآن میں) عطا فرمائے ہیں اور اس اصل الاصول کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنا ہوگا کہ تم اپنے ہر کام کے لئے اس خدا کے سامنے جوابدہ ہو گے جو نگاہ کی خیانت اور دل کے رازوں تک سے باخبر ہے۔" (۴۰/۱۹)

تم یہ عہد اپنے خدا کے ساتھ استوار کر رہے ہو۔ اس لئے اسے اچھی طرح سمجھ لو کہ اس کو ہر حالت میں نباہنا ہوگا۔ وہ خدا، جس کا ارشاد ہے کہ

"نصیحت وہ صاحبانِ علم و عقل حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے ساتھ بندھے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اقرار کو کبھی نہیں توڑتے۔" (۱۳/۲۰)

۲۔ مقصدِ اولیٰ

تمہاری زندگی کا بنیادی اصول امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۳۱/۱۷) ہونا چاہیئے۔ یعنی خدا کے احکام کی تنفیذ۔ جس چیز کا حکم اس نے دیا ہے اس کا رائج کرنا اور جس سے اس نے منع کیا ہے، اس سے لوگوں کو روکنا۔

۳۔ عمل

اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے تم خود ان احکام کی پابندی کرو۔ اگر تمہارے قول اور فعل میں تضاد اور احکام اور کردار میں تخالف ہوگا، یعنی جو حکم تم نافذ کرو گے، اس کی شہادت خود تمہارے عمل سے نہیں ملے گی، تو وہ ایمان داری نہیں، منافقت ہوگی اور حکومت خداوندی میں منافقین کا کوئی کام نہیں۔ اس حکومت کا پہلا حکم یہ ہے کہ

"اے ایمان والو! تم وہ کچھ کہتے کیوں ہو جو خود کر کے نہیں دکھاتے۔ یاد رکھو اللہ کے نزدیک یہ طرزِ عمل بڑا مذموم ہے کہ تم زبان سے وہ کچھ کہو جس کی تائید تمہارے عمل سے نہ ہو رہی ہو۔" (۶۱/۲-۳)

۴۔ عدل

تمھیں لوگوں کے مقدمات میں ثالث بننا ہوگا۔ ان کے نزاعی امور کے فیصلے کرنے ہوں گے۔ لوگ اپنے معاملات تمہارے پاس لائیں گے۔ اس باب میں ہمیشہ یاد رکھو کہ

"اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرو تو ہمیشہ عدل و انصاف سے کام لو۔" (۴/۵۸)

خواہ یہ فیصلہ تمہارے دوستوں یا رشتہ داروں کے بھی خلاف کیوں نہ جائے کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ

"جب تم بات کرو تو عدل و انصاف کی کرو، خواہ وہ تمہارا قریبی ہی کیوں نہ ہو اور (اس طرح)

اللہ کے عہد کو پورا کرو۔" (۶/۱۵۳)

بلا لحاظ اس امر کے کہ فریقِ متعلقہ امیر ہے یا غریب، حتیٰ کہ اس کی زد خواہ تمہاری اپنی ذات پر بھی کیوں نہ پڑے۔

" اے ایمان والو! انصاف کی پوری محافظت کرنے والے اور فقط اللہ کی خاطر شہادت دینے والے بنو۔ خواہ معاملہ خود تمہاری اپنی ذات، ماں باپ یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ خواہ غریب ہو یا امیر، اللہ کا دونوں پر (تمہارے رجحانات کی نسبت) زیادہ حق ہے۔ سو تم اپنے رجحانات و میلانات کی پیروی مت کرو تاکہ تم عدل کر سکو۔ اگر تم سچائی سے اعراض برتو گے یا گول مول بات کرو گے تو یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔ (۴/۱۳۵)

عدل! نہ صرف اپنے لوگوں کے ساتھ بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل۔

" اے ایمان والو! اللہ (کے عہدنامہ کی) حفاظت کرنے والے اور انصاف کی شہادت دینے والے بن جاؤ۔ (یاد رکھو) کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دو۔ (ہر حال میں اور ہر شخص کے ساتھ) انصاف کرو۔ یہی روش تقویٰ سے قریب تر ہے"۔ (۵/۸)

صرف عدل ہی نہیں بلکہ مستحق لوگوں سے احسان بھی کرو کیونکہ

" (تمہارا) اللہ عدل اور احسان (دونوں کا) حکم دیتا ہے۔ (۱۶/۹۰)

۵۔ امانت

یاد رکھو! اس ادارۂ حکومت کی رکنیت قبول کر کے تم نے ایک بارِ عظیم اپنے ذمہ لیا ہے۔ یہ خدا کی امانت ہے۔ اس امانت کو بھی دیانت داری سے پورا کرنا اور ان امانات کو بھی جو دیلسے تمہارے سپرد کی جائیں۔

" اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتماد کرتا ہے، تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہیئے کہ اپنی اس امانت کو بحُسن و خوبی پورا کرے۔ (۲/۲۸۳)

دوسری جگہ ہے:۔

" امانات کو ان کے اہل تک پہنچایا کرو۔" (۴/۵۸)

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ ہر منصب اور عہدہ کے لئے معیارِ انتخاب اہلیت و قابلیت ہونا چاہیئے نہ کہ اعزہ نوازی و اقرباپروری، مناصب و مدارج، جن کا انتخاب تمہارے ذمہ رکھا گیا ہے، خدا کی امانت ہیں۔ ان امانات کو ان لوگوں تک پہنچاؤ جو اس کے اہل ہوں۔ نااہل لوگوں کو بھرتی نہ کئے جاؤ۔

جن جن معاملات میں تم پر اعتماد کیا جاتا ہے، اس اعتماد میں پورے اترو۔ اور اپنے اعتماد کو ہمیشہ نبھاؤ کیونکہ تم جانتے ہو (کہ اعتماد شکنی غداری ہے اور غداری سے قومیں تباہ ہو جایا کرتی ہیں)۔ (۸/۲۷)

اور شر انگیز سازشوں میں نہ الجھو کیونکہ مآلِ کار۔

"شر انگیز سازش خود اس کو پھانس لیا کرتی ہے جو اسے وضع کرتا ہے۔" (۳۵/۴۳)

۶۔ باہمی تعاون

حسنِ نظم و نسق کا راز باہمی تعاون میں ہے لیکن تعاون فلاح و بہبود کے کاموں میں ہونا چاہیئے نہ کہ فتنہ و فساد کے کاموں میں۔ لہذا

"نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون کرو۔ برائی اور سرکشی کے معاملات میں تعاون نہ کرو۔" (۵/۲)

تم تمام عمالِ حکومت ایک ہی برادری کے افراد اور ایک ہی مشین کے پُرزے ہو۔ اس لئے تم میں باہمی رقابتیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہرگز نہیں ہونی چاہئیں۔ اگر تمھیں بعض مصالحِ وقت کی بناء پر۔

"باہمی خفیہ مشورے بھی کرنے ہوں تو یہ مشورے جرم و بغاوت کے مشورے نہیں ہونے چاہئیں بلکہ نیکی اور تقویٰ کے مشورے ہونے چاہئیں۔" (۵۸/۹)

اور نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ کوئی کہے تو دستِ تعاون بڑھایا جائے بلکہ خود بخود آگے بڑھو اور دوسروں کو اس میں شریک ہونے کی تاکید کرو۔ اس لئے کہ کامیابی انہیں کے لئے ہے۔

"جو ایک دوسرے کو حق و استقامت کی تلقین و تائید کرتے رہتے ہیں۔" (۱۰۳/۳)

ہر ایک کو اپنا اپنا کام اپنی صوابدید کے مطابق کرنے دو۔ خواہ مخواہ دوسروں کے شعبوں میں دخل اندازی نہ کرو۔ لیکن اگر دیکھو کہ کسی معاملہ میں آپ کا کوئی ہم جلیس حقیقتِ حال سے بے خبر ہونے کی وجہ سے غلط فیصلہ کر رہا ہے تو اسے اصل حالات سے باخبر کر دو۔ اس قسم کی دخل اندازی (سفارش) موجبِ فلاح و فوز ہوگی۔ اس لئے کہ

"جو کوئی بھلی بات میں سفارش کرے گا تو اس کو اس میں حصہ ملے گا اور جو کوئی برائی کی سفارش کرے گا تو اس کی پاداش میں بھی اس کا حصہ ہوگا۔" (۴/۸۵)

۷۔ نظم و نسق

معاملات کے فیصلے یوں ہی اڑتی ہوئی خبروں پر نہ کر دیا کرو بلکہ ذاتی تحقیق کے بعد نتیجہ تک پہنچا کرو۔ اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ

"جس بات کا تمھیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو تم سے ذرائع علم، یعنی سماعت اور

بصارت اور قلب کے متعلق باز پرس ہوگی۔ (۱۷/۳۶)

اور جب کسی معاملہ میں پوری تحقیق و تفتیش کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچ جاؤ تو پھر تذبذب میں نہ پڑ جاؤ بلکہ عزمِ راسخ سے اسے نافذ کردو اور اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

"اور جب تم عزم کرو تو پھر خدا پر بھروسہ کرکے (اس فیصلہ کو نافذ کر ڈالو۔) (۳/۱۵۹)

اور اس راہ میں جس قدر مشکلات و موانع کا سامنا ہو، نہایت دل جمعی اور ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کرتے جاؤ۔

"جو کچھ تم پر آئے ہمت سے مقابلہ کرو۔ یاد رکھو ثابت قدمی عزم الامور میں سے ہے۔ (۳۱/۱۷)

اگر فتنہ پردازوں اور فساد انگیزوں کا سامنا ہو تو انہیں اپنے حسنِ سلوک سے رام کرنے کی کوشش کرو۔ برائی کی مدافعت نیکی سے کرو۔ (۲۳/۹۶)

لیکن اگر وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں اور اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں تو انہیں ان کے جرائم کی سزا دو لیکن اس میں بھی اس کا خیال رکھو کہ

"سزا جرم کے مطابق ہونی چاہیئے۔" (۴۲/۴۰)

اگر اس کے بعد دیکھو کہ وہ اپنے کئے پر نادم ہیں اور آئندہ کے لئے اپنی غلط روش میں اصلاح کرنے پر بہ حسنِ نیت آمادہ ہیں تو انہیں ان کی سابقہ غلطیوں پر معاف کردو۔

"تم میں سے جو شخص غلطی کرے اور پھر اس پر نادم ہو جائے اور اپنی اصلاح کرلے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (۶/۵۴)

یاد رکھو! لوگوں سے معاملہ داری میں اپنی طبیعت کو بے قابو نہ ہونے دو کہ

"جو لوگ اپنے غصہ کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور لوگوں (کی ندامت پر انہیں) معاف کر دیتے ہیں تو اللہ (ایسے حسنِ عمل کو) محبوب رکھتا ہے۔" (۳/۱۳۳)

۸۔ انتخابِ رفقائے کار

جب کسی مقصد کے لئے کسی کو متعین کرو تو پہلے دیکھ لو کہ وہ اس مقصد کے لئے موزوں بھی ہے۔ اس موزونیت کے لئے جسمانی اور قلبی دونوں صلاحیتیں ضروری ہیں کہ:

"بہترین اجیر وہ ہے جو جسمانی طور پر مضبوط بھی ہو اور امین بھی۔ (۲۸/۲۶)

جب اللہ نے حضرت طالوت کو کمان کے لئے منتخب کیا تھا تو اس انتخاب کی دلیل یہی تھی کہ ان میں

"علمی قابلیت اور جسمانی توانائی دونوں وافر طور پر موجود ہیں"۔ (۲/۲۴۷)

اپنے عمالِ ماتحت کو تمام معاملات نہایت نرمی، خندہ پیشانی اور وضاحت سے سمجھاؤ۔

"انہیں اللہ کی راہ کی طرف حکمت اور موعظت سے بلاؤ اور جب بحث کرو تو عمدہ دلائل سے کرو"
(۱۶/۱۲۵)

اسے کبھی فراموش نہ کرو کہ اختلافِ مدارج محض تقسیمِ کار کے لئے ہے۔ جن لوگوں کو تم اپنے ماتحت سمجھتے ہو، وہ ذلیل نہیں ہیں۔ جس طرح تمھیں ایک کام سونپا گیا ہے اسی طرح ان کے سپرد بھی ایک فریضہ کیا گیا ہے۔ عزت کا معیار یہ ہے کہ تم میں سے کون اپنے اپنے فرائض کو بہ حسن و خوبی سرانجام دیتا ہے۔

"خدا کی نگاہ میں تم میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہے جو سب سے بہتر طریق پر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ (۴۹/۱۳)

اپنے ماتحتوں کے آرام و آسائش کا ہمیشہ خیال رکھو اور اس کا اطمینان کرو کہ انھیں ان کے کام کا پورا پورا معاوضہ مل رہا ہے۔

"اور جب ماپو تو ماپ کو پورا کرو اور سیدھے ترازو سے تولو، یہ بہت عمدہ روشِ زندگی اور مآلِ کار بہترین نتائج کی حامل ہے۔ (۱۷/۳۵)

۹۔ حُسنِ سلوک

تم خلقِ خدا کے خدمت گزار ہو۔ لوگ تمھارے پاس اپنی شکایات لے کر آئیں گے۔ ان سے بے رخی مت برتو۔ (۸۱/۳۱)

خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرو اور

"جب تمھیں کوئی ہدیۂ سلام پہنچائے تو (اوّل تو) اس سے بہتر طریق پر جواب دو (ورنہ کم از کم) ویسا جواب تو ضرور دو۔ یاد رکھو! اللہ ان تمام باتوں کا خیال رکھتا ہے (کہ سیرت کی تعمیر انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے)" (۴/۸۶)

ان سے جو بات بھی کرو صاف، واضح اور اس طریق سے کرو کہ وہ سیدھی ان کے دل تک اتر جائے۔ ہمیشہ نرمی سے گفتگو کرو۔ (۴/۶۳)۔ کبھی مبہم اور ذو معنی باتیں نہ کرو (۳۳/۷۰) جھوٹ کبھی نہ بولو (۳۳/۳۰) اگر کوئی بات صیغۂ راز میں رکھنے کی ہے تو کہہ دو کہ اسے نہیں بتایا جا سکتا۔ خواہ مخواہ جھوٹ کو سچ کا نقاب نہ اڑھاؤ۔

"کبھی حق کا باطل کے ساتھ التباس نہ کرو۔ نہ ہی جان بوجھ کر سچ کو چھپاؤ۔ (۲/۴۲)

جب وعدہ کرو تو ہمیشہ اس کا ایفا کرو (۵/۱) نرم خو رہو اور

" اکڑ کر نہ چلو۔ اللہ شیخی خورے متکبّر کو پسند نہیں کرتا۔ (۳۱/۱۸)

لوگوں سے چیخ کر نہ بولو (۳۱/۱۹) یاد رکھو۔

" سب آوازوں سے بُری آواز گدھے کی ہے۔ (۳۱/۱۹)

تمھاری سوسائٹی کی عام حالت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس میں

ایک جماعت دوسری جماعت کی ہنسی نہ اڑاتے، نہ ہی ایک دوسرے پر بہتان لگائے، نہ ان کے نام دھرتے رہو۔ بدظنی سے ہمیشہ مجتنب رہو۔ بعض وقت بدظنی جرم تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسروں کی ٹوہ میں نہ لگے رہو۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔" (۱۲-۱۱/ ۴۹)

اگر کسی نے اپنے علم و عمل سے کسی مقامِ بلند کو حاصل کر لیا ہے تو اس کا حسد نہ کرو۔ (۴/۵۵) بلکہ کوشش کرو کہ تم بھی علم اور محنت سے اس قسم کا مقام حاصل کر لو۔ اسلامی حکومت میں

" ہر شخص کو اس کی کوشش کا صلہ ملتا ہے۔ (۵۳/۳۹)

۱۰۔ مختصراً اپنے تمام ارادوں اور فیصلوں، کام اور تدبیروں میں ہمیشہ اس اصل اصول کو پیشِ نظر رکھو کہ جس حکومت کی مشینری کے تم پُرزے ہو اس کا قیام اس مقصد کے حصول کے لئے عمل میں لایا گیا ہے کہ

" وہ قیامِ صلوٰۃ (سے شرفِ انسانیت کے ارتقار کا ذریعہ بنے) ادائے زکوٰۃ (سے تمام لوگوں کی معاشی ضروریات کی بہترین کفیل ہو) ہمیشہ نیکی کو پھیلانے اور برائی کو روکنے کی تدابیر کرے اور تمام امور میں خدا کی طرف رجوع کرے۔ (۲۲/۴۱)

اور ایسا کبھی نہ کہو کہ جب دوسرے لوگ غلط راہ پر چل رہے ہیں، تو میں بھی کیوں نہ ان ہی کی راہ چلوں۔ یاد رکھو!

تم پر (سب سے پہلے) تمھاری اپنی ذمّہ داری عائد ہوتی ہے، جو غلط راہ پر چل رہا ہے، وہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ تم سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ (اس لئے کہ تم تمام ارکینِ حکومتِ خداوندی اپنے معاملات میں خدا کے سامنے جواب دہ ہو) وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے تھے (۵/۱۰۵)

یہ ہے مختصر سا خاکہ اس منشور کا، جو اسلامی حکومت کے عمّال کو دیا جائے گا تاکہ وہ اس کے مطابق کام کریں اور یہ ہے وہ عہدنامہ، جس پر انھیں کاربند رہنا ہوگا۔

کس قسم کی جنّت ہوگی وہ سرزمین، جس پر ایسی حکومت قائم ہو، جس کے عمائد و اراکین اور اربابِ بست و کشاد اس میثاقِ خداوندی پر عامل ہوں۔

ایک نُورانی صُبح

(جولائی ۱۹۴۹ء)

(علامہ حافظ سیّد محبُ الحق مرحوم کا تعارف)

۱۹، جون ۱۹۴۹ء (اتوار) کی صُبح بھی میرے لئے کیسی سہانی صبح تھی! یُمن وسعادت کی صبح، خیر و برکت کی صُبح، بہجت و مسرت کی صبح، فخر ومباہات کی صبح۔

آج آپ کو رجعت الی القرآن (BACK TO QURAN) کی آواز چاروں طرف سے سنائی دیتی ہے لیکن آج سے ستر، اسّی برس اُدھر، یہ آواز بڑی غیر مانوس اور ناآشنائے گوش تھی۔ قوم کے افقِ ذہنی پر غیر قرآنی تصورات بُری طرح مسلط تھے۔ اعمالِ حیات، یکسر غیر اسلامی رسوم و قیود کے پابند ہو چکے تھے۔ حقیقت، عجم کی نگاہ فریب داستانوں میں کھو چکی تھی۔ قرآن صرف ثواب کی خاطر تبرکاً پڑھا جاتا تھا یا مرتے وقت مُردوں کو سنایا جاتا تھا کہ ازیٰسین مُردہ آساں بمیرد — عام مسلکِ زندگی یا تو روایت پرستی تھا یا زاویہ نشینی۔ دین نام تھا چند لفظی عقائد اور رسوم و مظاہر کی پابندی کا۔ مذہبی بحثیں مشتمل تھیں یا تو آمین بالخفی و بالجہر جیسی فروعات پر اور یا حدوث وقدمِ مادہ اور تجسیم و تنزیہہ جیسے منطقی گورکھ دھندوں پر۔ ایسے ماحول اور اس قسم کی فضا میں اگر کسی گوشے سے یہ آواز بلند ہو کہ مسلمانوں! تمہاری زندگی کا راز قرآن اور خالص قرآن کو سمجھنے اور اس پر بےغل وغش عمل کرنے میں ہے تو کس قدر باعظمت ہوگا وہ گوشہ جہاں سے یہ آواز بلند ہوئی ہوگی اور کیسی بےباک و پُرخلوص ہوگی وہ زبان جس نے اس آواز کو بلند کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ فی الحقیقت ایک بڑے انسان کی عظمت کا راز ہی اس میں ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے عوام کی رَو کے ساتھ نہیں بہہ جاتا بلکہ ادراکِ حقیقت کے بعد، ان کے ذہنی رجحانات کے دھارے کا رُخ موڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ گوشہ تھا عظیم آباد (پٹنہ) کا ایک محلّہ اور یہ آواز تھی "مولانا حافظ محبُّ الحق صاحب" کی، جن کی ذات کے ساتھ انتساب سے "شمس العلماء" کے خطاب نے بعد میں فخر حاصل کیا۔ اس مردِ مومن نے قریب ستّر اسّی برس اُدھر، یہ آواز بلند کی اور پھر ساری عمر اسی دعوت کے عام کرنے میں صرف کردی۔ اس آواز کی کس قدر مخالفت ہوئی ہوگی، اس کا ہم صحیح اندازہ نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ آج مسلمانوں میں لتقدمذہبی تشدد باقی نہیں رہا، جو آج سے ستّر اسّی برس اُدھر تھا۔ اس زمانہ میں عوام کے میلانات و معتقدات کے خلاف لب کشائی کرنا جان کا خطرہ مول لینا تھا اور پھر لب کشائی بھی ایسے نازک مسئلہ میں، جس سے مخالفین، عوام کے نازک ترین جذبات کو فوراً مشتعل کردیں، یعنی "انکارِ حجیّتِ حدیث" اور دعوتِ اکملیّتِ قرآن۔ اس مسئلہ کی نزاکت کا تو یہ عالم ہے کہ آج جب کہ (جیساکہ ابھی ابھی لکھا جاچکا ہے) مذہبی تعصب بہت کم ہوچکا ہے، عوام اور سب کچھ برداشت کرلیں گے لیکن جس شخص کے ساتھ "منکرِ حدیث" کا لیبل چسپاں کردیا جائے، اسے کسی صورت میں بھی "مسلمان" ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ عوام کی یہی وہ دکھتی ہوئی رگ ہے، جس سے ہماری ملّائیت فائدہ اٹھاتی رہتی ہے۔ جب کبھی ان کے کسی مسلک کو قرآن کے خلاف ثابت کیجئے، وہ اپنے مسلک کی تائید میں فوراً کوئی نہ کوئی روائت پیش کردیں گے اور جوں ہی آپ نے یہ کہا کہ جو روائت قرآن کے خلاف جاتی ہو، اسے کیسے صحیح مان لیا جاسکتے، وہ فوراً منکرِ حدیث کا لیبل چسپاں کردیں گے۔ اس کے بعد کوئی شخص اس کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ہماری "سلطانی دُلّائی و پیری" کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی حفاظت عوام کے انہی نازک جذبات کے اشتعال سے کی جاتی رہی ہے اور آج بھی کی جارہی ہے۔ غور فرمائیے کہ آج سے ستّر اسّی برس اُدھر، اس آواز کا بلند کرنا کتنے بڑے حوصلہ اور ہمّت کا کام ہوگا۔ یہ وہی کرسکتا تھا، جسے اللہ نے قرآن کا عشق عطا فرمایا ہو، کہ آگ میں کود جانا عشق ہی سے ہوسکتا ہے، عقل کی مصلحت کوشیوں سے نہیں۔ یہ تھی وہ آواز جو آج سے ستّر اسّی برس اُدھر، شمس العلماء حافظ سید محبّ الحق صاحب نے بلند کی اور پھر ہزار مخالفتوں کے باوجود اسے مسلسل و متواتر جاری رکھا۔ جب یہ آواز پہلی مرتبہ بلند ہوئی ہوگی تو شاید حافظ صاحب قبلہ کو ایک متنفس بھی اپنا ہم نوا نہ ملا ہوگا۔ دعوتِ حق و صداقت میں یہ مقام بڑا صبر آزما اور جرأت طلب ہوا کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انسان تنہائی میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتا ہے بلکہ بعض اوقات بہ تقاضائے بشریّت، یہ کھٹک پیدا ہوجاتی ہے کہ جب کوئی بھی میری تائید نہیں کرتا، تو ہوسکتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں۔ اس مقام سے صحیح و سلامت گزر جانا اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کو اپنے مسلک کی حقانیّت پر یقینِ محکم ہو۔ لہٰذا، اس تمام تگ و تاز اور سعی و کاوش میں ایمانِ محکم اور جرأتِ کامل ہی انسان کو ان دشوار گزار وادیوں سے پار لے جا

سکتی ہے۔ سو کس قدر محکم تھا ایمان اس اللہ کے بندے کا اور کس قدر بلند تھا حوصلہ اس مردِ مومن کا، جس نے اپنی ساری عمر اسی دعوت اور پکار میں بسر کردی کہ مسلمان پھر سے قرآن کی طرف آجائیں اور اپنے فردوسِ گم گشتہ کو حاصل کریں۔

راقم الحروف کو قبلہ حافظ صاحب سے غائبانہ تعارف کا شرف ان کی گراں قدر تصانیف بلاغ الحق، دعوت الحق، منہاج الحق، شرعۃ الحق کی وساطت سے ہوا۔ اس کے بعد غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ طلوعِ اسلام کی وساطت سے میرے بعض مضامین آپ کی نظر سے گزرے اور آپ نے انہیں اس انداز سے سراہا کہ مجھ میں آپ سے خط و کتابت کی جرأت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۴۱ء میں میری کتاب "معارف القرآن" کی پہلی جلد شائع ہوئی تو میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کی رسید جن الفاظ میں مجھ تک پہنچی، وہ میرے لئے سرمایۂ ہزار فخر و سعادت ہے۔ یہ خط اسی زمانہ میں طلوعِ اسلام میں شائع ہوگیا تھا۔ اس کے یہ فقرے مجھے کبھی نہیں بھولتے کہ

> "جہاں تک کتاب کو دیکھا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے، آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحادِ خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے؟ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے اور لا تزکوا انفسکم کے احاطہ کے اندر ممنوع ہے۔ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء)

اس کے بعد کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ایک اور گرامی نامہ میں یوں نوازا۔

> "میں نے معارف القرآن بالاستیعاب پڑھا۔ سبحان اللہ کیا کتاب لکھی ہے۔ محض جزئیات میں کہیں کہیں اختلاف ہونا یا تو فطرتِ انسانی ہے جو ناقابلِ توجہ ہے۔ اس کتاب میں چند خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سارے خیالات و اختلافات کو پیٹھ پیچھے پھینک کر خدا اور خدا کی صراطِ مستقیم نصب العین رہی ہے۔ میں کیا، خدا اسے قبول کرے، مقبول کرے اور قوم کی نسبت اپنے ساتھ جوڑ دے، جو اس کتاب کا نصب العین ہے۔ دوسرے اختلافات و نزاعاتِ باہمی نے جو قرآن کے معنی بدل دیتے ہیں جو فطال علیھم الامد فقست قلوبھم کے اصول پر معانیِ قرآن محرّف بنا دیا گیا ہے، اس کی اصلاح ہوگئی ہے۔ تیسری ضرورت اور پوری ہونے کی اُمید ہے کہ قرآن کا صحیح ترجمہ جس کی ضرورت قوم کو شدید اور اشد ہے، وہ انشاء اللہ پوری ہوجائے گی مگر افسوس یہ ضرور

ہے کہ یہ ضرورت کئی جلدوں میں پوری ہوگی۔ اس لئے اگر آپ کو ساری جلدوں کی تصانیف سے فرصت ہوگئی ہو تو اس کا موقع ہے۔ ساری کتاب جو ابھی غیر مطبوعہ ہے، اس سے قرآنی الفاظ کے معانی کی صحت کرکے قرآن کا ترجمہ شائع کیا جائے جو سارے ترجموں پر حکم ہو اور جس کی تبلیغ آسان اور عام ہوسکے اور اس انقلابی دور میں جس کے مقبول اور مصلح ہونے کی فضا خدا نے پیدا کردی ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔ میں بھی اب تک جوں توں زندہ ہوں ۔۔۔ قوم نہ بدلے گی، اس کا حال نہ بدلے گا، جب تک اس میں روحانیت اور پاک باطنی نہ آئے گی اور یہ بغیر خدا کی خالص محبت کے حاصل نہیں ہونے کی۔ ضرورت ادھر توجہ کرنے کی بھی ہے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ قوم کو قرآن کی تلاوت معانی و مفہوم کے ساتھ کرنے کی تبلیغ کی جائے، زبانی بھی، عملی بھی، اسٹیج سے نہیں بلکہ مسجدوں میں بیٹھ کر چند لوگوں میں بطور مشورت پیش کرنے کا رنگ اختیار کیا جاتے۔ افسوس کہ اس کے لائق میں اب نہیں رہا۔

اس کے بعد یہ تعلق ایسا قائم ہوا کہ میں نے اس حقیقت کو اپنے سامنے محسوس پیکر میں دیکھ لیا کہ جو قلبی تعلق قرآن کے رشتہ سے استوار ہوتا ہے، اس سے زیادہ گہرا اور محکم تعلق اور کسی صورت میں ممکن نہیں۔

لیکن یہ تعلق غائبانہ ہی رہا تا آنکہ تقسیم ہند کے بعد، میں ہندوستان (دہلی) سے پاکستان (کراچی) آگیا۔ مجھے یہاں پہنچ کر سب سے بڑا قلق علامہ اسلم جیراج پوری مدظلہ کے فیوض صحبت سے محرومی اور قبلہ حافظ صاحب سے شرفِ نیاز کے حصول کے امکانات کی کمی کی وجہ سے تھا۔ میری طلب صادق تھی، اس نے کشش پیدا کی۔ علامہ اسلم صاحب خود میرے ہاں تشریف لاتے اور قریب آٹھ نو ماہ تک یہیں فروکش رہے۔ قبلہ حافظ صاحب بھی اپنے اعزہ کے ہمراہ بہار سے کراچی تشریف لے آئے۔ مجھے اس خبر سے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی، آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ قریب دس سال کی غائبانہ ملاقات نے بالمشافہ نیاز کی صورت اختیار کی۔ للہ الحمد کہ اس مردِ مومن کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ قریب سو سال کا سن، لانبا قد، اس کبرسنی میں بھی چہرے کا جلال، ایک پاکباز زندگی کا آئینہ دار۔ ایک آنکھ پہلے جاتی رہی تھی، دوسری سے بھی بینائی کم ہورہی ہے لیکن چشمہ کی مدد سے اب بھی پڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ بہ تکلف، ثقلِ سماعت ہے۔ پیری کا ضعف اور اس سے پیدا شدہ مختلف عوارض لیکن اس کے باوجود نماز کی پابندی کا وہی التزام جو شروع سے چلا آتا تھا قائم ہے۔ بڑی محبت سے ملے۔ فرمایا کہ تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔

اللہ کا احسان ہے کہ اس نے میری یہ آرزو پوری کر دی۔ پھر میری حوصلہ افزائی کے لئے کہا کہ میں نے جب دعوت الی القرآن کی ابتدا کی تھی تو ہمیشہ یہ خیال میرے دامنگیر رہا کرتا تھا کہ نہ معلوم یہ آواز یہیں ختم ہو جائے گی یا اس دیئے سے آگے دیا بھی جلے گا۔ اللہ نے میری آواز سن لی۔ میری زندگی ہی میں یہ دعوتِ عام بھی ہوئی اور تم سے تعارف کے بعد اس کی بھی تسلی ہو گئی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب میں اطمینان کی موت مروں گا۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں مجھے کوئی دن ایسا یاد نہیں پڑتا کہ میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں اور مزاج پرسی کے بعد قرآن کے علاوہ کسی اور موضوع پر سلسلۂ گفتگو چھڑا ہو۔ پچھلے مہینے ان پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا۔ ایک تو کبر سنی کی نقاہت، اس پر مرض کا سخت حملہ، کمزوری یہاں تک بڑھ گئی کہ قریب دو روز غش کی سی حالت رہی۔ میں عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ حبیبِ مکرّم، ڈاکٹر حمید صاحب، کہ جن کے مقدر میں ایسی بابرکات ہستیوں کی خدمتِ معالجہ کی سعادت لکھی ہے، میرے ساتھ تھے۔ حافظ صاحب قبلہ بہت کمزور ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے مرض اور اس کے تضمنات سے متعلق باتیں ہوئیں۔ محسوس ہو رہا تھا کہ انھیں بات کرنے میں خاصی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے سلسلۂ گفتگو کو خود ہی ختم کر دیا کہ مبادا نقاہت بڑھ جائے۔ اس کے بعد آپ نے مجھے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے۔ فرمایا کہ اس غنودگی کے عالم میں قرآن کی ایک آیت میرے ذہن میں چکر لگا رہی تھی۔ جی میں تھا کہ تم آؤ تو اس کے متعلق کچھ بات کر سکوں۔ اس کے بعد جو سلسلۂ کلام شروع ہوا ہے تو قریب آدھ گھنٹے تک اس انداز سے جاری رہا گویا آپ بالکل تندرست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رہ رہ کر متشوش ہو رہے تھے کہ اس تکان سے مرض بڑھ جائے گا۔ ان سے ایک آدھ مرتبہ عرض بھی کیا گیا تو فرمایا کہ اس گفتگو سے مجھے تقویت ملتی ہے۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ اس وجہ سے میرے مرض میں کمی ہوگی، زیادتی نہیں ہوگی۔

اللہ اکبر، کیسی قابلِ رشک ہے یہ زندگی اور کس قدر بے پایاں عشق ہے خدا اور اس کے کلام سے اور کیسا بابرکت ہے یہ گھر، جس میں ہر وقت قرآن کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ وہاں جائیے تو یوں محسوس ہوتا ہے، گویا ساری فضا قرآنی تذکار سے معمور ہے۔ حتیٰ کہ ان کے ایک صاحبزادہ مصطفےٰ میاں کی بیوی ایک یورپین خاتون ہیں۔ ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ میاں، بیوی اور ان کا بچہ ہر شام بلا ناغہ قرآنی درس و تدریس اور بحث و تمحیص میں منہمک ملیں گے طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

مولویوں کے طبقہ میں عام طور پر آپ نے دیکھا ہو گا کہ وہ غلطی محسوس ہو جانے کے بعد بھی اپنی ضد

(بغیا بینھم) پر اڑے رہتے ہیں اور دور از کار مباحث اور تاویلات سے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات کو سچا ثابت کر دکھائیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو سینے قرآن کی دولت سے معمور ہوں، ان میں ہٹ، ضد اور بات کی پیچ کے بجائے سینے کی کشادہ اور نگاہ کی بلندی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات میں نے علامہ اسلم مدظلہ میں بھی دیکھی اور قبلہ حافظ صاحب کے ہاں بھی۔ مثلاً ایک دن میں حاضر ہوا تو آپ ایک مسئلہ کی تشریح فرما رہے تھے۔ بڑے سکت دلائل اور واضح اسلوب کے ساتھ۔ اخیر میں میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کتنے دنوں سے میں اس باب میں غور کر رہا تھا اب اس کا حل ملا۔ انھیں اس حل سے پورا اطمینان تھا۔ بات ختم ہونے پر میں نے عرض کیا کہ قرآن میں فلاں آیت ہے جو آپ کے بیان فرمودہ حل سے مختلف ہے، اس کی بابت کیا ارشاد ہے؟

ایک ثانیہ کے تامّل کے بغیر فرمایا کہ اللہ مجھ پر رحم کرے۔ اب حافظہ کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ یہ آیت قطعاً مجھے یاد نہیں آئی۔

میں نے کہا کہ علاوہ بریں .... فرمایا کہ اب کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب اللہ کا فیصلہ سامنے آ گیا تو پھر مزید بحث کی گنجائش کہاں ہے۔ میری غلطی تھی۔

یہ ہے وہ وسعتِ قلب جو قرآنی بصیرت اور تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے۔ میں بلا تامّل عرض کروں گا کہ اگر آپ نے دیکھنا ہو کہ قرآن، انسان کے قلب و دماغ میں کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور ایسی ہستیوں کے پاس بیٹھنے سے بھی کیا کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو قبلہ حافظ صاحب کو دیکھئے اور علامہ اسلم جیراج پوری کو۔ میری نگاہ نے ان سے بہتر قرآن جاننے والا اور جاننے کے بعد اس کے رنگ میں رنگے جانے والا اور کوئی نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نورِ بصیرت سے مستفیض ہونے کا تا دیر موقعہ عطا فرمائے۔

اتوار (۱۹ر جون) کی صبح کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ دیکھا تو حافظ صاحب قبلہ کے منشی صاحب ہیں۔ کہا کہ حافظ صاحب تشریف لائے ہیں۔ دیکھا تو مصطفیٰ میاں کے ساتھ موٹر میں تشریف فرما ہیں۔ ضعفِ پیری اور عوارض کی وجہ سے آپ کے لئے پاؤں چلنا تو ایک طرف، موٹر تک کا سفر دشوار ہو چکا تھا۔ حیران کہ انھوں نے اس قدر تکلیف فرمائی ؛ فرطِ انبساط سے میرا یہ عالم کہ ـــــ " جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں " ـــــ کرم فرمایا اور موٹر سے اتر کر کمرے تک تشریف لے آئے۔ میرا ظلمت کدہ قرآن کے نور سے وادیٔ ایمن بن گیا۔ تشکراً عرض کیا کہ آپ نے اس قدر زحمت فرمائی۔ فرمایا کہ کئی دنوں سے یہ کھٹک پیدا ہو رہی تھی کہ ایک خادمِ قرآن

کے پاس چل کر جانے کے ثواب سے کہیں محروم ہی نہ رہ جاؤں۔ آج یہ آرزو پوری ہو گئی۔

وہ یہ کچھ فرما رہے تھے اور میری یہ کیفیت تھی کہ ـــــ چشم بروئے او کشا بازبخویشتن نگر ـــــ حیران تھا کہ اس کا کیا جواب دوں؟ ان کی لطف فرمائی کی بنا پر فرطِ انبساط اور ہیچمیرزی کے احساس سے دفورِ ندامت کے ملے جلے جذبات سے میرا سینہ طلسمِ پیچ و تاب بن گیا اور باوجود ہزار کوشش کے میں ایک لفظ تک بھی نہ کہہ سکا۔

اس مقام پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ قریب سات آٹھ سال اُدھر کا ذکر ہے۔ میں گرمیوں کی ایک شام اپنے مکان واقع نورجہاں روڈ (نئی دہلی) کے باہر بیٹھا تھا کہ سامنے ایک بڑا شاندار موٹر کار رُکا اور اس میں سے ایک باوقار شخصیت نے میرے مکان کا رُخ کیا۔ قریب آکر کہا کہ "میں ہوں سیّد عبدالعزیز"۔

عزیز الملّت سیّد عبدالعزیز (مرحوم)۔ سابق صدر بہار مسلم لیگ، جو اس زمانے میں مملکتِ حیدرآباد میں وزیرِ امورِ مذہبیہ تھے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ نے اتنی زحمت فرمائی۔ مجھے اطلاع دی ہوتی، تو میں خود حاضر ہوتا۔ (سیّد صاحب کے خلوص اور بے لوث خدمات کا میں بے حد معترف تھا) فرمایا کہ میں قرآن کی نسبت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تمہیں وہاں بلانے کی جسارت کیسے کرتا؟ میں نے جاتے وقت معارف القرآن (جس کی جلد اوّل اس زمانے میں ابھی ابھی شائع ہوئی تھی) کا ایک نسخہ پیش کیا تو اسے احتراماً کھڑے ہو کر لیا اور جھک کر تعظیم کی۔ قرآن سے ایسی محبت!

کیوں نہ ہوتی وہ بھی تو اسی معدنِ رُشد و سعادت کے دُرِ شاہوار تھے۔ قبلہ حافظ صاحب سے انھیں برادرِ نسبتی ہونے کا تعلق تھا۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

قبلہ حافظ صاحب سے سلسلۂ کلام چھڑا تو فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ میں تو اب اللہ میاں کے ہاں سے (EXTENSION) (توسیعِ ملازمت) پر ہوں۔ پہلے درخواست کی تھی کہ تمہاری کتاب کی دوسری اور تیسری جلد دیکھ لینے تک کی مہلت مل جائے۔ وہ منظور ہو گئی تو اب جلد چہارم تک کی توسیع کے لئے پھر گذارش کیا ہے۔ لہٰذا اس کی تکمیلِ طباعت میں جلدی کرو۔ فرمایا کہ میری بینائی کا تھوڑا سا حصّہ جو باقی رہ گیا ہے اسے میں نے اس کتاب کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔

کس قدر بلند ہے نگاہ ان حضرات کی جو اس انداز سے دوسروں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ دعوت الحق میں ایک مقام ایسا ہے جس پر نظرِ ثانی کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ کل میں نے کچھ لکھا ہے

اور اس طرح لکھا ہے کہ کاغذ پر قلم چلائے گیا ہوں۔ اس لئے کہ دکھائی تو دیتا نہیں کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ مکمل ہوگیا تو تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ قرآن کے متعلق کوئی ایسی بات دوسروں تک نہیں پہنچانی چاہیئے جس کی صحت میں یقین نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اپنے یقین کے باوجود ہم غلطی پر ہوں لیکن اس سے اللہ کے ہاں سے معافی کی امید ہوسکتی ہے، پہلی صورت میں نہیں۔

چونکہ دن بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی تمازتِ آفتاب بھی، اس لئے کچھ دیر کے بعد آپ واپس تشریف لے گئے۔

یہ تھی وہ نورانی صبح جو میری زندگی کے یادگار لمحات میں رہے گی۔ ان ہستیوں کا وجود مغتنمات میں سے ہے۔ ان کے بعد یہ کرسیاں خالی ہوجائیں گی اور ہماری نگاہیں اس روشنی کے لئے ترستی رہیں گی [1]

تقویٰ اور تدیّن کی بے لوث زندگی اور تمام عمر قرآن میں تدبّر اور اس کی تبلیغ! یہ ان کے بعد کہاں ملے گا؟ مبارک ہیں یہ ہستیاں اور مبارک ہیں ان کے ثمراتِ حیات۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۵/۱۱۹)۔

---

[1] اب یہ دونوں بزرگ اس دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں۔

عبادت

(خدا اور انسان کے تعلق کے متعلق اہم مباحث)

(دسمبر ۱۹۴۹ء)

سامنے میز پر گھڑی رکھی تھی۔ شیشہ ٹوٹا ہوا اور منٹ کی سوئی غائب۔ گھنٹے کی سوئی پر میری نگاہ تھی اور میں ایک گہری سوچ میں ڈوبا، ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سے دو اور دو سے تین پر جا پہنچی۔ میں نے سوچا کہ بعض تغیرات ذہنِ انسانی میں بھی کچھ ایسے تدریجاً اور غیر شعوری طور پر رُونما ہوتے ہیں کہ جب تک ان کا مجموعی اثر ایک نمایاں انقلاب کی شکل میں ظاہر نہیں ہو جاتا یہ محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ عمل میں آ رہا ہے۔ ذہنی انقلاب کے یہ تخریبی اور تعمیری مراحل دریا کی پُرسکوت روانیوں کی طرح کچھ ایسے غیر مرئی طور پر طے پا جاتے ہیں کہ جو خطوط ابتداءً نقوش برآب سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے ہوں، وہی ایک عرصے کے بعد محکم حصارِ سنگین کی بنیادیں بن جاتے ہیں۔ تاریخِ انسانیت میں اس قسم کے غیر محسوس اور غیر مرئی تغیر و تبدل کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن جو انقلاب اسلام کے متعلق مسلمانوں کے ذہن میں رونما ہوا ہے شاید ہی اس کی نظیر کہیں اور مل سکے! اسلام ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا ایک مکمل نظامِ حیات تھا۔ آجکل کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ ایک عالمگیر دولتی نظام **(A UNIVERSAL SYSTEM OF STATE)** تھا لیکن وہ اپنے اس صحیح اور بلند ترین مقام سے آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر سرکتے سرکتے مذہب **(RELIGION)** کی شکل اختیار کر گیا۔ تاریخِ انسانیت کا یہ ایک ایسا تحیّر انگیز انقلاب ہے جس پر ہر دیدۂ عبرت خونفشاں اور ہر قلبِ حسّاس طلسمِ پیچ و تاب بن کر رہ جاتا ہے۔ جب اسلام کا مقابلہ مذاہبِ عالم (یعنی دنیا کے دھرموں) کے ساتھ کیا جاتا ہے یعنی

اسے ہندومت، بدھ مت، جین مت، عیسائیت، یہودیت، زرتشتیت وغیرہ مروّجہ مذاہب (دھرم) کے سامنے لایا جاتا ہے تو دیدۂ بینا میں خفیف سی ہنسی پیر جاتی ہے کہ کیا چیز کیا بن کر رہ گئی ہے۔

انقلابات ہیں زمانے کے

اسلام مذہب نہیں

اسلام دھرم (باصطلاحِ عوام مذہب) نہیں، اس لئے مختلف دھرموں (مذاہب) سے اس کا موازنہ کیا؟ یہ ایک نظامِ زندگی ہے یا سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ نظامِ حکومت[1] ہے۔ اس لئے اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ ان نظام ہائے حکومت سے جو ذہنِ انسانی نے آج تک وضع کئے ہیں اور یوں بتایا جائے گا کہ نظامِ آسمانی، زمین کے نظام ہائے حکومت سے کس طرح فائق اور برتر ہے۔ اسلام دین ہے، نظامِ اطاعت ہے، دھرم نہیں۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں اطاعت کے مختلف نظام یعنی حکومت کے مختلف انداز و طریق جو انسانوں نے وضع کئے ہیں، لائے جائیں گے، یا مختلف آئینی نظامِ اجتماعیہ، مثلاً سوشلزم، نازی ازم، فاشزم، کیپٹل ازم (سرمایہ داری وغیرہ) کے ساتھ اسلام کے نظامِ اجتماعیہ کا موازنہ کیا جائے گا اور یوں ثابت کیا جائے گا کہ اسلام ایک ایسا نظامِ اجتماعیہ یا نظامِ حکومت ہے جس کی مثل و نظیر کوئی اور نظام نہیں۔ اسلام کو دھرم (باصطلاحِ عوام مذہب) تسلیم کرنے سے اسلام اپنے صحیح مقام سے گر کر کسی اور مقام میں جا پہنچتا[2] ہے اور جب اس کے متعلق نگاہ میں ایک مرتبہ یہ بنیادی فرق پیدا ہو گیا تو اس کے بعد اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جائے گا، وہ اس نئے مقام سے متعلق ہوگا۔ اس کے اصلی مقام سے اس کا کچھ واسطہ نہیں ہوگا۔ اسلام کے متعلق مسلمانوں کی نگاہوں میں اتنی بڑی بنیادی تبدیلی کس طرح پیدا ہو گئی، یہ ایک داستان ہے بڑی دلخراش اور ایک حدیثِ الم ہے بڑی جانگداز۔ اس کے لئے تیرہ سو سال کی مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی، تاریخ پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت[3] ہے۔ گہری اس لئے کہ یہ تبدیلی اس طرح غیر مرئی اور غیر محسوس

---

[1] اسلام درحقیقت انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے نظام کا نام ہے لیکن چونکہ آج کل حیاتِ اجتماعیہ کی تعبیر نظامِ حکومت سے ہی کی جاتی ہے، اس لئے ہم نے اسے نظامِ حکومت سے تعبیر کیا ہے ورنہ اسلام کا نظام، زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔

[2] دین اور مذہب کے فرق کے لئے دیکھئے۔ "اسبابِ زوالِ امّت"۔

[3] اس کی صراحت "اسلام آگے کیوں نہ چلا" کے مقالہ میں کی گئی ہے جو "سلیم کے نام خطوط" (جلد سوم) میں شامل ہے۔

طور پر واقع ہوئی ہے، جیسے گھڑی کے گھنٹے کی سوئی غیر محسوس طور پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک جا پہنچتی ہے یہ تبدیلی کس طرح ہوئی، سرِدست اسے چھوڑیئے۔ دیکھئے صرف یہ کہ تبدیلی ہوئی اور ایسی محکم بنیادوں پر ہوئی کہ آج ہم میں یہ احساس بھی نہیں رہا کہ اسلام مذہب نہیں تھا کچھ اور تھا!

مذہب کیا ہے؟ مذہب سے مفہوم یہ ہے کہ انسان پرستش یعنی پوجا پاٹ کے لئے کسی شے (OBJECT) کو تجویز کرتا ہے۔ اس کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، پرستش کی رسوم وضع کرتا ہے۔ یہ پرستش کی شے کوئی پتھر ہو یا مظاہرِ فطرت میں سے کوئی چیز، اجرامِ سماوی ہوں یا کوئی دوسرا انسان، فرشتے ہوں یا خدا، کچھ بھی ہو اور کوئی بھی ہو، انسان اور اس کے درمیان تعلق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے پرستش کی چیز (OBJECT OF WORSHIP) ہوتا ہے اور یہ اس کا پرستار یعنی پوجنے والا (WORSHIPPER) جب اس کے سامنے ماتھا ٹیک دیا، پوجا کی رسومات ادا کر دیں تو پرستار اور پرستیدہ کا تعلق ختم ہو گیا۔ باقی رہی دنیا سے معاملات، تو اس کے لئے اخلاقیات کی چند چیزیں ہیں جو عام طور پر ہر جگہ مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرامکاری سے بچو، کسی کو دکھ نہ دو وغیرہ۔ وہ ہے خدا پرستی اور یہ ہے نیک عملی۔ اس کا نام ہے مذہب اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے تمام مذاہب برابر ہیں اور چونکہ اسلام کو بھی ایک مذہب خیال کر لیا جاتا ہے، اس لئے انسان اس فریب کا شکار ہو جاتا ہے کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک مذاہب کا تعلق ہے، تمام مذاہب یکساں ہیں لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسلام مذہب نہیں "دین" ہے اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام سمیت تمام مذاہب (دھرم) یکساں ہیں۔ (قرآنِ کریم میں "مذہب" کا لفظ تک نہیں آیا۔ اس نے اسلام کو "الدّین" کہا ہے۔ یعنی ضابطۂ زندگی)

اسلام میں خدا کا تصوّر اسلام میں خدا پوجا پاٹ کی شے (OBJECT OF WORSHIP) نہیں، بلکہ حاکمِ اعلیٰ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان پرستار اور پرستیدہ کا تعلق نہیں، بلکہ حاکم اور محکوم کا تعلق[1] ہے۔ دین سے مفہوم خدا کی پرستش نہیں، بلکہ خدا کی حاکمیت کا عملی اقرار ہے۔ یہاں نیک عملی سے مقصود محض ضابطۂ اخلاق کی پیروی نہیں جو ہر جگہ یکساں ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ خدا کی ہستی کے منکر ہیں، ان کے ہاں

---

[1] حاکم اور محکوم اس معنی میں نہیں جس معنی میں عام دنیاوی حکومتوں میں سمجھا جاتا ہے۔

بھی وہی ضابطۂ اخلاق موجود ہے۔ اسلام میں نیک عملی سے مراد اس ضابطۂ قانون کی اطاعت ہے جو خدا کی حکومت کا دستورِ اساسی ہے۔ اسلام کا تقابل ضوابطِ اخلاق سے نہیں بلکہ دنیا کے ضوابطِ قانون و دساتیر سے ہوگا، نظامِ حکومت اور آئینِ سلطنت سے ہوگا۔ اخلاقی ضابطہ تو اس ہمہ گیر ضابطۂ قانون کا ایک گوشہ ہے۔ اس نظامِ حکومت (دین) اور دنیا کے دیگر نظام ہائے حکومت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یہاں اصولاً قانون سازی کا اختیار کسی کو نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسان اس قانون کو نافذ کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ امتیازی خصوصیت، جو کسی اور نظامِ حکومت کو حاصل نہیں۔

جب کسی تعلیم کے اصول و مبادیات کا مفہوم بدل جائے تو ان کے متعلقات کا مفہوم خود بخود بدل جاتا ہے۔ جب اسلام دین سے بدل کر مذہب ہو گیا تو اس کی اصطلاحات کے معانی میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ جب خدا کا تصور حاکم کا تھا تو اس کی عبادت سے مفہوم اس کی محکومیت تھی۔ جب وہ ایک پوجا کی چیز (OBJECT OF WORSHIP) بن گیا تو عبادت کے معنی بھی پوجا اور پرستش کے رہ گئے۔ آج اگر کسی کے متعلق کہا جائے کہ وہ بڑا "عبادت گزار" ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس سے فوراً آنکھوں کے سامنے اس قسم کا نقشہ آجاتا ہے کہ وہ خدا کی بڑی پرستش کرتا ہے، نوافل پڑھتا ہے، تسبیح پھیرتا ہے، زاہد شب زندہ دار ہے، صائم الدہر ہے، ایک گوشہ میں بیٹھا ذکر و فکر میں مستغرق رہتا ہے، یعنی دھرم میں جتنی چیزیں بھگتی کی تھیں ان سب پر کاربند ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ وہ محکوم کس کا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک لفظ (عبادت) کا مفہوم بدلنے سے کس طرح سارے کا سارا نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا؟

عبادت کے معنی؟

اوجھل ہی نہیں، بلکہ ایسے نظام میں بدل گیا جو اصل نظام سے یکسر مختلف ہے، حالانکہ لفظ عبادت کے معنی محکومیت ہیں اور عبد کے معنی غلام، بندۂ محکوم۔ جب حضرت موسیٰؑ (اور حضرت ہارونؑ) نے فرعون کو ایمان کی دعوت دی تو اس نے اور اس کے اربابِ حل و عقد نے یہ کہہ کر اس دعوت کو مسترد کیا تھا، بلکہ اس کا استخفاف کیا تھا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت کو کیسے قبول کریں جو خود ہماری محکوم ہے۔ اس کے لئے لفظ "عابد" آیا ہے۔

فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (۲۳/۴۷)

"انھوں نے کہا کیا ہم ان دو اپنے جیسے آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ ان کی قوم ہماری محکوم ہے۔"

یعنی انھوں نے کہا کہ یہ دعوتِ ایمان دینے والے بالکل ہماری طرح کے انسان ہیں۔ (فوق البشر دکھائی نہیں دیتے) اور اس قوم کے فرد ہیں جو ہماری محکومؒ ہے۔ یہاں عابد کے معنی واضح ہیں۔ اسی داستان کے دوسرے ٹکڑے میں ہے کہ فرعون نے موسیٰؑ سے کہا کہ تم بڑے احسان ناشناس اور مروت فراموش ہو۔ میں نے تم پر اور تمھاری قوم پر اس قدر احسانات کئے ہیں اور تم ان احسانوں کا بدلہ یہ دے رہے ہو؟ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ جی ہاں! میں آپ کے ان احسانات سے خوب واقف ہوں۔ یہ احسانات ایسے ہی ہیں، جیسے ایک قصاب بکری کو گھاس اور دانہ دے کر اس کی پرورش کا احسان جتائے۔ ذرا بتاؤ تو سہی۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآئِيلَ ۝ (۲۶/۲۲)

کیا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کا تم مجھ پر احسان دھر رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔

عَبَّدْتَّ کے معنی واضح ہیں یعنی تو نے انھیں اپنا محکوم بنا رکھا ہے۔ لہٰذا عبد اور عابد کے معنی ہیں محکوم اور معبود کے معنی ہیں جس کی محکومیّت اختیار کی جائے اور عبادت کے معنی ہیں محکومیّت۔ فارسی میں عبد کے معنی بندہ اور عبادت کے معنی بندگی' اپنا مفہوم ادا کر سکتے تھے لیکن یہی بندگی ہندوستان میں آکر پوجا اور پرستش بن کر رہ گئی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صرف تعظیم اور ڈنڈوت کے معنی میں استعمال ہونے لگ گئی۔ اب بندگی کے معنی پرستش سے زیادہ کچھ نہیں۔ محکومیّت کا تصوّر نہ لفظ عبادت کے اندر رہ گیا ہے نہ بندگی کے اندر۔

سورۃ کہف میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸/۱۱۰) (انسان کو چاہیئے کہ) اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے اور اسی سورت کے شروع میں خدا نے خود اپنے متعلق فرمایا ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)۔ وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ یعنی إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)۔ حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ۭ (۱۲/۴۰) اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی محکومیّت نہ اختیار کی جائے۔

ؒ کتنی بڑی حقیقت ہے۔ محکوم قوم لاکھوں صداقتوں کی حامل ہو، کوئی اس کی دعوت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کا محکوم ہونا ہی ہزار عیب کا ایک عیب ہے۔

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

ان مقامات سے عبادت کے معانی بالکل صاف طور پر سامنے آجاتے ہیں، یعنی عبادت کے معنی محکومیّت کے ہیں۔ " خدا کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرو " یعنی اس کے سوا کسی اور کی محکومیّت اختیار نہ کرو، اس لئے کہ " حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔" اور اس کا حکم ہے کہ " اس کے سوا اور کسی کی محکومیّت اختیار نہ کرو "۔ یہی قرآنِ کریم کی دعوت ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۲۱)

اے افرادِ نسلِ انسانی! اپنے اس رب کی محکومیّت اختیار کرو جس نے تمھیں بھی پیدا کیا اور انھیں بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے تاکہ تم تقویٰ[1] شعار ہو جاؤ۔

اور یہ دعوت کوئی نئی دعوت اور یہ پکار کوئی انوکھی پکار نہیں، بلکہ شروع سے سلسلہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسّلام کی دعوت اور یہی صدائے ربّانی رہی ہے کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت کو تسلیم نہ کرو۔ یہ انسانیّت کی انتہائی ذلت ہے کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کا محکوم ہو جائے۔ محکوم اس کا ہونا چاہیئے جو اپنے سے بلند و بالا ہو اور انسان سے بلند صرف خدا کی ذات ہے۔ ہر رسول کا یہی پیغام ہے اور ہر نبی کی یہی تعلیم تھی۔ اس لئے یہ پیغام، پیغامِ خداوندی، اور یہ تعلیم، تعلیمِ ایزدی تھی۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔

أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ (۱۱/۲۶)

کہ اللہ کے سوا اور کسی کی محکومیّت اختیار نہ کرو۔

یہی حضرت ہودؑ نے فرمایا۔

قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۱۱/۵۰)

کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی محکومیّت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی اِلٰہ (حاکم) نہیں۔

انبیاءؑ کی تعلیم

انہی الفاظ میں حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو پیغامِ خداوندی پہنچایا (۱۱/۶۱)۔ یہی حضرت شعیبؑ نے فرمایا۔ (۱۱/۸۴) حضرت یوسفؑ نے قیدخانہ کی چاردیواری میں جو وعظ فرمایا، وہ خدا اور بندے کے اسی تعلق کو واضح کرنے کے لئے تھا۔ انھوں نے اپنے ساتھی قیدیوں

---

[1] تقویٰ کے صحیح مفہوم کے لئے " اسبابِ زوالِ اُمّت " دیکھئے۔

سے پوچھا کہ

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (۱۲/۳۹)

کیا الگ الگ آقاؤں کا ہونا اچھا ہے یا اللہ کا جو یگانہ ہے اور سب پر غالب ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم لوگوں نے جن کی محکومیت اختیار کر رکھی ہے، انھیں کوئی حق نہیں کہ انسانوں کو اپنا غلام اور محکوم بنائیں۔ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آبا و اجداد نے رکھ لئے ہیں۔ جیسے تھیٹر کے تماشے میں کسی کا نام بادشاہ رکھ لیا جاتا ہے، کسی کا نام وزیر، حالانکہ وہ فی الحقیقت بادشاہ یا وزیر نہیں ہوتے۔ یاد رکھو۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰)

حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔

اس کے بعد جو کچھ فرمایا اس سے عبادت کا مفہوم بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ کہا۔

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۲/۴۰)

اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔

ان دونوں ٹکڑوں کو پھر لائیے یعنی (۱) حکومت صرف اللہ کے لئے اور (۲) اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔ (تعبدوا) ظاہر ہے کہ عبادت سے مفہوم محکومیت کے سوا اور کچھ نہیں ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (۱۲/۴۰) یہی محکم اور متوازن نظامِ اطاعت (دین) ہے وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۲/۴۰) لیکن (مشکل یہ ہے) کہ بہت سے لوگ (اس حقیقت سے) واقف نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ جو لوگ انسانوں کو اپنا حاکم تسلیم کر لیتے ہیں، ان کی یہ روش لاعلمی پر مبنی ہے لَا يَعْلَمُوْنَ علم آ جانے کے بعد، یعنی اپنی حقیقت اور دوسرے انسانوں کی صحیح پوزیشن معلوم ہو جانے کے بعد یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان خدا کے سوا اور کسی کی حکومت کو جائز تسلیم کرے۔ وحدتِ خلق کا وہ عظیم الشان نظریہ، جسے قرآن نے اس بلند آہنگی سے پیش کیا ہے اور جس کی تصدیق و تائید آج علمِ انسانی کے انکشافات بدلائل و براہین کر رہے ہیں اس حقیقتِ عظمیٰ کا آئینہ دار ہے کہ انسان میں اخوّت و مساوات کا تعلق ہے، حاکم اور محکوم کا رشتہ نہیں۔ حکومت غالب کی ہو سکتی ہے اور غالب (قہّار) صرف خدا کی ذات ہے۔ کائنات کی ہر شے انسان کے سامنے سجدہ ریز ہے۔

یہ مسجودِ ملائک اور مخدومِ نوامیسِ فطرت ہے۔ اس لئے ان چیزوں کے سامنے جھکنا انسانیت کی تذلیل ہے۔ انسان سب برابر ہیں۔ برابر والے کی محکومیت اس کی اور اپنی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ بس ایک خدا کی ہستی باقی رہ جاتی ہے جو انسانوں سے ارفع و اعلیٰ اور غالب و بالادست ہے۔ لہٰذا محکومیت اسی کی جائز اور بجا ہو سکتی ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۱۲/۴۰)

عبادت یعنی محکومیت کے متعلق تمام انبیائے سابقہ علیہم السلام اسی ایک حقیقت کو بار بار دہراتے رہے اور یہی وہ حقیقتِ کبریٰ تھی جس کا مکمل اور آخری اعلان حضور سرورِ کائنات صلعم کی وساطت سے تمام نوعِ انسانی میں کیا گیا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (۱۷/۲۳)

اور تیرے رب نے یہ بات ٹھہرا دی ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبودیت اختیار نہ کرو۔

رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں

خدا کی حکومت کو چھوڑ کر عام انسانوں کی محکومیت تو ایک طرف، قرآنِ کریم نے انتہائی شکل کو سامنے لا کر اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ اور تو اور کسی رسول کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ انسانوں کو اپنا محکوم بنا لے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۸)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے (محکوم) ہو جاؤ۔ بس وہ یہی کہے گا کہ تم ربانی ہو جاؤ۔ اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

یعنی اللہ تعالےٰ نے اپنا ضابطہ قوانین رسولوں کی وساطت سے انسانوں تک پہنچایا اور رسولوں کو ان قوانین کے نافذ کرنے کی قوت بھی عطا فرمائی تاکہ وہ عملاً خدا کی حکومت کو دنیا میں رائج کر کے دکھا دیں۔ یہی ان حضرات علیہم السلام کا منصب تھا۔ اس لئے عام انسان تو ایک طرف، ان حضرات انبیاء عظام ؑ کے لئے بھی یہ سزاوار نہ تھا کہ وہ لوگوں کو خدا کی محکومیت کے بجائے اپنے احکام کا مطیع و فرماں پذیر بنائیں۔ ان کی دعوت یہ تھی کہ سب لوگ

خدا کے نظامِ ربوبیّت کے حامل بن جائیں اور اس کا ذریعہ وہ ضابطۂ قوانین (کتاب) ہے جو اس نے بغرضِ اطاعت نازل فرمائی ہے۔ (بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ) اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے میں آیتوں کے بعد فرمایا کہ:-

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ (۳/۸۲)

پھر کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نظامِ اطاعت (دین) چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام تلاش کر لیں ؟ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے خوشی سے ہو یا ناخوشی سے سب اسی کے قانون کے فرماں بردار ہیں اور (ان کے ارتقاء کی سب گردشیں) اسی (قانونِ سرمدی) کی طرف رُخ کئے ہوئے ہیں۔

ایک ہی نظامِ اطاعت

یعنی یہ نظامِ حکومتِ الٰہیہ عین تقاضائے فطرت ہے۔ کائنات کی ہر شے اللہ ہی کے ضابطۂ قوانین کے تابع اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے۔ کوئی شے نہ اس کی محکومیت سے سرتابی کر سکتی ہے نہ کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کر سکتی ہے۔ جب کائنات کی ہر شے کی یہی فطرت اور یہی آئین ہے تو پھر انسان کے لئے کوئی اور آئینِ حکومت اور نظامِ اطاعت (دین) کیوں ہو؟ اگر انسان کوئی دوسرا نظام اختیار کریں گے تو اس غیر فطری نظامِ زندگی کی سزا بھگتیں گے۔ اللہ کے میزان میں ان کی یہ روشِ زندگی ناقابلِ قبول ہو گی۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (۳/۸۴)

اور جو کوئی اسلام (نظامِ حکومتِ خداوندی) کے علاوہ کسی اور نظامِ اطاعت (دین) کا خواہش مند ہو گا، تو وہ کبھی قبول نہیں کیا جائے گا۔

خدا کی اطاعت و محکومیت کے علاوہ کوئی بھی نظامِ اطاعت و حکومت ہو، سب غیر اسلامی اور خلافِ شرفِ انسانیت ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ایسے نظام کا نام طاغوتی نظام یعنی غیر اللہ کا نظام ہے۔ جو خدا کی حکومت سے سرکشی اختیار کر کے کوئی اور نظامِ اطاعت و حکومت قائم کرے، وہی طاغوت ہے۔ اس لئے حکومتِ خداوندی کا اقرار اور ہر طاغوتی نظامِ اطاعت کا انکار دینِ قیّم ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ

الْوُثْقٰی لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

اور جس نے طاغوت کی اطاعت سے منہ پھیر لیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے بلاشبہ محکم شاخ کو پکڑ لیا، جو ٹوٹ نہیں سکتی۔

خدا پر ایمان کا مفہوم | یہ خدا کا اقرار اور غیر خدا کا انکار ہے۔ خدا کے اقرار سے مطلب یہ ہے کہ اطاعت صرف اس کے قانون کی کی جائے اور اس کے قانون کی اطاعت اس نظام کے ذریعہ ہوتی ہے جو ان قوانین کے نفاذ کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا (۴/۵۹)

اے ایمان والو! اللہ کے نظامِ حکومت کے مرکز (اللہ اور رسولؐ) کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں سے اس مرکز نے صاحب اختیار بنائے ہوں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں اور ان صاحبانِ اختیار میں اختلاف پیدا ہو جائے تو چاہیئے کہ مرکز نظامِ خداوندی کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے اور اسی میں انجامِ کار کی خوبی ہے۔

یعنی خدا اور آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تم خدائی نظام کی اطاعت اختیار کرو اور اپنے تمام اختلافات و نزاعات کے رفع کرنے کے لئے اسی مرکزِ اطاعت و تسلیم کی طرف رجوع کرو۔ خدا پر ایمان لانے سے خدا اور بندے کے درمیان یہی تعلق پیدا ہونا چاہیئے، یعنی حاکم اور محکوم کا تعلق۔ نہ یہ کہ خدا کو ایک پرستش کی شے (OBJECT OF WORSHIP) سمجھ کر اس کی پوجا کر لی اور اپنے معاملات میں غیر خدائی نظام کی طرف رجوع کیا۔ یہ تو خدا کے بجائے طاغوت پر ایمان کے مترادف ہے جس سے انکار کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ آیت مندرجہ صدر سے اگلی آیت میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ

ضَلٰلًا بَعِيدًا۔ (۴/۶۰)

کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ تجھ پر نازل کیا ہوا ہے اور جو کچھ تجھ سے پہلے نازل ہو چکا ہے، وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن (عملاً یہ حالت ہے) کہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات میں فیصلہ غیر خدائی نظام (یعنی طاغوت) سے کرائیں حالانکہ انھیں حکم دیا جا چکا ہے کہ وہ طاغوت سے انکار کریں اور (اصل یہ ہے) کہ سرکش نظام چاہتا ہے کہ انھیں اس طرح بہکا دے کہ راہِ راست سے بہت دور جا پڑیں۔

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اللہ پر ایمان اور طاغوت سے انکار کے معنی کیا ہیں؛ خدا کے قانون سے فیصلے طلب کرنا' یہ ہے خدا پر ایمان اور اس کی عبودیّت اور غیرِ خدا سے معاملات کے تصفیئے کرانا' یہ ہے طاغوت پر ایمان اور اس کی محکومیّت۔ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تمھیں خدائی قانون کی محکومیّت کے صراطِ مستقیم سے گمراہ کرکے تحاکم الی الطاغوت (غیر خدائی نظام کی محکومیّت) کے غلط راستے پر لے جائے۔ ایسا غلط راستہ جس پر چلنے سے تم صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑو، یعنی یہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے بالکل متضاد (DIAMETRICALLY OPPOSITE) ہیں۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ تم طاغوتی نظام اختیار کرو۔ اس لئے یہ خود شیطان (یعنی قانونِ خداوندی سے سرکشی کرنے والوں) کا نظام ہے اور خدائی نظام کے مخالف اِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (۲/۱۶۹) شیطان تمھیں ناہمواریاں پیدا کرنے والے نظام اور بخل کا حکم دیتا ہے۔ اس کے برعکس' اِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ (۷/۲۸) یقیناً اللہ بخل کا حکم کبھی نہیں دیتا۔ بلکہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ... وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۱۶/۹۰) یقیناً اللہ تعالےٰ تمھیں عدل و احسان[1] کا حکم دیتا ہے اور فواحش و منکر سے روکتا ہے۔ یعنی اللہ جس بات کا حکم دیتا ہے" شیطان" اس سے روکتا ہے اور جس بات سے اللہ روکتا ہے" شیطان" اسے اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ خدا اور" شیطان" کے نظام ایک دوسرے سے متخاصم اور ان کے فیصلے ایک دوسرے سے متضاد و مخالف ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے جہاں خدا کی عبادت (محکومیّت) کا حکم دیا ہے اسی کے ساتھ ہی" شیطان" کی عبادت (محکومیّت) سے منع کیا ہے۔

---

[1] عدل اور احسان کے صحیح مفہوم کے لئے" سلیم کے نام خطوط" دیکھئے۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝ (۳۶/۶۰-۶۱)

شیطان کی پرستش

یہاں عبادت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اگر (لَا تَعْبُدُوا الشَّیْطَانَ) کے معنی یہ لئے جائیں کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا تو اس سے مطلب کچھ نہیں نکلتا۔ اس لئے کہ دنیا میں کون ہے جو شیطان کی پرستش (WORSHIP) کرتا ہے؟ شیطان کے (یعنی غیر خدائی) احکام مانے جاتے ہیں۔ طاغوتی نظام کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے لیکن شیطان کی پرستش تو کہیں نہیں ہوتی۔ عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسم کے فرقے (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں لیکن تحقیقات نے یہ بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس کے خوف کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم ہے، اس لئے اس سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں لیکن شیطان سے ضرور خوف کھانا چاہیئے کیونکہ وہ بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اسی لئے اسے شیطان نہیں کہتے بلکہ اس کا نام "ملک طاؤس"[ل] رکھ چھوڑا ہے۔ یہ غالباً شیطان کے حضرت آدمؑ کو بہکانے کی اسرائیلی روایت کی طرف تلمیح ہے۔ بہرحال مقصد یہ بتانا تھا کہ شیطان کی پرستش (پوجا) کوئی نہیں کرتا۔ اس لئے (لَا تَعْبُدُوا الشَّیْطَانَ) کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کی اطاعت نہ کرو۔ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ۔ (۲/۱۶۸) شیطان کے نقشِ قدم کا اتباع نہ کرو۔ لہٰذا عبادت کے معنی اطاعت و محکومیت کے ہیں۔

عبادت کے قرآنی مفہوم کو پیشِ نظر رکھیے اور پھر اس آیۂ جلیلہ پر غور فرمائیے کہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶)

اور میں نے جن اور انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

ل ایک انگریز (خاتون) نے ان لوگوں کے کوائف و معتقدات کا ذاتی طور پر مطالعہ کر کے اس نام سے ایک دلچسپ کتاب شائع کی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس سے ڈرتے ہیں۔ اس مقام پر شیطان سے مراد (DEVIL) ہے لیکن قرآن جس شیطانی نظام کی محکومیت سے منع کرتا ہے، وہ انسانوں کا خود ساختہ ہر غیر خدائی نظام ہے جس میں قانونِ خداوندی سے سرکشی اختیار کی جاتی ہے۔

یعنی جن وانس کی تخلیق کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی "عبادت" کریں۔ (جن کسے کہتے ہیں؟ اس کے لئے میری کتاب "ابلیس وآدم" دیکھئے۔) اگر (لیعبدون) کے معنی پوجا اور پرستش کے لئے جائیں تو ارشادِ خداوندی کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کو چاہیئے کہ ہر وقت خدا کی پرستش کرتا رہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ناممکن ہے۔ انسان ہر وقت خدا کی پرستش کیسے کر سکتا ہے؟ پرستش تو کچھ وقت کے لئے ہوگی۔ باقی اوقات میں انسان کو دوسرے کام بھی کرنے ہونگے۔ ہمارے ہاں خدا کی "پرستش" کی شکل "نماز" قرار دی جائے گی۔ سو یہ بھی واضح ہے کہ نماز بھی شب و روز میں پانچ مرتبہ ہی پڑھی جاتی ہے۔ ہر وقت نماز پڑھنے کا حکم نہیں۔ اس لئے (لِیَعْبُدُوْنِ) کے معنی پرستش کرنے کے نہیں بلکہ اطاعت و محکومیت اختیار کرنیکے ہیں۔ یعنی آیہ مقدسہ سے مفہوم یہ ہے کہ تخلیقِ انسانی سے مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرے۔ اپنی زندگی خدائی نظام کے ماتحت بسر کرے۔ اس لئے کہ یہی نظام اس کی ذات کی بالیدگی، استحکام اور نشوونما و ارتقاء کا موجب ہے۔ اس آیت میں "عبادت" کا وہی مفہوم ہے جو سورۂ یٰسین کی ان آیات میں مذکور ہے جو پہلے بھی درج کی جا چکی ہیں یعنی۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ
(۳۶/۶۱-۶۰)

اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے اس بات کا عہد نہیں لے رکھا کہ تم شیطان کی محکومیت اختیار نہ کرنا۔ یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے اور صرف میری ہی عبادت کرنا۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

اس مقام تک یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اسلام میں خدا اور بندے کا تعلق پرستش کا نہیں خدا کی حاکمیت کے اقرار اور عملی اعتراف کا ہے۔ خدا کی حاکمیت سے کیا مقصود ہے؟

خدا کی حاکمیت سے مراد اور اس حاکمیت کا عملی اعتراف کس طرح ہوتا ہے۔ ان عنوانات پر میرے اکثر مضامین میں شرح و بسط سے بحث کی جا چکی ہے[۱] جن کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ مختصر الفاظ میں "خدا کی حکومت" سے مقصود یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانہ

---

[۱] مثلاً "قرآن کا سیاسی نظام"۔

کے تقاضوں کا حل، ان محکم اصولوں کی روشنی میں متعین کریں جو بطور مستقل اقدار، قرآن کی دفتین میں مذکور و محفوظ ہیں اور اس طرح ارض (معاشی اور اجتماعی نظام) کو سماء (مستقل اقدارِ کائنات) سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ارتقائی منازل طے کرتے جائیں۔

یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ " حاکم اور محکوم " کے تعلق سے ہمارا ذہن آقا اور غلام کے تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ آقا اور غلام کا تعلق یہ ہوتا ہے کہ آقا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے حکم دیئے چلا جاتا ہے اور غلام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان احکام کی بے چون وچرا تعمیل کرتا چلا جائے۔ چنانچہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ کہا بھی جاتا ہے کہ" خدا ہمارا آقا ہے' ہم اس کے غلام ہیں "۔ جو لوگ احکامِ اسلامی' (یعنی نماز' روزہ ' حج ' زکوٰۃ وغیرہ) کی پابندی کرتے ہیں، ان سے پوچھئے تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ خدا کا حکم ہے، اس لئے ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک یہ احکام مقصود بالذّات ہیں' کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ " پرستش " میں " عبادت " مقصود بالذّات بن جاتی ہے۔ مثلاً جس شخص نے ان شرائط و حدود کے مطابق جو اس کے لئے متعین کی گئی ہیں' نماز ادا کرلی، وہ سمجھ لیتا ہے کہ جو فریضہ مجھ پر عائد ہوتا تھا ' وہ ادا ہو گیا۔ اسے اس سے مطلب نہیں کہ اس نماز کا کچھ نتیجہ بھی مرتب ہوا ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک نماز پڑھنا آقا کا حکم تھا جس کی تعمیل غلام کا فرض تھا۔ غلام کو اس سے واسطہ نہیں کہ اس حکم کی تعمیل سے غایت کیا تھی اور اس کا مقصود کیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کہے گا کہ میں نے اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کر دی۔ مالک مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی جواب ہمارے ہاں کے " عبادت گزار بندوں " کی طرف سے ملتا ہے۔ جب ذرا زیادہ کرید کر پوچھئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب ملتا ہے اور جب پوچھئے کہ ثواب سے کیا حاصل ہوتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے " نجات " مل جاتی ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ ثواب کسے کہتے ہیں اور نجات سے کیا مفہوم ہوتا ہے۔ آپ نے بھی ہزار مرتبہ ثواب کا لفظ سنا ہوگا اور خود بھی بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ اس سے آپ کی مراد کیا ہوتی ہے؟ اور تو اور اگر آپ سے کوئی کہہ دے کہ صاحب! ثواب کا لفظ عربی زبان کا ہے' اس کی جگہ اپنی زبان کا کوئی لفظ استعمال کر دیجئے تاکہ ہماری سمجھ میں آجائے کہ ثواب سے مفہوم کیا ہے' تو آپ اس کی جگہ دوسرا لفظ نہیں استعمال کر سکیں گے۔ ایک لفظ میں نہیں' ایک فقرہ میں بھی آپ اس کا مفہوم نہیں سمجھا سکیں گے۔ اس لئے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم خود آپ کے ذہن میں بھی نہیں۔ ثواب کسے کہتے ہیں؟ نجات سے مفہوم کیا ہے؟ ان امور کے متعلق الگ مضامین میں صراحت کی گئی ہے جو آگے چل کر آپ کے سامنے

ثواب کے معنی

آئیں گے۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ جب دین کا صحیح تصوّر سامنے ہو، تو دین کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم بھی سمجھ میں آجاتا ہے لیکن جب دین، مذہب میں بدل جائے، تو پھر یہ اصطلاحات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ اگر صرف اسی ایک نکتہ کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس باب میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ دنیائے فکر و عقیدہ میں کہیں اور نہیں ملتا۔ یعنی اسلام نے خدا اور بندے کے تعلق کا جو تصوّر دیا ہے وہ دیگر تصورات سے یکسر الگ اور ارفع و اعلیٰ ہے اور اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ وہ تصور ان دو الفاظ میں سمٹا ہوا ملے گا جو نبیؐ اکرمؐ کی زبانِ مبارک پر وفات کے وقت آخری الفاظ تھے۔ "ھوالرفیق الاعلیٰ" یعنی خدا اور بندے کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے لیکن ایسی رفاقت جس میں خدا کی حیثیت رفیقِ اعلیٰ کی ہے اور انسان کی حیثیت رفیقِ ادنیٰ کی، لیکن تعلق بہرحال رفاقت کا ہے۔ سارا قرآن اسی تعلق کی تفسیر ہے۔ اب غور کیجئے کہ کیا خدا اور انسان کا یہ تعلق آپ کو کہیں اور بھی ملتا ہے؟ دنیائے افکار اور جہانِ عقائد دونوں میں نگاہ دوڑا کر دیکھئے۔ یہ تصور آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔

رفاقت سے مقصود کیا ہے، اس تعلق کی عملی شکل کیا ہوگی؟ اس سے نتائج کیا مرتب ہوں گے؟ ان تفاصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

انسان اور خُدا کا تعلق رفاقت کا ہے!

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام نظامِ کائنات ایک خاص نظم و ضبط سے چل رہا ہے[1]۔ اور ایک متعیّنہ منزل کی طرف رواں دواں چلے جا رہا ہے۔ اس میں ہر آن حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ حق اور باطل قرآن کی دو عظیم القدر اصطلاحیں ہیں جن کا صحیح مفہوم تفصیلاً ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اجمالاً صرف اتنا سمجھئے کہ حق پروگرام کے مثبت (POSITIVE) پہلو کا نام ہوتا ہے جس کا نتیجہ تعمیر ہوتا ہے اور باطل اس کے منفی (NEGATIVE) پہلو کو کہتے ہیں جس کا مآل تخریب ہوتا ہے۔ ہر تعمیر کے لئے ایک تخریب ضروری ہوتی ہے۔ جب تک دانہ میں منفیانہ حیثیت سے تخریب نہیں واقع ہو جاتی، پودا اپنی مثبت حیثیت سے وجود میں نہیں آسکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں منفی اور مثبت پہلوؤں کی یہ کشمکش ہر آن جاری ہے لیکن قانون یہ ہے کہ مثبت پہلو ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ تعمیری پہلو کے اس غلبہ سے کائنات میں ارتقاء (EVOLUTION) کا سلسلہ جاری ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "اسبابِ زوالِ اُمت"۔

یہ قانون کیا ہے جس سے کائنات میں تعمیری پہلو اس طرح غالب رہتے ہوئے ہر شے کو نشوونما دیئے جا رہے ہیں؟ قرآن میں غور کرنے سے یہ حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ کائنات میں جو حادثہ واقع ہوتا ہے اس کے ردِّ عمل[1] (RE-ACTION) کے لئے ایک خاص صفتِ خداوندی (ASPECT OF REALITY) ظہور میں آتی ہے۔ اس طرح مختلف حوادث کے لئے مختلف شئونِ الٰہیہ کا ظہور ہوتا ہے لیکن ایک خاص حادثہ کے لئے ہر مرتبہ اسی قسم کی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس التزام اور استمرار کو سنت اللہ کہتے ہیں۔

سُنّتُ اللہ

اسی کا نام قانونِ الٰہیہ ہے جس کا وہ حصہ جو ہمارے حیطۂ ادراک میں آجاتا ہے، قانونِ فطرت کہلاتا ہے اور جو حصہ ماورائے فطرت، یعنی عالمِ امر سے متعلق ہے، قانونِ مشیت کہلاتا ہے۔

یہ کچھ عالمِ آفاق (نظامِ فطرت) میں ہو رہا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی کو اپنا تمدنی نظام بھی اسی نہج و اسلوب سے چلانا چاہیئے جس انداز و طریق پر نظامِ فطرت چل رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی نظامِ تمدن و معیشت میں کوئی حادثہ یا واقعہ رونما ہوتا ہے تو انسانی طبائع اس پر ایک خاص انداز سے (RE-ACT) کرتی ہیں۔ یہ ردِّ عمل (RE-ACTION) چونکہ مبنی ہوتا ہے ذاتی مصالح و منافع پر، اس لئے مختلف انسانوں کا ردِّ عمل مختلف ہوتا ہے۔ یا انسانوں کے ایک ہی گروہ کا مختلف مواقع پر ردِّ عمل مختلف۔ قرآن کی رو سے اس کا نتیجہ فساد فی الارض (تمدنی زندگی میں ناہمواری) ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح نظامِ فطرت میں ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک خاص قسم کا ردِّ عمل ہوتا ہے اور اس میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۳۳/۶۲) اسی طرح تمہارے اجتماعی نظام میں بھی ایک حادثہ یا واقعہ پر ایک ہی قسم کا ردِّ عمل ہونا چاہیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ ردِّ عمل کس قسم کا ہونا چاہیئے؟ قرآن کہتا ہے کہ نظامِ فطرت میں ایک حادثہ پر جس قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہوتا ہے انسانی نظامِ تمدن و معیشت میں اُس قسم کے حادثہ پر اسی قسم کی صفت کا ظہور انسانوں کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ اگر ایسا ہوا تو سمجھ لو سنت اللہ کے موافق ہوا اور جب یہ ردِّ عمل پورے التزام اور استمرار سے ظہور میں آنے لگ گیا، تو سمجھ لو کہ تم میں صفاتِ خداوندی منعکس ہو گئیں۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں "خدا کے رنگ" میں رنگے جانا ہے۔ (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ۲/۱۳۸) عربی زبان میں عبد کے

---

[1] ردِّ عمل کا لفظ محض سمجھانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اسے اس مفہوم میں نہ لیجئے جس میں یہ انسانی جذبات کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جذبات کا ردِّ عمل اور مفہوم رکھتا ہے۔ خدائی ردِّ عمل سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات کے حادث سے صحیح نتائج مرتب کرنے کیلئے خدا کی کون سی قدرت (صفت) ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اقبال نے اسے (BEHAVIOR OF REALITY) سے تعبیر کیا ہے۔

معنی ہیں کسی نئے گھوڑے یا اونٹ کو سدھا کر سواری کے قابل بنانا۔ اسے انگریزی میں (BREAKING) یا (HARNESSING) کہتے ہیں۔ لہٰذا عبادت کے معنی ہیں اپنی شخصیت کو قوانینِ خداوندی کے قالب میں ڈھالنا۔ اسی کو صبغۃ اللہ کہتے ہیں۔

اب دیکھئے کہ کائنات کے ایک حصہ (نظامِ طبعی) میں خاص حوادث و وقائع پر خاص شئونِ الٰہیہ (صفاتِ خداوندی) ظہور میں آ رہی ہیں جس سے حق (تعمیری پہلوؤں) کے غلبہ سے کائنات اپنے مقصود و منتہیٰ کی طرف چلے جاتی ہے۔ اگر اس کے دوسرے حصہ (انسانی نظامِ تمدن و معیشت) میں اس قسم کی صفات کا ظہور (بشریت کی حدود کے اندر) انسان کی طرف سے ہو تو اسے خدا اور انسان کی رفاقت کہا جائے گا۔ اس میں خدا رفیقِ اعلیٰ ہو گا کیونکہ مستقل قانون (سنت اللہ) اسی کا ہے۔ انسان اس کے قانون کا اتباع کرتا ہے یعنی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ آگے آگے خدا (کا قانون) صراطِ مستقیم پر جا رہا ہے۔ (اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۱۱/۵۶) یقیناً میرا رب صراطِ مستقیم پر ہے) اور اس کے پیچھے پیچھے[1] اھدنا الصراط المستقیم کی آرزوؤں کو عمل میں لانے والا انسان، اسی راہ پر جا رہا ہے۔ اور اس طرح عالمِ آفاق اور جہانِ انسانیت دونوں اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ کس طرح معلوم ہو کہ فلاں قسم کے حادثہ یا واقعہ پر خدا کی کس صفت کا ظہور ہوتا ہے تاکہ اس کی طرف سے بھی اس قسم کے حادثہ یا واقعہ پر اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ یہی وہ مقام ہے

وحی کی راہ نمائی

جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے۔ اس چیز کو خدا نے خود بتا دیا۔ قرآن میں اسمائے حسنیٰ (مختلف صفات و شئونِ الٰہیہ) کا ذکر اسی مقصدِ جلیلہ کے لئے آیا ہے۔ کہیں الفاظ کے پیرایہ میں اور کہیں نظامِ فطرت یا اُمم سابقہ سے متعلق حوادث و وقائع کے سلسلے میں "خدائی فیصلوں" کی صورت میں۔ قرآن میں غور و فکر سے یہ حقیقت نمایاں طور پر انسان کے سامنے آ جاتی ہے۔ ان چیزوں کو بھی قرآن بلا دلیل و برہان پیش نہیں کرتا۔ وہ بار بار نظامِ فطرت اور احادیثِ اُمم سابقہ (تاریخی یادداشتوں) پر تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور ان کے نتائج کو "استشہاد" پیش کرتا ہے۔ مقصود ان سب سے یہی ہے کہ انسان سے اس کی حیاتِ اجتماعیہ کے دائرہ میں اس قسم کی صفات ظہور پذیر ہوں۔ بعض امور میں وہ ان شئون کی عملی صورت بھی خود ہی متعین کر دیتا ہے۔ (یہ وہ "احکام" ہیں، جن کا تعین قرآن نے کر دیا ہے) لیکن اکثر امور میں وہ ان صفات کو اصولی طور پر سامنے لاتا ہے تاکہ ان

---

[1] عربی زبان میں اسی طرح پیچھے پیچھے چلنے والے کو "مصلی" کہا جاتا ہے۔ اس سے صلوٰۃ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

کی عملی تشکیل مقتضیاتِ زمانہ کے پیشِ نظر خود متعین کر لی جائے۔ "حکومتِ الٰہیہ کے قیام" سے مقصود یہ ہے کہ انسانی حیاتِ اجتماعیہ (نظامِ تمدن و معیشت) اس انداز کا ہو جائے کہ اس میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ پر ایک ہی قسم کا ردِ عمل ہو اور وہ ردِ عمل انسانوں کی طرف سے اس صفت کا ظہور ہو، جس صفت کا ظہور نظامِ کائنات میں ایسے حادثہ پر خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ "خدا کی محکومیّت" سے یہی مقصود ہے یعنی وہ نظامِ اجتماعیہ جس میں انسان "خدا کے رنگ میں" رنگے ہوئے ہوں، اس ہیئتِ اجتماعیہ میں انسانی نظامِ تمدن اسی قسم کے نظم و ضبط اور توازن و توافق کے ساتھ چلتا جائے گا جس حسن و عدل کے ساتھ نظامِ کائنات چلا جا رہا ہے۔

لہٰذا اسلام میں عبادت سے مفہوم ہے محکومیّت اور محکومیّت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے پیچھے پیچھے چلتا جائے۔ (اتباع) اور یہ اتباع بطیبِ خاطر، دل کی مرضی سے ہو، نہ کہ کسی جور و استبداد سے۔ اسی کو اطاعت کہتے ہیں۔ اطاعت کے معنی ہیں برضا و رغبت کسی کام کو کرنا۔ اس لئے عبادت، محکومیّت، اتباع وغیرہ، مختلف الفاظ سے مفہوم رفاقت ہے جس میں خدا رفیقِ اکبر ہوتا ہے اور انسان رفیقِ اصغر۔ خدا کی اس رفاقت و توافق سے انسانی زندگی کا نظام انہی ہمواریوں اور استواریوں کے ساتھ چلتا ہے جن کے ساتھ نظامِ کائنات چل رہا ہے۔ نظامِ کائنات اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں چل رہا۔ اسے اسی طرح چلایا جا رہا ہے۔ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے نظام کو اسی نہج پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلائے گا۔ انسانی اختیار و ارادہ کو اگر کسی قانون کا پابند نہ کیا جائے تو اسے سرکشی، اور طغیان کہتے ہیں اور اس طرح قائم کردہ نظامِ اجتماعیہ کو طاغوتی نظام کی اصطلاح سے پکارا جاتا ہے لیکن اگر اسی اختیار و ارادہ کو سنت اللہ (BEHAVIOR OF REALITY) سے ہم آہنگ کر لیں تو اس نظام کو نظامِ فطرت یا حکومتِ الٰہیہ کہا جائے گا۔ اسلام کے مختلف شعائر و مناسک اور "عبادت" کے طور طریقے، سب اسی حکومتِ الٰہیہ کے حصول، قیام اور بقا کے ذرائع ہیں۔

استخلاف کا مفہوم

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ، خدا کا یہ وعدہ (اٹل قانون) ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں گے (یعنی اپنی زندگی کو صفاتِ الٰہیہ کا آئینہ دار بنانے کا تہیّہ کریں گے) اور پھر ان سے "اعمالِ صالحہ" سرزد ہوں گے (یعنی ایسے اعمال جو نظامِ زندگی میں توازن اور درستی پیدا کر دیں) تو اس کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور یہ ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس پر تاریخ شاہد ہے کہ اقوامِ سابقہ میں سے جنھوں نے ایسا کیا ان کے ایمان و عمل کا یہی نتیجہ مرتب ہوا۔ اس استخلاف فی الارض سے ہوگا

یہ کہ تمھارا یہ نظامِ زندگی، جس میں تم نے اپنی حیاتِ ارضی کو مستقل اقدار سے ہم آہنگ کر لیا ہے، متمکن ہو جائے گا (وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ) اور تمھارا خوف امن سے بدل جائے گا۔ (وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا) کیونکہ اس نظام میں غلبہ ہمیشہ تعمیری پہلوؤں کا ہوگا۔ اس لئے کہ جب نظامِ کائنات اور نظامِ انسانی میں ایک ہی قانون عمل فرما ہوگا تو ہو نہیں سکتا کہ اس کے نتائج مختلف ہوں۔ مختلف نتائج تو مختلف قوانین پر عمل کرنے سے مرتب ہوتے ہیں۔ اسے شرک کہا جاتا ہے۔ (يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا) جب تک تم اس پروگرام پر عمل پیرا ہو گے تمھارا نظام، نظامِ فطرت کی طرح ہموار چلتا جائے گا۔ جب تم اس سے مُنہ موڑ لو گے تو پھر زندگی کی ناہمواریاں شروع ہو جائیں گی۔ (وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ) اس نظام کو قائم رکھنے کا ذریعہ قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نام ہے۔ (وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ) اور نظام درحقیقت قائم ہوتا ہے مرکزِ حکومتِ الٰہیہ کی اطاعت سے (وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ) اس انداز سے خدا کا قانون تمھاری نشوونما کئے جاتا ہے۔ (لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۲۴/۵۵-۵۶)۔

"قیامِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا نظام بڑا تشریح طلب ہے۔ درحقیقت یہ بھی نظامِ دین (نہ کہ رسوماتِ مذہب) کی اصطلاحیں[1] ہیں۔ اس وقت کم از کم یہ بات تو ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ یہ "ارکانِ دین" اس نظامِ اجتماعیہ کے حصول و قیام کا ذریعہ ہیں جسے استخلاف فی الارض (حکومتِ الٰہیہ یا تمکنِ دین) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ "عبادات" مقصود بالذات نہیں، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اس لئے یہ "پرستش" کے طور طریقے نہیں، بلکہ نظامِ انسانیت کے قیام کے ارکان ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ حج کے متعلق فرمایا ہی یہی ہے کہ اس سے قیاماً للناس مقصود ہے، یعنی نوعِ انسان میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ۔ اسی طرح دیگر ارکان کی کیفیت ہے۔ ان امور کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔ اس وقت ہم صرف اصولی طور پر "عبادت" کے قرآنی مفہوم سے بحث کر رہے ہیں۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہو گی کہ "عبادت" سے مراد قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے، محض "پوجا پاٹ" نہیں ـــــ "صلوٰۃ میں رکوع و سجود بھی اسی جذبۂ اطاعت اور سپردگی کے عملی مظاہر ہیں۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ کے معنی ہیں' ہم صرف تیری اطاعت کرتے ہیں، صرف تیری محکومیت اختیار کرتے ہیں، تیرے قوانین کے علاوہ اور کسی کے قوانین و احکام کی اطاعت نہیں کرتے۔ کسی کی محکومیت کو جائز نہیں

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "سلیم کے نام" خطوط کا مجموعہ۔

سمجھتے۔ اسی کو توحید کہتے ہیں۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں عبادت کا قرآنی مفہوم۔ وہی عبادت جو دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے سے پرستش کی چند رسومات اور پوجا پاٹ کی حرکات و سکنات بن کر رہ گئی۔

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

کیا اس سے بڑا انقلاب بھی سورج کی آنکھ نے کہیں دیکھا ہے؟

زکوٰۃ

(اکتوبر ۱۹۵۰ء)

ایک اہم اور اصولی بحث

حکومتِ پاکستان نے ایک زکوٰۃ کمیٹی مقرر کی ہے تاکہ وہ زکوٰۃ کی وصولی اور خرچ کے مسئلہ پر غور و تحقیق کرے۔ اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے جو زکوٰۃ کی جزئیات سے متعلق بہت سے امور پر مشتمل ہے۔ مثلاً زکوٰۃ کی تعریف کیا ہے۔ کن کن لوگوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کس طرح ادا کرنی چاہیئے؟ زکوٰۃ کی رقم کن مصارف میں خرچ ہونی چاہیئے؟ کیا موجودہ حالات کے پیشِ نظر نصاب اور زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی ہو سکتی ہے وغیرہ ــــ؟ سیکرٹری زکوٰۃ کمیٹی نے یہ سوالنامہ میرے پاس بھی بھیجا ہے کہ میں امورِ مستفسرہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ میں نے اس سوالنامے کے جواب میں جو "یادداشت" سیکرٹری زکوٰۃ کمیٹی کو بھیجی ہے اسے الگ شائع کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہوگا کیونکہ اس میں ایسے نکات آ گئے ہیں جو اس مسئلہ پر ایک خصوصی انداز سے روشنی ڈالتے ہیں۔ سوالنامہ اور اس کا جواب انگریزی میں تھا۔ ذیل میں اس سوال کا آزاد ترجمہ بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

زکوٰۃ کمیٹی کی تشکیل، اس کے ذمہ عائد کردہ فرائض اور سوالنامہ کی تفاصیل سے مترشح ہوتا ہے کہ حکومت کا غالباً یہ خیال ہے کہ اس کے ذمہ مملکتِ پاکستان کی رعایا کے "دنیاوی امور" کا انصرام ہے جس کے لئے وہ مختلف مدّات سے اپنی آمدنی کی تحصیل کرتی ہے اور اس آمدنی کو اپنی صوابدید کے مطابق مناسب مقامات پر خرچ کرتی ہے لیکن کچھ ایسے "مذہبی امور" ہیں جو حکومت کے دائرۂ عمل و نفوذ سے باہر ہیں۔ ان امور کے لئے "مذہب" نے ایک خاص

ذریعۂ آمدنی متعین کیا ہے جسے زکوٰۃ کہتے ہیں اور اس مد سے حاصل شدہ آمدنی کو مذہبی امور ہی پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت کے ذہن میں کچھ اس قسم کا تصور ہے تو معاف فرمائیے، یہ تصور ایک بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے، اور قرآن کے منشا کے یکسر خلاف۔ قرآن "دنیاوی امور" و "مذہبی امور" میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا لفظ ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے یہ لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو مذہب نہیں دیا، دین عطا فرمایا ہے اور دین کے معنی آج کی اصطلاح میں نظامِ معاشرت (SOCIAL ORDER) یا نظامِ مملکت (SYSTEM OF STATE) کے ہیں۔ قرآن توحید سکھاتا ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان کی موجودہ اور آنے والی زندگی سے متعلق قوانین کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ لہٰذا ان میں تفریق، ثنویت پر مبنی ہے جو قرآن کی رو سے شرک ہے۔ بنا بریں، دین اسلامی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے اور اس میں "قیصر اور خدا" کے حصول کی تفریق زمانہ قبل از اسلام کے مذہبی تصور کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام اس تفریق کو مٹانے کے لئے آیا تھا لیکن جب

اسلام میں ثنویت نہیں

مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی تو انھوں نے "قیصر اور خدا" کی مملکتوں کو پھر سے الگ کر دیا۔ دنیا اور مذہب کی یہی ثنویت (DUALISM) اُس وقت سے آج تک مسلمانوں میں چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی جو کچھ عام طور پر مذہب کے نام سے کیا جا رہا ہے یا جو کچھ کرنے کے ارادے ظاہر کئے جا رہے ہیں، وہ بھی اسی تفریقی مسلک کے شاہد ہیں۔ لہٰذا جب تک اس ثنویت کو ذہنوں سے دور نہیں کیا جائے گا، نہ تو اسلام کے متعلق صحیح تصور قائم ہو سکے گا اور نہ ہی ہماری عملی دنیا میں صحیح اسلامی قوانین رائج ہو سکیں گے۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم بھی اسی صورت میں سمجھ آ سکتا ہے جب دین سے متعلق قرآن کے اس صحیح تصور کو سامنے رکھا جائے۔ لہٰذا زکوٰۃ کی قرآنی تشریح سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دین کا بنیادی تصور سامنے لایا جائے۔

دین کیا ہے

دین کا بنیادی تصور یہ ہے کہ دنیا میں ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جس کی رُو سے ہر فردِ انسانی کے لئے اس کی مضمر صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشو و نما پانے کے مواقع یکساں طور پر موجود ہوں۔ اس نظام کو قرآنی مفہوم میں نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے اور جو وحدتِ خالق اور وحدتِ خلق کے محکم اصول پر مبنی ہے۔ چونکہ اس قسم کا نظامِ ربوبیت قائم نہیں ہو سکتا، جب تک رزق کے تمام سرچشمے اس جماعت کے ہاتھ میں نہ ہوں جو اس قرآنی نظام کے قیام کی ذمہ دار ہے، اس لئے اس جماعت کے لئے تمکن فی الارض ناگزیر ہے۔ یہی وہ منشاء اور غایت ہے جس کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت وجود میں آئے، یعنی اسلامی حکومت

کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے دائرۂ حفاظت میں بسنے والے تمام انسانوں کی ربوبیت (یعنی ان کی تمام مضمر صلاحیتوں کے برومند ہونے) کے لئے پورے پورے اسباب و ذرائع مہیا کرے۔ یہ ایک محکم اصول ہے جسے قرآن نے اسلامی حکومت کے لئے بطورِ اساس متعین کر دیا ہے اور جس میں زمان و مکان کی تبدیلی سے کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کو عملی طور پر کیسے متشکل کیا جائے گا، اس کا تعلق زمان اور مکان کے بدلنے والے حالات سے ہے، یعنی ہر زمانے کے مسلمان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس اصولی مقصد کے حصول کے لئے عملی جزئیات خود متعین کریں گے۔ قرآن کا اسلوبِ ہدایت ہی یہ ہے کہ اس نے (بجز چند مستثنیات کے) اسلامی نظام کے لئے صرف اصول متعین کئے ہیں، ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ اس لئے، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس کے اصول محکم اساس پر مبنی ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن ان اصولوں کی جزئیات مختلف حالات کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

شریعت کسے کہتے ہیں

ان بدلنے والی جزئیات کو **شریعت** کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ شریعت کسی جامد یا غیر متبدل مجموعۂ قوانین کا نام نہیں بلکہ ہر وہ مجموعۂ قوانین (یعنی قرآنی اصولوں کے تابع مدوّن کردہ جزئیات) جو کسی ایک زمانے کی قرآنی حکومت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی روشنی میں مدوّن کرے، اس نظامِ حکومت کی شریعت کہلائے گی۔ ان جزئیات کے مدوّن کرنے میں ہر زمانے کی اسلامی حکومت ان جزئیات سے مدد لے سکتی ہے جو پہلے دور کی کسی اسلامی حکومت نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مدوّن کی تھیں، یعنی سابقہ دور کی شریعت، بعد کے دور کی اسلامی حکومت کے لئے بطور نظائر (PRECEDENTS) کام دے گی۔ قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلی حکومت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی اور آپ کے بعد آپ کے خلفائے حقہؓ نے۔ اس اسلامی حکومت نے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق قرآنی اصولوں کی جزئیات خود متعین کیں۔ اگر یہ سلسلۂ خلافت اسی طرح قائم رہتا تو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق تدوینِ شریعت کا یہ سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن وہ دور جلد ختم ہو گیا اور اس کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آ گئی۔ جس میں رفتہ رفتہ امورِ دنیاوی کو حکومت نے اپنے ذمے لے لیا اور "مذہبی امور" کو "اربابِ مذہب" کے سپرد کر دیا۔ ان حکومتوں نے بھی اپنی ضروریات کے لئے قوانین مرتب کرائے اور یہ قوانین اس وقت کے لئے شریعتِ اسلامی قرار پائے۔ لیکن دین کو دنیا سے الگ کر دینے سے نظامِ اسلامی کی اصل میں خرابی آ گئی اور ایسے قوانین بھی مرتب ہونے شروع

ہو گئے جو قرآن کی واضح تعلیم کے خلاف تھے۔ اب مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ جہاں جہاں ان کی اپنی حکومتیں ہیں، امورِ سلطنت سے متعلق وہ حکومتیں اپنی منشاء کے مطابق قوانین مرتب کرتی ہیں لیکن " امورِ مذہب " سے متعلق (جسے (PERSONAL LAW) کہا جاتا ہے) مفتیوں سے فتاویٰ لے لئے جاتے ہیں اور جہاں ان کی اپنی حکومت نہیں وہاں یہی فتاویٰ انفرادی طور پر صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر آج ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قرآنی منشا کے مطابق شریعت کا نفاذ ہو تو اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اپنے قوانین خود مرتب کریں۔ یہی قوانین شریعتِ اسلامی کہلائیں گے نہ کہ وہ قوانین جو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کسی سابقہ اسلامی حکومت نے وضع کئے تھے۔

اس پس منظر کی روشنی میں اب زکوٰۃ کے اہم مسئلہ پر غور کیجئے۔ قرآن نے ان اسباب و ذرائع کو، جن کی مدد سے اسلامی حکومت، نوعِ انسانی کی ربوبیت کا انتظام کرے گی، زکوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱)

وہ لوگ کہ جنہیں جس وقت ہم زمین میں حکومت عطا کریں گے تو ان کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہوگا۔

یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ (۲۳/۴) یعنی ان کی خصوصیت یہ ہوگی وہ زکوٰۃ کے لئے جدوجہد کریں گے (فاعلون)۔ اگر سورۂ حج کی مندرجہ بالا آیت (۲۲/۴۱) کے معنی یہ لئے جائیں کہ جب ان لوگوں کی اپنی حکومت ہو جائے گی تو یہ آمدنی کا اڑھائی فیصدی حصہ خیرات کے کاموں میں صرف کیا کریں گے، تو یہ بے معنی سی بات ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اپنی آمدنی سے ۲½ فیصدی حصہ خیرات کے کاموں میں صرف کرنے کے لئے اپنی حکومت کی کیا ضرورت ہے؟ یہ خیرات تو ہم ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی کے زمانہ میں بلا روک ٹوک کیا کرتے تھے۔ اس آیۂ جلیلہ کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ غیر قرآنی حکومت میں مقصود حکومت کا اپنا فائدہ ہوتا ہے لیکن قرآنی حکومت میں مقصد پیشِ نظر نوعِ انسانی کی نشوو ارتقاء (زکوٰۃ) ہوتا ہے۔

اس آیت میں " اقامتِ صلوٰۃ " اور " ایتائے زکوٰۃ " اکٹھا آیا ہے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ قرآنِ کریم میں یہ دونوں چیزیں عام طور پر اکٹھی بیان ہوتی ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا باہمی تعلق کیا ہے[1] اور اقامتِ صلوٰۃ سے کیا مفہوم ہے،

---

[1] صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے باہمی تعلق کے لئے سورۂ ہود کی اس آیت کو دیکھئے جس میں قوم شعیب نے کہا تھا کہ کیا تمہاری صلوٰۃ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

یہ چیزیں اس وقت میرے موضوع سے خارج ہیں۔ سردست آپ زکوٰۃ کے متعلق ہی دیکھئے۔ لفظ زکوٰۃ کا مادہ زک وہے جس کے معنی نشوونما (GROWTH) کے ہیں۔ "ایتائے زکوٰۃ" (یعنی زکوٰۃ بہم پہنچانے) کے معنی ہوئے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ بنابریں "زکوٰۃ" سے مراد ہوئے وہ تمام اسباب و ذرائع جن کے ذریعہ اسلامی حکومت نوعِ انسانی کے تزکیۂ (DEVELOPMENT) یا ربوبیت (DEVELOPMENT) کا نظام کرے گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی حکومت کا کام افرادِ ملت کو زکوٰۃ (سامانِ نشوونما) دینا ہوگا، ان سے زکوٰۃ لینا نہیں ہوگا لیکن ایتائے زکوٰۃ (سامانِ نشوونما دینے) کے لئے حکومت کو آمدنی (REVENUES) کی ضرورت ہوگی۔ سلسلے اسلامی حکومت کی تمام آمدنی ذرائع زکوٰۃ بن جائے گی اور اس آمدنی سے نظامِ ربوبیت قائم کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے ملت کا ہر فرد "ایتائے زکوٰۃ" کے فریضہ کی ادائیگی میں شریک ہو جائے گا۔ (یہ نظامِ ربوبیت کس طرح سے قائم کیا جائے گا، یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور مسئلہ پیشِ نظر کی حدود سے باہر۔ اس لئے میں سردست اپنے آپ کو زکوٰۃ تک ہی محدود رکھتا ہوں۔ اگر حکومت نے اس کی ضرورت سمجھی، تو اس نظام کی قرآنی تفاصیل بھی پیش کی جا سکیں گی۔ قرآن نے زکوٰۃ کی اہمیت پر اس قدر زور دیا ہے لیکن اس کی تفاصیل کو کہیں متعین نہیں کیا، در حقیقت یہ ہے کہ اس اصولی نظام کی روشنی میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ان تفاصیل کے متعین کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، اس لئے کہ زکوٰۃ کا اصول غیر متبدل ہے لیکن اس کی جزئیات ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہیں گی۔ لہٰذا آج جو اسلامی حکومت نظامِ ربوبیت کو قائم کرنا چاہے، وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی مدآتِ آمدنی کی جزئیات خود متعین کرے گی اور اس طرح حاصل کردہ آمدنی کو ملت کی نشوونما (زکوٰۃ) پر صرف کرے گی۔ یہ جزئیات حکومت کی طرف سے عائد کردہ ہر ٹیکس کی شرحِ نصاب، طریقِ وصولی نیز اس آمدنی کے مناسب محلّاتِ اخراجات وغیرہ سب کو محیط ہوں گی۔ ہم ان جزئیات کی تدوین میں اُن جزئیات سے بطورِ نظائر مدد لیں گے جو اس سے پہلے کسی اسلامی حکومت نے اپنے دور کے لئے متعین کی تھیں۔ اسی طرح ہماری متعین کردہ جزئیات ہماری شریعت بن جائیں گی بشرطیکہ ان کی اساس قرآن کے غیر متبدل اصولوں پر ہو لیکن اگر یہی آمدنی قرآنی منشاء کے خلاف وصول کی جائے یا اسے نظامِ ربوبیت کے خلاف مقاصد میں صرف کیا جائے تو یہ سب کچھ غیر شرعی ہو جائے گا۔

(بقیہ صفحہ ۴۷ سے آگے) ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے اموال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف کر سکیں (۸۷/۱۱) دیکھئے نظامِ صلوٰۃ کس طرح معاشی نظام کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

صدقات

قرآن نے زکوٰۃ کے علاوہ ایک اصطلاح صدقات کی بھی استعمال ہے اور اس کے لئے اس نے خرچ کی مدّات کا بھی ذکر کیا ہے جو حسبِ ذیل ہیں:۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ (۹/۶۰)

صدقات کا مصرف یہ ہے کہ وہ فقرا و مساکین کو دیئے جائیں اور ان لوگوں کو جو تحصیل صدقات میں کام کریں اور جن کے قلوب کی تالیف مقصود ہو۔ نیز قیدیوں (یا غلاموں) کے رہا کرانے میں اور تاوان زدہ (یا مقروض) لوگوں کا تاوان (یا قرض) ادا کرنے میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لئے

میں اس وقت مختلف مدّات کی تشریح میں نہیں جانا چاہتا لیکن یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ جن جن ضروریات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ ایسی ہیں جو ہنگامی حوادث یا اتفاقی حالات کے ماتحت پیدا ہوتی ہیں اور اسلامی سوسائٹی (جس کا فریضہ ہی ربوبیتِ عامہ ہے) کی مستقل ضروریات قرار نہیں پاسکتیں۔ مثلاً جیسے اس وقت پاکستان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ درپیش ہے یا کسی علاقے میں سیلاب زدگان کی امداد کا سوال سامنے آجاتا ہے وغیرہ، ایسی ہنگامی اور غیر متوقع (UNFORESEEN) ضروریات کے لئے حکومت کے مستقل بجٹ میں گنجائش (PROVISION) نہیں ہوا کرتی، اس قسم کی ہنگامی ضروریات ہنگامی ٹیکس کے ذریعہ پوری کی جایا کرتی ہیں یا لوگوں کے عطیات سے۔ ہمارے ہاں صدقہ کسی بڑی مصیبت کے ٹالنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ عربوں میں عطیات کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ قرآن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات میں عطیات بھی شامل ہیں، اس لئے کہ اس نے صدقات کو علانیہ طور پر دینے کا بھی ذکر کیا ہے اور چھپکے سے بھی (۲/۲۷۱) نیز یہ بھی کہا ہے کہ اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور جن کی مدد کی گئی ہے ان کی دل آزاری کر کے تعمیر کی جگہ تخریب (باطل) کا ذریعہ نہ بناؤ (۲/۲۶۴) یہ صدقات خواہ ٹیکس کی شکل میں ہوں خواہ عطیات کی صورت میں ان کا وصول کرنا اور خرچ کرنا اجتماعی کام ہے جس کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ صدقات کے وصول کرنے کا واضح حکم قرآن میں موجود ہے۔ (۹/۱۰۳) اور حکومت ہی کو اس کے صرف کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے (۹/۶۰-۵۸)۔ اس قسم کے ہنگامی ٹیکس کی شرح کیا ہونی چاہیئے؟ یا عطیات کی حدود کیا ہونی چاہئیں؟ قرآن اس کا ذکر نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی کوئی حدبندی کی جاسکتی ہے۔ مصارف کی فہرست میں البتہ قرآن

فی سبیل اللہ کا مفہوم

نے چند مدّات کو گنا دیا ہے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور باقیوں کے متعلق "فی سبیل اللہ" سے اصولی اشارہ کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن ملت

کے اجتماعی امور کے متعلق "فی سبیل اللہ" کی جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا مصارفِ صدقات میں مختلف مدات کے ساتھ "فی سبیل اللہ" کے اضافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جن مدات کا ذکر کیا گیا ہے ان جیسی اور مدات جو ملت کی اس قسم کی ہنگامی ضروریات کے لئے ناگزیر ہو جائیں ان میں شامل ہیں۔ اس مقام پر قرآنی تعلیم سے متعلق ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اسے شرح و بسط سے بیان کیا جاتا لیکن یہ مقام صراحت و وضاحت کا نہیں۔ اس لئے یہاں اس کا ذکر صرف اشارۃً کیا جا سکے گا۔ قرآنی احکام کا اسلوب یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ارتقائی مدارج کے ساتھ توافق و تطابق رکھتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً جب رسول اللہ نے دعوتِ اسلام کی ابتدا کی ہے تو اس وقت اسلامی حکومت وجود میں نہیں آئی تھی۔ اس لئے اس زمانے کے احکام اس انداز کے ساتھ تھے جو کسی ایسی سوسائٹی (معاشرہ) میں نافذ العمل ہو سکیں جس میں ہنوز اپنی حکومت قائم نہ ہو سکی ہو۔ حضورؐ کی دعوت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی اس مقام تک پہنچ گئی۔ جہاں ملتِ اسلامیہ نے اپنا نظامِ حکومت خود قائم کر لیا۔ یہ نظام ایک سوسائٹی کے معاشرتی ارتقاء کی آخری کڑی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس مقام پر ضروری احکام دینے کے بعد دین کی تکمیل ہو گئی۔ قرآن ان تمام

تدریجی ارتقاء

احکام کا مجموعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں (مثلاً) صدقات کے متعلق انفرادی احکام بھی ملتے ہیں اور حکومتی نظام کے اندر کے احکام بھی، حتیٰ کہ ایسے احکام بھی جن میں حکومت کو کسی قسم کے ٹیکسوں یا عطیوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ جن لوگوں کی نگاہ سے قرآنی احکام کا یہ اسلوب اوجھل ہو گیا، وہ مختلف احکام کے "تضاد" سے گھبرا اٹھے اور اس مشکل کے حل کے لئے "نسخِ آیات" کا عقیدہ قائم کر لیا، یعنی انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو احکام بعد کے ارتقائی مدارج سے متعلق نازل ہوئے تھے، انھوں نے ابتدائی مراحل سے متعلق نازل شدہ احکام کو منسوخ کر دیا ہے۔ اگر ان کے سامنے قرآنی احکام کا وہ اسلوب ہوتا جو اوپر بیان کیا گیا ہے تو انہیں کوئی ایسی مشکل پیش نہ آتی جس کے لئے ناسخ و منسوخ کا غیر قرآنی عقیدہ وضع کرنا پڑا۔ قرآن کی اکملیت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کی ہر ارتقائی حالت سے متعلق مناسب احکام اپنے اندر رکھتا ہے جو معاشرہ (سوسائٹی) جس وقت اپنے آپ کو قرآنی نظام کے تابع لانا چاہے قرآن میں اس وقت کے ارتقائی مقام کے مناسب احکام مل جائیں گے۔ مثلاً ہم تقسیم ہند سے پہلے اپنے معاشرتی ارتقاء میں جس مقام پر تھے قرآن ہمیں اس سے آگے بڑھنے کے اصول دیتا تھا۔ تقسیم کے بعد ہم جس حالت میں ہیں اس کے لئے بھی اس کے پاس ہدایت موجود ہے اور اس کے بعد اگر ہم نے اپنی زندگی کو قرآنی نظام کے تابع لانے کا فیصلہ کر لیا تو اس کے لئے بھی قرآن میں ضروری اصول اور احکام مل جائیں گے۔ اس لحاظ سے قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور جس مقام سے کوئی سوسائٹی اپنے آپ کو قرآن کے تابع لائے

قرآن اسے اس مقام سے آگے جانے کے لئے واضح روشنی عطا کر دیتا ہے اور کوئی مقام ایسا نہیں آتا جہاں پہنچ کر وہ کہہ دے کہ میں مزید ہدایت دینے سے قاصر ہوں۔

زکوٰۃ و صدقات سے متعلق تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کی رُو سے:۔

ماحصل

۱۔ زکوٰۃ ان بنیادی مقاصد میں سے ہے جن کے لئے اسلامی حکومت کا قیام وجود میں آتا ہے۔

۲۔ ایتائے زکوٰۃ سے مقصود ہے ایسا نظام قائم کرنا جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء کا پورا پورا سامان موجود ہو۔

۳۔ قرآنی حکومت کے تمام ذرائع آمدنی زکوٰۃ ہی کی مدّات ہوں گی۔

۴۔ قرآن نے ان مدّات کی تفاصیل متعین نہیں کیں۔ ہر حکومت اپنی ضروریات کے مطابق انہیں خود متعین کرے گی۔

۵۔ بعض ہنگامی اور غیر متوقع ضروریات کے لئے جو کچھ وقتی طور پر وصول کیا جائے گا اسے قرآن کی اصطلاح میں صدقات کہا جائے گا۔

۶۔ صدقات ہنگامی ٹیکس یا عطیات پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔

۷۔ صدقات کی شرح کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں البتہ ان کی مدّاتِ خرچ کی ایک فہرست قرآن نے دی ہے جس میں فی سبیل اللہ کی تشریح کے مطابق اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ صدقات کی تحصیل اور صرف کا انتظام بھی حکومت ہی کے ذمّہ ہو گا اور اس کے لئے جو عملہ متعین کیا جائے گا اس کے اخراجات اس مد سے لئے جائیں گے۔

یہ ہے میرے فہمِ قرآن کے مطابق مختصر الفاظ میں زکوٰۃ اور صدقات سے متعلق قرآن کی تعلیم کا ماحصل ہمارے مروّجہ الجھاؤ کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زکوٰۃ و صدقات کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے اور صدقات سے متعلق احکام و تفاصیل کو زکوٰۃ کے احکام قرار دے لیا ہے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن نے نہائت وضاحت سے ان دو الفاظ کو الگ الگ استعمال کیا ہے۔ اگر صدقات سے مراد زکوٰۃ ہی ہوتی، تو وہ صدقات کی جگہ زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال کرتا لیکن قرآن میں غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک زکوٰۃ کا تصوّر صدقات سے الگ ہے۔ اسلامی معاشرہ کے ابتدائی مدارج میں "صدقات" کا عمومی مفہوم "خیرات" ہی تھا

لیکن بعد میں جب نظامِ حکومت قائم ہو گیا تو صدقات سے مراد وہ عطیات وغیرہ ہو گئے جو اسلامی حکومت بعض ہنگامی ضروریات کے لئے طلب کرتی ہے لیکن یہ ہنگامی عطیات ہوں یا دیگر مداتِ آمدنی، ان سب کا سرچشمہ ان کے ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ ہم نے وہ نظامِ ربوبیت قائم کرنا ہے جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ جب یہ نظام قائم ہو جائے تو پھر عطیات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وقت زائد از ضرورت سب کچھ مملکت کی تحویل میں ہوتا ہے جس سے وہ ایتائے زکوٰۃ (نوعِ انسان کو نشو و نما دینے) کا فریضہ ادا کرتی ہے۔
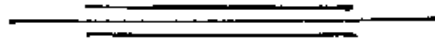
لارڈ سر برٹرنڈ رسل سے ملاقات

دسمبر ۱۹۵۰ء

برطانیہ کے مشہور مفکر لارڈ سر برٹرنڈ رسل، پچھلے دنوں آسٹریلیا گئے ہوئے تھے۔ پہلے اطلاع ملی کہ وہ واپسی پر کراچی ٹھہریں گے لیکن بعد میں معلوم ہوا وہ کراچی کے راستے سیدھے وطن واپس چلے جائیں گے۔ ۲۵۔ اگست قریب ۹ بجے شب ان کا جہاز کراچی پہنچا اور وہ علی الصبح آگے روانہ ہو گئے۔ انھیں دیکھنے (اور اگر موقع ملے تو ان سے کچھ باتیں کرنے) کے شوق میں، میں بھی کراچی کے ہوائی مستقر پر پہنچ گیا۔ مستقر پر مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ وہاں ہمارے اکابرینِ ملت میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ (حکومت کی طرف سے صرف دو جونیئر افسر تھے جو رسمی استقبال کے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے وہاں گئے تھے) اور اس سے کہیں زیادہ افسوس اس سے کہ کراچی کے علمی طبقہ میں سے بھی وہاں کوئی نہیں پہنچا تھا۔ لارڈ رسل کا شمار عصرِ حاضر کے ممتاز ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کے نتائجِ فکر سے اتفاق یا اختلاف ایک جداگانہ چیز ہے لیکن اربابِ فکر و نظر کی قدر افزائی خود اپنے حسنِ ذوق اور خلشِ تجسس کا مظاہرہ ہوتا ہے اور سوچنے والے ذہن انہی باتوں سے اندازہ لگا لیتے ہیں کہ کسی قوم کی ذہنی سطح کی بلندی کیا ہے۔ اے کاش! ہمیں احساس ہوتا کہ قوموں کی تعمیر میں علم اور فکر کا کتنا بڑا حصّہ ہے۔

ہوائی جہاز کا اتنا لمبا سفر تنومند جوانوں کے بھی سر میں چکر اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دیتا ہے لیکن یہ ۷۸ سال کا بوڑھا مفکر، جب جہاز سے اُترا ہے تو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے وہ اپنے ڈرائنگ روم سے مکان کے صحن میں آ گیا ہو۔ شگفتہ، بشاش، اور یکسر حاضر دماغ، وہ کڑی کمان کے تیر جیسی چال کے ساتھ مستقر کی عمارت میں اپنی قیام گاہ کی طرف آ گیا۔ کمرے میں چند نوجوان (بلکہ بعض جوانی سے بھی کم عمر کے) اخباری رپورٹروں نے ان سے سیاستِ حاضرہ

کے متعلق عام اخباری سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ جس میں کافی وقت صرف ہوگیا۔ ریڈیو پاکستان کی موقع شناسی البتہ قابلِ داد تھی کہ انھوں نے اس مختصر سے وقت میں چند سوالات اور ان کے جوابات ریکارڈ کر لئے جسے بعد میں کراچی سٹیشن سے نشر کیا گیا۔

چونکہ ایک تو وقت بہت مختصر تھا اور دوسرے اس تقریب میں کوئی نظم و ترتیب نہ تھی، اس لئے میرے ذوق کی کماحقہ تسکین نہ ہوسکی۔ بایں ہمہ میں نے اٹھتے بیٹھتے چلتے، لپکتے کچھ سوالات پوچھ ہی لئے جن میں سے بعض ریڈیو پاکستان کے متذکرہ صدر ریکارڈ میں آ گئے ہیں۔ چونکہ اس قابلِ یاد ہنگامی ملاقات سے تنہا لطف اندوز ہونا بخل سا معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں ذیل میں اپنے بکھرے ہوئے سوالات اور ان کے جوابات کو ایک ترتیب دے کر پیش کرتا ہوں تاکہ قارئینِ طلوعِ اسلام بھی ان کی افادیت میں شریک ہوسکیں۔

سوال: کیا انسان کے لئے ممکن ہے کہ وہ تنہا عقل کی مدد سے خیر اور شر (GOOD AND EVIL) کے مسئلہ کو حل کر سکے۔

جواب: خیر اور شر کے مسئلہ کا تعلق عقل (INTELECT) سے نہیں جذبات (FEELINGS) سے ہے۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ عقل اس کا حل پیش کر سکے گی یا نہیں۔

سوال: لیکن جذبات تو ہر شخص کے انفرادی (INDIVIDUAL) ہوتے ہیں اس لئے خیر و شر کا تصور بھی انفرادی ہو جائے گا۔ کیا آپ کے نزدیک خیرِ محض ABSOLUTE GOOD کوئی شے نہیں۔

جواب: خیرِ محض کوئی شے نہیں۔

سوال: اس سے یہ مترشح ہوا کہ اخلاقی شعور (MORAL CONSCIOUSNESS) بھی کوئی مطلق چیز نہیں اور اخلاقیات ETHICS سب اضافی RELATIVE ہیں۔

جواب: اخلاقی شعور کوئی چیز نہیں۔ جو کچھ ہم بچے کو اس کی چھ برس کی عمر میں سکھا دیتے ہیں وہی اس کا اخلاق (MORALITY) ہوتا ہے۔ اخلاق سوسائٹی کی پیداوار ہیں اور ان کا معیار انسانی عقل۔

سوال: تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کے نزدیک انسانی عقل کے علاوہ علم (KNOWLEDGE) کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔

جواب: میں کسی اور ذریعۂ علم سے واقف نہیں۔

سوال: کیا آپ کے نزدیک انسانی زندگی اور شعور (LIFE AND CONSCIOUSNESS) کی بنیاد (BASIS)

بھی دنیائے محسوسات (THE WORLD OF CONCRETE) ہے یا اس سے ماورئی؟

جواب:۔ میں نہیں سمجھا کہ (CONCRETE) سے آپ کا کیا مفہوم ہے۔ اب تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی شے (CONCRETE) ہے ہی نہیں۔ صرف مدرکات (IDEAS) کا وجود ہے۔

سوال:۔ دنیائے محسوسات سے میری مراد مادے کی وہ دنیا ہے جس کا علم حواس PERCEPTIONS کے ذریعہ ہوتا ہے۔

جواب:۔ تو پھر انسانی زندگی کی بنیاد اس سے ماورئی کچھ نہیں۔

سوال:۔ ہمارے مفکر علامہ اقبالؒ کے نزدیک انسانی انا (HUMAN EGO) صاحبِ اختیار بھی ہے اور فنا نہ آشنا بھی (FREE AND IMMORTAL) کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

جواب:۔ میں انسانی ایغو کو صاحبِ اختیار تو مانتا ہوں لیکن (IMMORTAL) نہیں مانتا۔

سوال:۔ کیا آپ کے ملاحظہ سے علامہ اقبالؒ کے "خطبات" (یا ان کی اسرارِ خودی جس کا ترجمہ نکلسن نے کیا ہے) گزرے ہیں؟

جواب:۔ نہیں میں نے انہیں نہیں دیکھا۔

سوال:۔ تو پھر آپ غالباً اقبالؒ کے فلسفہ سے بھی آشنا نہیں ہوں گے۔

جواب:۔ میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔

سوال:۔ میں درخواست کروں گا کہ آپ ان کے فلسفہ کا مطالعہ فرمایئے کیونکہ اقبال نے اپنی فکر کا سرچشمہ قرآن کو قرار دیا ہے اور دنیا کی آبادی کا قریب پانچواں حصہ اس کتاب پر اپنی زندگی کی بنیادیں رکھنے کا مدعی ہے۔

آخری دو تین باتیں کچھ افراتفری میں ہوئیں لیکن میں نے لارڈ رسل کو ایک رپورٹر کے سوال کے جواب میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ ٹیگور سے واقف ہیں اور گیتانجلی ان کی نظر سے گزری ہے۔ ایک اور رپورٹر کے اس سوال کے جواب میں کہ دنیا میں امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے، انھوں نے کہا کہ ساری دنیا میں ایک حکومت کے قیام سے۔ میں نے اس پر پوچھا کہ اس ایک حکومت کی بنیاد (BASIS) کیا ہوگی۔ کہا کہ ورلڈ فیڈریشن (اقوامِ عالم کے باہمی وفاق) کے انداز کی حکومت۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی حکومت میں قوموں کا الگ الگ وجود باقی رہے گا اور انسانوں کی یہی غیر فطری تقسیم، اقوام کے باہمی تصادم (CONFLICT) کا باعث ہے اس لئے جب یہ علّتِ تصادم موجود رہے گی تو امن کی توقع بعید سی بات نظر آتی ہے لیکن اگر اسے فرض بھی کر

لیا جائے کہ اس طرح امن قائم ہوجائے گا تو قیام امن تو محض ایک سلبی خصوصیت (NEGATIVE VIRTUE) ہے۔ ایجابی خوبی (POSITIVE ACHIEVEMENT) تو انسانیت کی نشوو ارتقاء (DEVELOPMENT OF HUMANITY) ہے۔ یہ کس طرح سے ہو سکے گا۔

انہوں نے کہا کہ انسانوں کی ترقی، مختلف اقوام اپنے اپنے ہاں خود کریں گی۔

(افسوس کہ اس کے بعد سلسلۂ کلام ختم ہوگیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔)

اگر وقت زیادہ ہوتا یا اتنے وقت میں فضا میں سکون اور محفل میں کوئی ترتیب ہوتی تو جتنی گفتگو لارڈ رسل سے ہو چکی تھی اس سے آگے وہ ایک اہم نتیجہ تک پہنچ سکتی تھی۔ لارڈ رسل کمیونزم کے مخالف ہیں اور انھوں نے اس مجلس میں بھی اس بات کو دہرایا تھا کہ انہوں نے سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ کہہ دیا تھا کہ کمیونزم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ جس تحریک کی بنیادیں مارکسزم جیسے غلط فلسفہ پر ہوں اس کی تو تعمیر میں تخریب مضمر ہوتی ہے۔ لارڈ موصوف سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ مارکسزم کا وہ فلسفہ کیا ہے جو ان کے نزدیک تعمیر کی بجائے تخریب کا موجب ہے۔ ظاہر ہے کہ مارکسزم مادی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کا نام ہے اور اس کے بنیادی عناصر وہی ہیں جو مذکورۂ صدر سوالات کے جوابات میں لارڈ رسل نے اپنے فکری عقائد کے طور پر بیان کئے، یعنی زندگی، اور شعور خالص مادہ کی پیداوار ہیں۔ حواس (SENSES) کے علاوہ انسان کے پاس کوئی ذریعۂ علم نہیں۔ اخلاقی شعور اپنی مستقل حیثیت نہیں رکھتا اور اخلاق کے معیار سوسائٹی کے رجحانات کے سوا کچھ نہیں۔ دنیا میں خیرِ محض کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب چیزیں اضافی ہیں اور ان کا تعلق ہر فرد کے اپنے جذبات سے ہے۔ انسانی الغو اپنی مستقل حیثیت نہیں رکھتا اور طبعی موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ وقس علیٰ ھذا۔

پوچھنے کی بات یہ تھی کہ جب ان بنیادوں پر اٹھی ہوئی عمارت روس میں تباہی اور بربادی کا باعث بن چکی ہے تو مغربی تہذیب جو یکسر انہی بنیادوں پر قائم ہے، کس طرح انسانیت کے لئے موجبِ فوز و فلاح اور باعثِ نجات و سعادت ہو سکتی ہے۔ اگر لارڈ رسل نے مارکسی فلسفہ کے متعلق آج سے تیس سال قبل یہ رائے قائم کی تھی تو خود اپنے فلسفہ کے متعلق انھوں نے یہ رائے کیوں نہ قائم کی؟ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مفکر ہو یا مدبر، جب تک اس کے سامنے زندگی کی مستقل اقدار نہ ہوں اس کی فکر اور تدبر ذاتی رجحانات اور قومی مصالح سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے۔ برٹرنڈ رسل کتنا بڑا مفکر ہے اور منطق (LOGIC) اس کے طریقِ تحقیق کی اہم خصوصیت، لیکن اس کی منطق اتنی سی بات بھی اس پر واضح نہیں کر سکی کہ جس صغریٰ اور کبریٰ کا نتیجہ روس میں ناکامی کی شکل اختیار کرتا ہے، وہی صغریٰ اور کبریٰ برطانیہ میں فوز و فلاح کا موجب

کیسے بن سکتا ہے ؟ اس سے آگے بڑھیئے تو لارڈ رسل دنیا میں قیام امن کے لئے واحد حکومت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن انگریز کا جذبۂ وطنیت انھیں غیر شعوری طور پر اس امر پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ قوموں کے وجود کو باقی رکھیں اور فیڈریشن کے ذریعہ واحد حکومت قائم کرنے کا تصور پیش کریں۔ اگر ان کے تحت الشعور میں جذبۂ وطنیت اس طرح سایۂ فگن نہ ہوتا تو ان کی فکر انہیں یقیناً اس نتیجہ پر پہنچا دیتی کہ واحد حکومت کا قیام وحدتِ انسانی (UNITY OF MANKIND) کے سوا ناممکن ہے اور وحدتِ انسانی وحدتِ حیات کا دوسرا نام ہے اور وحدتِ حیات کی بنیاد آفرینندۂ حیات کی توحید پر متفرع[1] ہے۔ لیکن یہ تصور قرآن سے باہر اور کہیں نہیں مل سکتا اور لارڈ رسل تک قرآن کو پہنچائے کون ؟ مغربی فکر آج روشنی کی تلاش میں بری طرح سے سرگشتہ و حیراں پھر رہی ہے لیکن عالمِ اسلام میں ایک شخصیت بھی ایسی نہیں، جو ان کی سطح پر پہنچ کر انہیں قرآن سے متعارف کرائے۔ اقبالؒ یہ کر سکتا تھا لیکن وہ بہت پہلے دنیا چھوڑ گیا۔ اب اس کا پیغام یہی کام کر سکتا ہے لیکن وہ خود مسلمانوں کے لئے بھی کتابِ مختوم بن چکا ہے۔ وہی تھا جو ایمان و ایقان کی پوری قوتوں کے ساتھ یہ کہہ سکتا تھا کہ

از من اے بادِ صبا گوئے بہ دانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بہ جگر می زند آں رام کند — عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگردار تر است

اور یہ کہ

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے — ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمین دگر است
اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست — نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

اور پھر علاج یہ کہ

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم — پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

---

[1] واحد حکومت خدا کے دیئے ہوئے غیر متبدل اصولوں کی بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے جو صرف قرآن کے اندر مل سکتے ہیں۔

نجات

اکتوبر ۱۹۵۱ء

دنیائے مذاہب میں انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا منتہیٰ کیا ہے؟ انسان اپنے آپ پر اس قدر جانگسل پابندیاں کیوں عائد کرتا ہے؟ یہ اس قدر کمر شکن مشقتیں کیوں اٹھاتا ہے؟ یہ بھوک اور پیاس کی جگر سوز سختیاں، یہ مال اور جان کی ہوش رُبا قربانیاں، یہ سفر اور حضر کے جانگداز مراحل، یہ گریۂ نیم شبی اور آہِ سحری کے صبر آزما منازل، یہ تمام جدّوجہد، یہ ساری سعی و کاوش، بالآخر کس غرض و غایت کے لئے ہے؟ آپ کسی مذہب پرست انسان سے پوچھئے ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ملے گا، یعنی اس تمام تگ و تاز کا مقصود، اس کد و کاوش کا منتہیٰ

مقصودِ سعی و کاوش

یہ ہے کہ کسی طرح نجات حاصل ہو جائے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی یہودی، پارسی، ہر ایک کی مذہبی سعی و کاوش کا مطمحِ نگاہ ایک لفظ نجات کے اندر مضمر ہے۔ اسی کے لئے دعائیں ہیں، اسی کے لئے التجائیں۔ یہی تمام آرزوؤں کا مرکز ہے، یہی سب تمناؤں کا محور۔ آہِ سحرگاہی ہے تو اسی کے لئے اور نالۂ شب گیر ہے تو اسی کی خاطر۔ چمکتی ہوئی پیشانیوں کی سجدہ ریزیاں اور لرزتے ہوئے قلوب کی نرم خیزیاں، دمکتی ہوئی آنکھوں کی شبنم فشانیاں اور لڑکھڑاتی ہوئی زبانوں کی تسبیح خوانیاں، سب اسی ایک مقصد کے حصول کے ذرائع اور اسی ایک منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ برہمن کے ناقوس میں، مُلا کی اذان میں، گرجہ کی بانگِ جرس میں، صومعہ کی پکار میں، ہر جگہ اور ہر مقام پر اسی محملِ لیلےٰ کی تلاش اور اسی ناقۂ سلمیٰ کے سراغ کی تپش و خلش پنہاں ہے۔ نجات حاصل ہو گئی تو سب کچھ مل گیا اور سب کچھ ملنے پر بھی نجات کی طرف سے ناامیدی رہی تو کچھ بھی نہ ملا۔

نجات کا مفہوم

لیکن سوال یہ ہے کہ نجات سے مقصود کیا ہے؟ اس لفظ کو تو ہم ہزار بار سنتے ہیں لیکن بالآخر اس کا مفہوم کیا ہے؟

ہندو دھرم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ جنم میں کسی سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہے۔ اس کا نام آواگون (یا تناسخ) ہے۔ جب تک اس سے گناہ سرزد ہوتے رہیں گے یہ چکر قائم رہے گا۔ انسانوں کی تگ و دو کا ماحصل یہ ہے کہ کسی طرح اس آواگونی چکر سے مخلصی حاصل کر لے۔ اسی کا نام ان کے نزدیک نجات (مکتی) ہے۔ یہ رہا ان کا دھرم (یا شریعت) ان کے لوگ (طریقت یا تصوف) میں عقیدہ یہ ہے کہ انسان کی آتما (روح) درحقیقت پرماتما (روحِ مطلق، خدا) کا ایک حصہ ہے جو اپنے کُل سے الگ ہو کر پراکرتی (مادہ) کی کیچڑ میں آ پھنسی ہے۔ آتما کا اپنے آپ کو اس مادی دلدل سے نکال کر پھر سے اپنی اصل کے ساتھ جا ملنا مقصودِ حیات ہے۔ جب آتما اس طرح اپنے آپ کو مادی زنجیروں سے چھڑا لیتی ہے تو اس کا نام مکتی یا نجات ہوتا ہے۔

بدھ مذہب کے نزدیک بھی نجات کا یہی تصور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسانی روح اس دنیا کے جیل خانے میں پھنس چکی ہے، جس میں ہر طرف کشش و جاذبیت کے پھندے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کی ہر آرزو ایک تکلیف کا پیش خیمہ ہے۔ جوں جوں آرزوئیں بڑھتی جائیں گی، تکالیف میں زیادتی ہوتی جائے گی۔ اس لئے تکلیف کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آرزوؤں کو ترک کر دیا جائے۔ جب آرزوئیں کلیتہً فنا ہو جائیں گی تو انسان کی روح تکالیف کے بندھن سے آزاد ہو کر نرواِن حاصل کر لے گی جہاں کامل سکوت و سکون ہوگا۔ اسی کا نام نجات ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اوّلین ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو ساتھ لئے پیدا ہوتا ہے اور ان کی پاداش میں دنیا کی تکالیف بھگتتا ہے۔ کوئی انسان اپنے اعمال کی بدولت اس عذاب سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے دی تاکہ وہ نوعِ انسانی کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ لہٰذا انسانوں کے لئے اس "ازلی" مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔ یہ عقیدہ انسان کو اس کے پیدائشی گناہ سے نجات دلا کر جنّت میں داخل کر دے گا۔ اسی کا نام ان کے ہاں نجات (SALVATION) ہے۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ قوم اپنے مورثینِ اعلیٰ کے بعض جرائم کی پاداش میں چند دن جہنّم میں رہے گی۔ اس کے بعد جہنّم کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اس کا نام نجات ہے۔

مجوسیوں (پارسیوں) کے نزدیک انسان اس دنیا میں اہرمن و یزداں (نور و ظلمت، خیر و شر) کی کشمکش میں گرفتار

ہے۔ اسی کشاکش سے رستگاری کا نام نجات ہے۔

مصیبت سے چھٹکارا

نجات، مُکتی یا (SALVATION) کا قریب قریب ہی تخیل چھوٹے چھوٹے مذاہب میں بھی ہے۔ اس تخیل کی جزئیات میں اختلاف ہو تو ہو لیکن ان سب میں اصولی طور پر ایک ہی قدر مشترک ہے، یعنی عقیدۂ نجات کے لئے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام نجات ہے۔ لفظ نجات کا مفہوم ہی چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ اسی تصوّر کا نتیجہ ہے کہ انسان کے جسم کو اس کی روح کا قفس '' اور دنیا کو انسان کے لئے جیل خانہ قرار دیا جاتا ہے۔ ہر شخص اس جیل خانے میں چکّی پیس رہا ہے اور اپنی اپنی میعادِ قید کے مطابق چکّی پیس کر چھٹکارا حاصل کر سکے گا ۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ․:․ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

یہ تو رہا عام مذاہبِ عالم کا حال لیکن خود مسلمانوں کی کیا حالت ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں

(i) نہ تو آواگون (تناسخ) کا عقیدہ ہے۔

(ii) نہ ہر بچّے کے پیدائشی گنہگار ہونے کا عقیدہ۔

(iii) نہ مورثِ اعلیٰ کے جرائم کی پاداش کا تصوّر اور

(iv) نہ ہی اہرمن و یزداں کی کشمکش کا عقیدہ

لیکن اس کے باوجود زندگی کا مقصود ان کے ہاں بھی نجات ہی ہے۔ جسے دیکھئے نجات کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ مذہبی اوامر کی پابندی اور نواہی سے احتراز، یہ تمام تقشّف و تورّع! یہ سب "تقویٰ" و پرہیزگاری، یہ تمام گریہ زاری، سب عبادات و مناسک، نجات حاصل کرنے کے لئے ہیں۔

لیکن نجات کس سے؟ عذابِ جہنّم سے!

ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمالِ بد کی سزا بھگتنے کے لئے جہنّم میں ڈالا جائے گا اور اس کی سزا کی میعاد پوری کرنے کے بعد جنّت میں بھیج دیا جائے گا۔ عذابِ جہنّم سے اس چھٹکارے کا نام نجات ہے۔ اس نظریہ کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے بڑی بڑی فلسفیانہ توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ جہنّم درحقیقت ایک سینی ٹوریم ہے، جس میں مریضوں کو بھیجا جائے گا تاکہ وہ صحت حاصل کر لیں۔ جب وہ تندرست و توانا ہو جائیں گے تو انہیں جنّت کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔ کہیں اسے دھوبی کی بھٹی سے تشبیہ دی جاتی ہے، جس پر داغدار کپڑوں کو چڑھایا جاتا ہے تاکہ ان کی میل کچیل دُور ہو جائے۔ جب وہ صاف ہو جاتے ہیں، تو انھیں جنّت میں بھیج دیا جاتا

ہے۔ ان تشبیہات کے بعد سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہم نے ایسے مسلّم الثبوت حقائق پیش کر دیئے ہیں جن کے پیشِ نظر دنیا کا ہر انسان قرآنی تعلیم کے ارفع و اعلیٰ ہونے پر فوراً ایمان لے آئے گا لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ یہ سارا تصور دوسرے مذاہب سے مستعار لیا گیا ہے۔ قرآن سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔

پہلی حالت پر آجانا

پہلے یہ دیکھئے کہ اس تصور کی رو سے آخر الامر ثابت کیا ہوتا ہے؟ آپ صبح دس بجے تندرست و توانا ہیں۔ اس کے بعد آپ کا درجۂ حرارت اعتدال سے بڑھ جاتا ہے۔ اسے بیماری (بخار) کی حالت کہتے ہیں۔ آپ اس کا علاج کرتے ہیں۔ شام کو بخار اُتر جاتا ہے اور آپ کا درجۂ حرارت پھر اعتدال پر آجاتا ہے، یعنی آپ شام کے وقت پھر اسی حالت کی طرف لوٹ آئے جو صبح کے وقت تھی۔

یا آپ کا وزن دو من ہے اور آپ کی طاقت ایک خاص اندازے کی ہے۔ آپ دو ماہ تک بیمار رہے، اس لئے آپ کا وزن ڈیڑھ من رہ گیا۔ آپ کسی سینی ٹوریم میں چلے گئے۔ وہاں علاج، خوراک، فضا کی مساعدت سے آپ کا وزن پھر سے دو من ہو گیا اور طاقت بھی اپنی حالت پر آگئی، یعنی آپ جیسے بیمار ہونے سے پہلے تھے، پھر ویسے ہی ہو گئے۔

آپ کا کپڑا سفید اور صاف تھا۔ استعمال سے میلا ہو گیا۔ دھوبی نے اسے بھٹی چڑھایا۔ میل کٹ گئی۔ داغ چھٹ گئے یعنی کپڑا پھر اپنی پہلی حالت پر آگیا۔

ان مثالوں کے بعد مسلمانوں کے عقیدۂ نجات کو دیکھئے۔ انسان دنیا میں آنے سے پہلے ایک حالت میں تھا۔ دنیا میں آکر اس نے کچھ بُرے کام کئے۔ ان بُرے کاموں کی سزا بھگتنے کے لئے اسے دوزخ میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس کی میل کچیل کٹ گئی، داغ دُھل گئے۔ یہ پھر اسی حالت پر آگیا جس میں اپنی پیدائش سے پہلے تھا۔

آپ سوچئے کہ اس تخیّل میں اور ہندوؤں کے اس تخیّل میں، جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اصولی طور پر فرق کیا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ رُوح اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ سے ملوّث ہو گئی جس کی وجہ سے اس میں کثافت آگئی۔ اب اسے مختلف جیونوں میں سے گزارا جا رہا ہے تاکہ اس کی کثافتیں دور ہو جائیں۔ جب یہ اس طرح پاک و صاف ہو جائے گی، تو پھر اسی حالت پر آجائے گی جس حالت پر پہلے تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور اور مسلمانوں کے ہاں نجات کا تصور کس طرح اصولاً ایک ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی دنیا کو جیل خانہ کہا جاتا ہے۔ اس سے نفرت دلائی جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی (یعنی دنیاداری) سے پرہیز ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ (حتیٰ کہ متقی کے معنی ہی پرہیزگار

کئے جاتے ہیں) ہر منبر سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ دنیا مردار ہے اور اس کی طرف لپکنے والا کتا۔ اگر تم دنیاوی آلائشوں میں پھنس گئے تو خدا سے دُور ہوتے جاؤ گے۔ قُربِ خداوندی کے لئے دنیا سے دور رہنا نہایت ضروری ہے۔ نجات حاصل کرنے کے لئے

مسلمانوں کا عام عقیدہ

خواہشات کا ترک کرنا لازمی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ تمام عقائد وہی ہیں جو ہندوؤں کے ہاں نجات کے ضمن میں پائے جاتے ہیں۔ حتّٰی کہ ہمارے ہاں کے تصوّف میں وحدتِ وجود کا عقیدہ تو لفظاً لفظاً وہی ہے جو ویدانت کی اصل ہے، یعنی انسانی روح، روحِ خداوندی کا جزو ہے۔ اب یہ جزو اپنے کُل سے ملنے کے لئے بیتاب ہے۔ روح کو دنیا کی خاردار جھاڑیوں سے چھڑانے کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کی ضرورت ہے۔ جب اس قسم کے زہد و توّرع سے روح کی آلائشیں صاف ہوجائیں گی، تو جزو اپنے کُل سے جا ملے گا۔ اسی لئے صوفیوں کے ہاں وفات کے بجائے وصال کہا جاتا ہے (یعنی فلاں بزرگ کا وصال ہوگیا) اور مرنے والے کو واصل بالحق کہہ کر پکارا جاتا ہے، یعنی وہ جو خدا سے مل گیا ہے۔ جزو اپنے کُل میں مدغم ہوگیا!

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

لہٰذا ہمارے ہاں شریعت اور طریقت دونوں میں نجات کا تصوّر، دوسروں کے ہاں سے مستعار لیا گیا ہے۔ اس تصوّر کو قرآن سے کچھ تعلق نہیں۔ آپ تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ اس تصوّر کی رُو سے انسان کی تخلیق، اس کی زندگی کی تمام تگ و تاز، اس تمام پروگرام کا نتیجہ، جسے قرآن نے اس شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے، یکسر بے نتیجہ بن کر رہ جاتا ہے۔ روح، جسم میں آنے سے پہلے کسی حالت میں تھی۔ اسے دنیا میں بھیج دیا گیا تاکہ وہ مادہ سے ملوّث ہوجائے۔ پھر اسے مختلف بھٹیوں میں گزارا گیا تاکہ وہ اپنی اصلی حالت پر آجائے! سوچئے کہ انسانی زندگی کی اس تمام تگ و تاز کا ماحصل کیا ہوا۔ خدا کے اس تمام لمبے چوڑے پروگرام کا نتیجہ کیا نکلا؟ بس (AS YOU WERE NEGATIVE) غور کیجئے کہ کارگہِ حیات کا اس قدر محیّر العقول سلسلہ اور یوں بے معنی؟ انسانی زندگی کے لئے ایسا پُرشکوہ پروگرام اور اس قدر بے نتیجہ؟ اور یہ سب کچھ منسوب کیا جائے اس خدائے حکیم کی طرف جو، چھت پر کھڑے ہو کر نہیں، آسمان سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ ہم نے اس کائنات کو باطل (منفیانہ انداز سے) پیدا نہیں کیا۔ اسے بالحق (مثبت نتائج کا حامل بنا کر) پیدا کیا ہے۔ ہم کھیل نہیں رہے کہ مٹی کا گھروندا بنایا اور جب کھیل ختم ہوا تو اسے پاؤں سے مسمار کردیا اور اس طرح مٹی پھر اپنی پہلی حالت میں تبدیل ہوگئی۔ نجات کا جو عقیدہ ہندوؤں نے قائم کیا تھا اس کی رُو سے خدا کا تصوّر اسی قسم کا پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ یہ تمام

کائنات "ایشور کی لیلا" ہے۔ (یعنی خدا نے یہ کائنات تھیئٹر کے کھیل کے طریق پر بنائی ہے) اسی اعتبار سے ان کے ہاں خدا کو نٹ راجن (کھلاڑیوں کا راجہ) کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن میں اللہ تعالےٰ نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ہم نے سلسلۂ کائنات کو لٰعِبِیْنَ (۴۴/۳۸) (کھیل کے طور پر) نہیں بنایا۔ لہٰذا کوئی ایسا پروگرام، جس میں سب کچھ ہو چکنے کے بعد کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو، خدائے حکیم کے شایانِ شان نہیں۔

لعبتِ خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

اس لئے نجات کا وہ تصور جس کی رُو سے یہ سمجھا جائے کہ انسان جس مصیبت میں پھنسا ہے اس سے چھوٹ جائے اور مثبت نتیجہ کچھ نہ نکلے، قرآنی تصور نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں نجات کا لفظ

اصل مقصود تک آنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ قرآن میں لفظ نجات کس انداز سے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں سطحِ مرتفع (بلند جگہ) جہاں انسان سیلاب سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس لئے اس کے بنیادی معنی محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ دنیاوی غم و آلام، دشمنوں کے مکائد و حیل، سرکش و متمرّد قوتوں کے جور و استبداد اور دیگر اسی قسم کی صعوبات و مشکلات سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کے فرعون کے مظالم سے رہائی پانے کا ذکر نجینا اور انجینا جیسے الفاظ میں ہوا ہے۔ حضرت یونسؑ کو غم و آلام سے رہائی ملنے کے لئے بھی وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ (۲۱/۸۸) کے الفاظ آئے ہیں لیکن دوسرے مقامات پر، غم و آلام اور مصائب و مشکلات سے (مخلصی حاصل کرنا نہیں بلکہ ان سے یکسر) محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی نجات کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت ہودؑ، صالحؑ، شعیب علیہم السلام کا ان کی اقوام کی فتنہ پردازیوں سے محفوظ رکھنے کا ذکر انہی الفاظ میں کیا گیا ہے۔

نَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ (۱۱/۵۸) نیز ۹۴، ۱۱/۶۶)

حضرت ابراہیمؑ کے آتشِ نمرود سے محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے (فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ (۲۹/۲۴) حضرت لوطؑ اور ان کے متبعین کو بربادیوں کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے۔ (۲۹/۳۲)۔ دیگر انبیاء کرامؑ اور جماعتِ مومنین کو مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھنے کے لئے بھی یہی لفظ آیا ہے (دیکھئے ۱۱/۱۱۶) لیکن یہ مقامات وہ ہیں جہاں اس دنیا کے نامساعد حالات سے رستگاری حاصل کرنے یا ان سے محفوظ رکھے جانے کے لئے

لفظ نجات کا استعمال ہوا ہے۔ حیاتِ اخروی میں جہنم میں ڈال کر پھر وہاں سے نکالنے کے لئے یہ لفظ کہیں نہیں آیا۔ اس سے محفوظ رکھے جانے کے لئے مومنین کو یہ دعائیں سکھائی گئیں کہ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۵) ہمیں عذابِ نار سے محفوظ رکھیو۔ یہ حفاظت اس انداز سے ہوگی کہ
(مومنین کو جہنم سے دور رکھا جائے گا) لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا (۲۱/۱۰۲) وہ اس سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ اس کی بھنک تک بھی ان کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔

لہٰذا قرآن میں، جہنم میں پڑ کر پھر وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ذکر کہیں نہیں۔ نہ ہی اس کے لئے کہیں نجات کا لفظ آیا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب یہ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کی تعلیم کیا ہے۔

نظریۂ حیات

قرآن نے حیات کے متعلق ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ حیات کی حرکت دُوری (CYCLIC) نہیں ارتقائی ہے۔ زندگی نہ پیچھے مڑتی ہے نہ بار بار اعادہ کرتی ہے۔ یہ تصور باطل ہے کہ زندگی ایک نقطہ سے چل کر اور اتنے منازل طے کرنے کے بعد پھر اسی نقطہ پر واپس آجاتی ہے۔ حیات صراطِ مستقیم پر چل رہی ہے، یعنی وہ توازن بدوش قوتوں کے سہارے آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک ہی مقام پر گردش نہیں کر رہی۔ اس نے کہا کہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں حیات اپنے ارتقائی مدارج طے کر رہی ہے جو نوع (SPECIES) اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کر لیتی ہے کہ اپنے آپ کو اصلح ثابت کر دے (یعنی اپنے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیتیں پیدا کر لے) وہ سلسلۂ ارتقاء کی منزل طے کر کے ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے جو اس قسم کی صلاحیت پیدا نہیں کرتی، وہ وہیں رُک جاتی ہے۔ لہٰذا زندگی میں رجعت و تکرار نہیں، عروج و ارتقاء ہے۔ خاک کے ذرّات اسی قانونِ ارتقاء کے مطابق مختلف منازل طے کرتے کرتے انسان کی سطح تک آگئے۔ سلسلۂ ارتقاء کی اس نئی (اور نہایت اہم) کڑی یعنی انسانیت میں ایک نئے جوہر کا اضافہ ہوا یعنی اسے شعور و ادراک اور اختیار و ارادے سے نوازا گیا۔ یہی وہ امتیاز ہے جس سے انسان موجوداتِ عالم میں اتنا بلند مقام رکھتا ہے۔ انسان کا بچہ اس جوہر کو ساتھ لے کر کارزارِ عالم میں قدم رکھتا ہے جس کی پوری وسعتیں اس کے سامنے ہیں۔ اسے راستے کے نشیب و فراز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ زندگی کے ہر دوراہے پر نشانات کے کھمبے (SIGN POSTS) نصب کر دیئے جاتے ہیں۔ منزل کا نشان بنا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اب تمہیں اپنی سعی و عمل سے اس اگلی منزل تک پہنچنا ہے جو وہاں

تک پہنچ جاتا ہے، وہ کامیاب ہے، جو نہیں پہنچتا وہ خاسر و ناکام ہے۔ غور فرمایئے قرآن نے ان کڑیوں کو کس قدر دلکش اور جامع انداز سے بیان کیا ہے۔ سورۃ الدھر میں ہے:-

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ۝ (۷۶/۱)

انسان پر یقیناً وہ زمانہ بھی گزرا ہے جب وہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی تگ و تاز سے مقصود یہ ہے کہ انسان جس پہلی حالت میں تھا پھر وہیں پہنچ جائے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) تو قرآن کی رُو سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ قابلِ ذکر انسان کے درجے سے پھر ناقابلِ ذکر شے کے درجے میں پہنچ جائے! کس قدر بے معنی ہے یہ مقصد؟ اس کے بعد فرمایا:-

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ (۷۶/۲)

ہم نے انسانی تخلیق کی ابتداء مخلوط نطفے سے کی۔ پھر اسے گردشیں دیتے ہوئے اس حالت تک لے آئے کہ سننے اور دیکھنے والا انسان بن گیا۔

مخلوط نطفے سے تخلیق 'درجۂ حیوانیت ہے لیکن انسان کو سماعت و بصارت (اور دوسرے مقام پر ہے فوأد (MIND) عطا کئے جو ذرائع علم ہیں۔ ان صلاحیتوں کے ساتھ اسے راستے کے پیچ و خم سے آگاہ کر دیا۔ انا ھدینہ السبیل (۷۶/۳) اب یہ اس کے اپنے اختیار میں ہے کہ وہ راہ اختیار کر لے جو اس کی صلاحیتوں کو ابھار کر بار آور کر دے یا وہ راہ جو انھیں دبا کر برباد کر دے۔ (إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (۷۶/۳) اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ صحیح راہ پر چلنے والوں کی منزل جنت ہے اور غلط راہ پر جانے والوں کا مقام جہنم۔ یعنی انسان جب دنیا میں آتا ہے تو وہی قانونِ ارتقاء جو اس سے پہلے کی کڑیوں میں جاری و ساری تھا اس پر منطبق ہوتا ہے۔ مغرب کے میکانکی تصورِ حیات کی رُو سے انسان اس سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے، اس لئے کہ وہ زندگی کو طبعی تبدیلیوں سے زیادہ کچھ نہیں جانتے لیکن قرآن اس مقام سے آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ علم و عقل کے یہ مدعی کس دھوکے میں پڑ گئے۔ زندگی کا ارتقائی سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ حقیقی ارتقاء تو اب شروع ہوا ہے۔ یہ منزل تو شعور و ادراک اور اختیار و ارادہ کی اوّلین منزل ہے۔ یہ تو انسانیت کا گہوارہ ہے۔ اسے ابھی اور بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں بیش پا افتادہ مضمونے ... کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

خاک کے ذرّوں کا معراجِ کمال بیشک یہی تھا کہ وہ پیکرِ انسانی میں متشکل ہو جائیں لیکن معراجِ انسانیت کے لئے تو ابھی سینکڑوں منازل اور باقی ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ... ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

انسانی ارتقاء مجلس انسان نے اس حیاتِ ارضی سے بلند و بالا، ہیولیٰ مادی سے نفیس و لطیف اور اس عناصر سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینا ہے۔

وہ اعمالِ حیات جو اس کے اندر اس بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بیدار کر دیں، اعمالِ صالحہ کہلاتے ہیں۔ یہ صلاحیت جس سے انسان اس زندگی سے اگلی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے، بہت بڑی کامیابی اور قابلِ قدر کامرانی ہے۔ اس کے لئے قرآن نے فلاح اور فوز کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ فلاح کے معنی کھیتی کا بار آور ہونا ہے اور فوز کہتے ہیں (ACHIEVEMENT) کو۔ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ (۵۹/۲۰) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن کی رُو سے زندگی کی حرکت دَوری نہیں بلکہ حیات صراطِ مستقیم پر جا رہی ہے۔ وہ صراطِ مستقیم جو زندگی کو نشو و نما دینے والے خدا کی راہ ہے (اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۱۱/۵۶) یہ راہ صرف آگے لے جانے والی ہی نہیں بلکہ بلندیوں کی طرف لے جانے والی بھی ہے کیونکہ جس خدا کی یہ راہ ہے، وہ ذوالمعارج (سیڑھیوں والا) بھی ہے۔ وہ انہی سیڑھیوں (ارتقائی منازل کی راہ) سے انسان کو درجہ بدرجہ بلندیوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔ (لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) "تم یقیناً طبقاً عن طبقٍ بلند ہوتے جا رہے ہو"۔ یعنی زندگی کنارِ خاک میں جوئے آب کی روانی نہیں بلکہ اپنے زورِ دروں سے فوارہ کی طرح بلندیوں کی طرف جانے والی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصود کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا (نجات) نہیں بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما سے بلند مقامات کا حصول (ATTAINMENT) ہے، یعنی تخمِ حیات کو آبیاری اور پرورش سے ایک تنومند و توانا شجرِ طیّب میں تبدیل کر دینا۔ اسی لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یاد رکھو! قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰىہَا ۪ۙ جس نے تخمِ حیات کو نشو و نما دی، اس کی کھیتی بار آور ہوئی۔ وَ قَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىہَا ؕ جس نے اس بیج کو مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا، اس کی کھیتی کا ثمر بار ہونا تو ایک طرف خود بیج بھی ضائع ہو گیا۔ (۹۱/۹-۱۰)

اب یہ دیکھئے کہ جس چیز کو اعمال کی سزا کہا جاتا ہے اس سے مفہوم کیا ہے۔ سزا تین قسم کی ہو سکتی ہے۔ اوّل انتقامی۔ مثلاً آپ کو کسی نے گالی دی۔ آپ نے غصے میں آ کر اس کے تھپّڑ رسید کر دیا۔ اسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ آپ نے انتقام لے لیا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی سزا اللہ تعالےٰ کی طرف سے نہیں مل سکتی۔ وہ ذاتِ ممدّیت، غصہ کے انتقامی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ ہم اگر گناہ کرتے ہیں تو اس کا کیا بگڑتا ہے جو اسے غصہ آ جانے اور اس کے انتقام میں ہمیں سزا دے؟

سزا کا مقصود

انتقام، نقم سے ہے جس کے ایک معنی راستے کا درمیانی حصہ ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات ایسا غالب اور زبردست ہے کہ کسی کی مجال نہیں کہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے راستہ سے ادھر ادھر ہو جائے۔ لہٰذا جب انتقام کی نسبت خدا کی طرف کی جائے گی (جیسا کہ قرآن کی بعض آیات میں اسے "ذو انتقام اور منتقم" کہا گیا ہے) تو اس سے یہی مفہوم ہو گا۔ چنانچہ سورۂ زمر میں اس مفہوم کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝ جو شخص خدا کے قانون کی سیدھی راہ کو چھوڑ کر اور راہیں اختیار کر لے تو ان میں سے کوئی راہ اسے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتی۔ وَمَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ اور جو قانونِ خداوندی کی راہ پر جا رہا ہو، اسے دوسری غلط راہیں بے راہ نہیں کر سکتیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ أَلَيْسَ اللَّهُ بِعَزِيزٍ ذِي انْتِقَامٍ (۳۹/۳۶-۳۷) کیا تم اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے جو کسی کو اپنے قانون کی گرفت سے اِدھر اُدھر نہیں جانے دیتا۔

سزا کی دوسری قسم تادیبی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص نے چوری کی۔ حکومت نے اسے جیل خانے بھجدیا تاکہ قید و بند کی صعوبات سے اسے سبق مل جائے کہ جرم کے عواقب ایسے ہوتے ہیں اور اس طرح وہ خود بھی، اور دوسرے دیکھنے سننے والے بھی آئندہ ارتکابِ جرم سے مجتنب رہیں۔ ظاہر ہے کہ حیاتِ اُخروی میں اس قسم کی سزا بھی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ وہاں نہ جرم سے اجتناب کے کچھ معنی ہیں، نہ عبرت پکڑنے سے کچھ حاصل۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی تصریح کر دی گئی ہے کہ وہاں اہلِ جہنم چلائیں گے، گڑگڑائیں گے کہ ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے پھر دیکھئے کہ ہم کس طرح جرائم سے اجتناب کرتے ہیں؟ (۳۵/۳۷) لیکن جواب ملے گا کہ اب وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ زندگی پیچھے نہیں مڑ سکتی۔ اس میں رجعت و تکرار نہیں۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ سلسلۂ ارتقاء میں یا تو آگے بڑھ جانا ہے یا رک جانا۔ لہٰذا، سزا کی یہ دوسری شکل بھی درست نہیں۔

سزا کی تیسری صورت اعمال کا فطری نتیجہ ہے (NATURAL CONSEQUENCES OF ACTIONS)

آگ میں ہاتھ ڈال لیے، اس کا فطری نتیجہ جل جانا ہوگا۔ زہر کھائیے، اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت ہوگا۔ اس لئے اعمال کی جزا و سزا ان کے فطری نتائج کا ظہور ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ عمل کو نتیجہ تک پہنچنے میں وقت لگتا ہے۔ بعض صورتوں میں وقت اتنا کم ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عمل اور اس کا نتیجہ بیک وقت (SIMULTANEOUSLY) مرتب ہوگیا لیکن بعض کام ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے نتائج مرتب ہونے میں کافی وقت درکار ہوتا ہے۔

ترتیب و ظہورِ نتائج

قرآن میں اس قانونِ تدریج و امہال (درجہ بدرجہ، پورے وقت کے بعد نتیجہ تک پہنچانے کے قانون) کے متعلق متعدد مقامات پر شرح وبسط سے تصریحات موجود ہیں۔ اس تمام عرصے میں نتیجہ زیرِ ترتیب ہوتا ہے۔ جب یہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو وہی نتیجہ مشہود و محسوس طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اسے یوم الجزا یا یوم الدین کہا جاتا ہے، یعنی ظہورِ نتائج کا زمانہ۔ سورۂ النحل میں ہے:۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۶/۶۱)

اگر ایسا ہوتا کہ اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر (فوراً) پکڑتا تو ممکن نہ تھا کہ زمین کی سطح پر کوئی چلنے والا باقی رہتا لیکن وہ انھیں ایک خاص ٹھہرائے ہوئے وقت تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ظہورِ نتائج کا وقت آپہنچتا ہے تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں نہ ایک ثانیہ آگے۔

پانی کو آگ پر رکھئے، وہ غیر محسوس طور پر بتدریج حرارت جذب کئے جائے گا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ وہ اس نقطہ پر پہنچ جائے گا جہاں وہ کھولنے لگے گا۔ اب اس کے اشتعال و اضطراب کو ہر آنکھ دیکھ لے گی۔ اپنے مرض کے متعلق ڈاکٹر سے مشورہ لیجئے، وہ کہہ دے گا کہ آپ بے شک درست کہتے ہیں کہ میں رات کو اچھا بھلا سویا۔ صبح اٹھا، تو جوڑوں میں درد ہو رہا تھا لیکن اس مرض کی ابتدا تو چھ ماہ قبل ہو گئی تھی۔ آپ کو اس کا احساس اس وقت ہوا، جب وہ شکایت درد کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ فطرت کے قانونِ ارتقاء میں اس آئینِ تدریج و تاجیل، (رفتہ رفتہ، وقتِ معیّن پر نتیجہ کے ظاہر ہونے کے قانون) کو بڑا دخل حاصل ہے۔

قانونِ تدریج

سطح بیں نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کچھ نہیں ہو رہا لیکن جو نگاہیں سطح سے نیچے اتر کر حقیقت کو بے نقاب دیکھتی ہیں، انھیں صاف صاف نظر آجاتا ہے کہ اس بظاہر سکون و سکوت کے نیچے کتنی قیامتیں کروٹ بدل رہی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح

طبعی دنیا (PHYSICAL WORLD) میں ہر عمل ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے، اسی طرح معنوی دنیا میں بھی ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض نتائج انسان کی اسی زندگی میں ظہور پذیر ہو جاتے ہیں لیکن اگر قانونِ تربّص و امہال کے مطابق ظہورِ نتائج کا وقت اس زندگی میں نہیں آتا تو یہ نتائج اس کے بعد کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ حیات مسلسل حرکت کا نام ہے اور اس میں کہیں انقطاع نہیں، اس لئے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ کسی عمل کا نتیجہ یہیں برآمد ہو گیا یا سلسلۂ تنفس کے ختم ہو جانے کے بعد برآمد ہوا۔ انسان کا جسم اس کے اعمال (ACTIONS) کا محض ذریعہ یا واسطہ (INSTRUMENT) ہوتا ہے۔ اعمال کا اصل محرک "کچھ اور" ہوتا ہے۔ جب جسم موت کے ہاتھوں برباد ہو جاتا ہے تو "یہ کچھ اور" بدستور باقی رہتا ہے۔ لہٰذا اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ظہورِ نتائج جسم کی موجودگی میں ہوا ہے یا اس کے بعد۔ ترتیبِ نتائج اسی وقت شروع ہو جاتی ہے۔ محض ظہورِ نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ "یوم الدین" یعنی قانونِ خداوندی کے مطابق ترتیب و ظہورِ نتائج کا زمانہ اس وقت بھی موجود ہے۔

قیامتِ موجود وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ (۸۲/۱۶) یہ تو گویا کی "قیامت" ہے جس کا اس زندگی سے کچھ تعلق نہیں۔ اسی کو مخاطب کر کے اقبال نے کہا ہے کہ

سخن زنامہ و میزان دراز تر گفتی ۔۔ ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

یہی "قیامتِ موجود" ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وماھم عنھا بغائبین۔ یہ لوگ جہنم کی نظروں سے غائب نہیں۔ وہ انھیں اس وقت بھی دیکھ رہی ہے۔ ترتیبِ نتائج تو بہر حال اعمال کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کے نتائج کا ظہور بھی اسی دنیا میں ہو جاتا ہے۔ قرآن واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۱۶/۹۷)

جس کسی نے ہمواریاں پیدا کرنے والے (یا صلاحیت و صالحیت پیدا کرنے والے) کام کئے، خواہ مرد ہو خواہ عورت اور ان اعمال کی بنیاد مستقل اقدار کے یقین پر رکھی تو اسے ہم ضرور اس دنیا میں خوشگوار زندگی بسر کرائیں گے اور ان کے اعمال کی نسبت سے نتائج مرتب ہوں گے۔

خوشگوار زندگی کا یہ سلسلہ یہاں سے شروع ہو گا اور مسلسل آگے تک چلا جائے گا۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (۱۶/۳۰)

جو لوگ انسانی معاشرہ کے توازن کو قائم رکھنے والے کام کرتے ہیں، ان کی دنیاوی زندگی میں حسین توازن قائم رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی آئندہ زندگی میں بھی ان کی اختیاری قوتوں میں وسعت آجاتی ہے۔ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرنے والوں کے لئے وہ کاشانۂ حیات نہایت خوشگوار ہے۔

اس کے برعکس غیرصالح (ناہمواریاں پیدا کرنے والے اعمال) کے متعلق فرمایا کہ ان کا نتیجہ اس دنیا میں ذلت و رسوائی ہے۔ (لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ) اور اس کے ساتھ ہی آئندہ زندگی کی تباہی اور خرابی بھی (وَنُذِيْقُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ (۲۲/۹)

انسان کی نگاہیں چونکہ اسی زندگی کی چار دیواری میں گھری ہوئی ہیں، اس لئے وہ مکافاتِ عمل کو بھی اسی چاردیواری میں محصور سمجھتا ہے۔ حالانکہ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) عمل اور اس کے ظہورِ نتائج کے درمیانی وقفہ کے لئے دنیاوی چار دیواری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کا تعلق حیات سے ہے جو مسلسل آگے بڑھ جاتی ہے۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ کسی کا کوئی عمل بلا نتیجہ نہ رہنے پائے۔ اس نے کائنات کو پیدا ہی اس انداز سے کیا ہے کہ ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۴۵/۲۲)

اللہ نے سلسلۂ کائنات کو حق کے ساتھ پیدا کیا، یعنی اس لئے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال (کمائی) کا بدلہ دیا جائے اور اس طرح کسی کے معاملہ میں کوئی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔

اس دنیا پر نگاہ ڈالئے۔ یہاں ہر شئے قوانینِ طبعی کے حدود سے گھری ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں اعمال کے نتائج برآمد ہونے کے لئے مادی اسباب اور طبعی ذرائع کی ضرورت ہے۔ یہ قانون خود خالق کائنات کا متعین فرمودہ ہے۔ اس لئے اس کا منشاء (مشیت) یہی ہے کہ ہر کام قانونِ طبعی کے مطابق نتیجہ خیز ہو۔ مثلاً حق میں بڑی قوت ہے لیکن اس قوت کو مؤثر بنانے یا بروئے کار لانے کے لئے شمشیرِ خارا شگاف کی بھی ضرورت ہے۔ اگر حق کو برقرار رکھنے اور غالب کرنے کے لئے قوت موجود نہیں تو حق ہمارے حساب و شمار کے مطابق غالب نہیں آ سکے گا۔ اسی لئے قرآن نے کہہ دیا کہ ہم نے نظامِ آئین و عدل کے بقا اور استحکام کے لئے حدید (فولاد) کو بھی نازل کیا ہے۔ (۵۷/۲۵) (دیکھئے سورۂ حدید) اس

نے حق کی حمایت کرنے والی جماعت سے برملا کہہ دیا کہ حق کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ وَاَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (۸/۶۰) مخالفین کے مقابلے کے لئے قوت فراہم کرو۔ اس لئے کہ مادیت کی چاردیواری میں گھری ہوئی دنیا میں اعمال کے نتائج مادی ذرائع کی رُو سے مادی پیکروں میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس حد تک مومن

طبعی قوانین

اور کافر دونوں برابر ہیں۔ ایک مادہ پرست قوم اگر قوت فراہم کرنے گی تو اس کے ہاتھ میں بھی سلطنت و حکومت اسی طرح آجائے گی جس طرح ایک "خدا پرست" قوم کے ہاتھ میں لیکن اس کے بعد ان دونوں میں فرق شروع ہو جائے گا۔ وہ قوم جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتے گی، وہ قوت و حکومت کو انسانی معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے لئے استعمال کرے گی۔ اس کے برعکس حکومت و سلطنت کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھنے والی قوم اس حکومت کو نظامِ ربوبیت کے قیام کا ذریعہ بنا لے گی تاکہ جوہرِ انسانیت کی نشوونما کا انتظام ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس قوم کے ان اعمال کے بھی تو نتائج مرتب ہوں گے۔ ان میں سے جن اعمال کے نتائج یہیں مرتب ہو جائیں گے، ان کا ظہور مادی پیکروں میں ہوگا۔ جن کا ظہور آگے چل کر ہوگا، وہ وہاں کے آئین و ضوابط کے مطابق متشکل ہوں گے۔ وہاں معنوی نتائج بھی محسوس طور پر سامنے آجائیں گے کیونکہ وہاں کا قانون یہ ہے کہ فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (۵۰/۲۲) وہاں آنکھوں سے پردے اٹھا دیئے جائیں گے اور نگاہیں بجلیاں بن جائیں گی جس سے مستور حقائق بھی بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے۔ (وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ۔) (۷۹/۳۶)

اب کائنات کے آئینِ ارتقاء پر غور کیجئے۔ کائنات میں تخریبی اور تعمیری دونوں قوتیں کارفرما ہیں۔ تعمیری قوتیں اشیائے متعلقہ کی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن تخریبی قوتیں ان کے ضعف و انتشار میں کوشاں رہتی ہیں۔ اگر تعمیری قوتیں غالب

تخریبی اور تعمیری قوتیں

رہیں تو نشوونما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اگر تخریبی قوتیں غلبہ پا جائیں تو نشوونما رُک جاتی ہے۔ وررفتہ رفتہ اضمحلال و پژمردگی شروع ہو جاتی ہے۔ انسانی جسم میں اس تعمیری قوت کا نام توانائی (VITALITY) ہے اور تخریبی قوتیں بالعموم وہ مختلف جراثیم ہیں جو تعدیہ (INFECTION) سے پیدا ہوں یا غلط غذا کے کیمیائی عمل سے۔ بعض اوقات یہ جراثیم وبائی صورت میں یورش کر کے آجاتے ہیں۔ یہ جراثیم فضا میں پھیلے رہتے ہیں اور ہر جسم پر حملہ کرتے ہیں۔ جس شخص کی توانائی زیادہ ہو، اس پر جراثیم اپنا اثر نہیں کر سکتے۔ یا یوں کہئے کہ وہ توانائی ان کے تخریبی اثرات کی مدافعت کر دیتی ہے۔ جہاں توانائی

کم ہو جاتی ہے، جراثیم غلبہ پا جاتے ہیں۔ اسی کا نام ابتدا میں بیماری اور اس کے بعد (ان کے مسلسل غلبہ کے انجام کا نام) موت ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ یہی قانونِ ارتقاء انسانی ذات کے نشو و نما میں کارفرما ہے۔ انسان کا ہر عمل نتیجہ پیدا کرتا ہے یعنی اس کی ذات پر ایک اثر مرتب کر دیتا ہے۔ یہ وہ "اعمالنامہ" ہے جو ہر شخص کی گردن میں حمائل رہتا ہے (۱۷/۱۳)۔ اس پر اس کے ہاتھ پاؤں بلکہ خود اس کی اپنی ذات شاہد ہے۔ یہ اثرات یا تو توانائی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں یا تخریب کا موجب یعنی انسانی اعمال یا ایجابی (POSITIVE) اثر مرتب کرتے ہیں یا سلبی (NEGATIVE) یا بقول اقبالؒ، وہ انسانی ذات (خودی) کے استحکام و بقاء کا موجب ہوتے ہیں یا اس کے اضمحلال و تخریب کا باعث، لیکن سلبی ہوں یا ایجابی، بلا نتیجہ کوئی عمل نہیں رہتا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۔ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۸،۷)

جو شخص ایک ذرہ کے برابر بھی ایجابی عمل کرے گا، اس کا نتیجہ سامنے آئے گا اور جو ایک ذرے کے برابر تخریبی عمل کرے گا، اس کا بھی نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔

یہ عملِ تعمیر و تخریب جاری رہتا ہے۔ یہ کشمکشِ "خیر و شر" ہر آن موجود ہوتی ہے۔ ان نتائج کا قانونِ ارتقاء کی میزان میں وزن ہوتا رہتا ہے۔ اگر تعمیری نتائج کے اعمال کا پلڑا بھاری ہو تو انسان کی نشو و نما جاری رہتی ہے۔ اگر وہ پلڑا ہلکا ہو جائے تو نشو و ارتقاء کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔

جہنم سے مفہوم

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ جس کی تعمیری قوتوں کا پلڑا بھاری رہا اس کی کھیتی بار آور ہو گئی۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اور جس کا پلڑا ہلکا ہو گیا، تو اس کی ذات (نفس) کا استحکام لُٹ گیا۔ انسانی خودی کی (DISINTEGRATION) ہو گئی۔ اس کا نام جہنم ہے۔ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (۲۳/۱۰۲) یہی ہیں جہنم میں رہنے والے۔

یہ ظاہر ہے کہ جس کی تعمیری قوتوں (توانائی) کا پلڑا بھاری ہوتا ہے، اس میں تخریبی قوتیں یکسر معدوم نہیں ہوتیں وہ قوتیں موجود ہوتی ہیں لیکن تعمیری قوتیں ان کے عملِ تخریب کو غالب نہیں آنے دیتیں اور اس طرح ان کا تخریبی اثر زائل ہو جاتا ہے۔

مغفرت

اس عمل کا نام قرآن کی اصطلاح میں مغفرت ہے۔ مغفرت کے معنی حفاظت کے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) توازن قائم رکھنے والے اعمال، توازن بگاڑنے والے اعمال کے تخریبی اثرات کو

زائل کر دیتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے:۔

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ...ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۶۴/۹)

جو اللہ پر ایمان لائے اور انہوں نے ہمواری پیدا کرنے والے کام کئے تو اللہ کا قانون ان کے توازن بگاڑنے والے اعمال کے اثرات کو زائل کر دے گا اور ان کی صلاحیتوں کی بنا پر انھیں "جنّات" میں داخل کرے گا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ خدا کا قانون تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر کے ان کی حالت کو صلاحیتوں سے ہم آغوش بنا دے گا۔ (اَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷/۲))

جو طالب علم امتحان میں ساٹھ فیصد نمبر حاصل کرلے اسے اگلی کلاس میں جانے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اس کی چالیس فیصد غلطیاں اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ (PASS MARKS) کی یہ (PERCENTAGE) اس قانون کے مطابق مقرر ہوتی ہے جسے قانونِ مشیّت کہا جاتا ہے۔ یغفر لمن یشاء یعذب من یشاء کا یہ مفہوم بھی ہے لیکن ساٹھ فیصد نمبر حاصل کرنے والے کے لئے لازمی مضامین (COMPULSORY SUBJECTS) میں پاس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (۴/۳۱) اگر تم ان بڑی بڑی (اصولی) باتوں سے مجتنب رہو، جن سے تمہیں روکا گیا ہے، (اور جو تمہاری تخریبِ ذات کا موجب ہیں۔) تو ہم کم درجہ کی تخریبی قوتوں کے اثرات کو زائل کر دیں گے اور تم اس سلسلۂ ارتقاء کی اگلی کڑی میں جا پہنچو گے جو نہایت سرسبز شاداب ہے۔ (نیز دیکھئے ۵۳/۳۲) یہ وہ لوگ ہیں جن کی تعمیری قوتیں غالب رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی نشوونما کا

جنّت

سلسلہ برقرار رہتا ہے اور وہ سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل میں جا پہنچتے ہیں۔ اس نشوونمایافتہ حالت کا نام جنّت کی زندگی ہے۔ اس کے برعکس جن پر تخریبی قوتیں غالب آجاتی ہیں، ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ اسے جہنّم کی زندگی کہتے ہیں۔ جہنّم کا لفظ عربی الاصل نہیں، عبرانی ہے لیکن قرآن نے اس کے لئے دوسرا لفظ "جحیم" استعمال کیا ہے۔ اجحم عنہ کے معنی ہیں، وہ اس سے رُک گیا۔ جو نوع سلسلۂ ارتقاء میں رک جاتی ہے، وہ ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے اور وہیں آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہنّم کا لفظ ہر جگہ واحد کے صیغے میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ رکنے والوں کا ایک ہی مقام ہوتا ہے مختلف مقامات

کے درجے تو آگے بڑھنے والوں کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے جنت کے لئے واحد (جنت) تثنیہ (جنتان) اور جمع جنات کے صیغے آئے ہیں۔ اہلِ جنت کے متعلق یہ تصریح بھی موجود ہے کہ وہ صراطِ حمید پر چلنے کی دعائیں مانگیں گے اور ان کی پیشانی کا نور ان کے آگے آگے چلے گا، (66/8) یعنی جنت رکنے کا مقام نہیں آگے بڑھنے کا مقام ہے۔

نشو و نما پانے والے تو آگے بڑھتے ہیں لیکن سلسلۂ ارتقاء میں کسی ایک مقام پر رک جانے والے ہمیشہ

جہنم ابدی ھے

وہیں رہتے ہیں۔ جن کی نشو و نما رک جاتی ہے، ان کے لئے اس مقام سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ اس لئے فرمایا کہ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ (5/37) وہ بہتیرا چاہیں گے کہ جہنم سے نکل سکیں۔ وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے۔ وہ اسی ایک حالت میں رکے رہیں گے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا (4/169) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ خود لفظ عذاب اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔ اعـذاب کے معنی ہیں روک دینا

عذاب کے معنی

عاذب اس اونٹ کو کہتے ہیں جو شدتِ پیاس کی وجہ سے کھانا بند کر دے اور اس سے اس قدر لاغر ہو جائے کہ نہ اس سے چلا ہی جائے اور نہ ہی پھر کھانے پینے کی ہمت باقی رہے۔

غور کیجئے! جس طرح نشو و نما پا کر آگے بڑھنے والے کی تعمیری قوتوں کے ساتھ تخریبی قوتوں کے اثرات بھی موجود تھے، (لیکن چونکہ اس میں تعمیری قوتوں کا غلبہ تھا، اس لئے تخریبی قوتوں کا اثر زائل ہو گیا۔) اس طرح جب تخریبی قوتوں کا غلبہ ہو گا تو پھر تعمیری قوتیں بیکار ہو کر رہ جائیں گی۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جب نیکیاں زیادہ ہو گئیں تو انسان سیدھا جنت میں چلا گیا۔ یہ نہیں کہ پہلے برائیوں کی سزا بھگتنے کے لئے جہنم میں بھیج دیا جائے اور پھر قید کی میعاد پوری کرنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ یا اگر برائیوں کی زیادتی ہو گئی تو ایک مدتِ مدید تک جہنم میں رکھ کر پھر نیکیوں کی جزا کے لئے جنت میں بھیج دیا جائے۔ یہ تصور قرآنی نہیں ہے، نجات کا غیر قرآنی تصور ہے۔ چنانچہ آپ (اوپر) دیکھ چکے ہیں کہ قرآن نے بالتصریح فرما دیا کہ جن کا پلڑا بھاری ہو گا۔ وہ سیدھے جنت میں چلے جائیں گے اور جن کا پلڑا ہلکا ہو گا، وہ سیدھے جہنم میں (101/6-11)۔ نہ ان کی کمزوریاں انہیں عذابِ جہنم کی طرف لے جائیں گی، نہ ان کی نیکیاں انہیں عذاب بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل کریں گی۔ اسی لئے فرمایا کہ:-

بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ (2/81)

یاد رکھو! قانونِ خداوندی یہ ہے کہ جس نے توازن بگاڑنے والے کام اس حد تک کئے کہ اس کی کمزوریوں نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا، تو یہ لوگ جہنم میں جائیں گے، جس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یہ ہیں وہ کہ جن کے لئے میزان قائم کرنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ (فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (۱۸/۱۰۵) اس لئے کہ) لَاخَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (۳/۷۶) ان کا حیاتِ اخروی میں کوئی حصہ ہی نہیں۔ اولٰئِک حبطت اعمالھم ان کے تعمیری قوتوں والے اعمال سب رائیگاں چلے گئے۔ غور کیجئے۔ جب انسان مرتا ہے تو

حبطت اعمالہم

تو اس میں اس وقت بھی کچھ نہ کچھ توانائی تو باقی ہوتی ہے لیکن وہ توانائی اس کے کسی کام نہیں آتی، کیونکہ تخریبی قوتیں اس درجہ غالب آجاتی ہیں کہ وہ نظامِ بدن کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔ لہٰذا جہنم میں بھیجا ہی اسے جاتا ہے، جس میں جنت میں جانے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ مرتا وہی ہے جس میں زندہ رہنے کی قوت نہیں رہتی۔ آگے بڑھنے سے رُکتا وہی ہے، جس میں نشوونما کی استعداد مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ استعداد کبھی تو بتدریج مفقود ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک غلط قدم ہی ان صلاحیتوں کو سلب کر لیتا ہے۔ مثلاً خود مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا۔ (مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا۔ (۴/۹۳) جس نے کسی مومن کو بالارادہ قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یا مثلاً سورۂ انفال میں جنگِ بدر کے ضمن میں ہے کہ اللہ نے کہا کہ آج کے دن جو شخص میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جائے گا۔ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ (۸/۱۶) تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس قسم کا ایک غلط قدم نشوونما کی ساری قوتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ جیسے سنکھیا کی ایک پھانکی عمر بھر کی خوراک سے حاصل کردہ قوتوں کو ایک لمحہ میں زائل کر دیتی ہے، یا چاقو کی ایک چبھن ساری عمر کے لئے آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے۔ یعنی بعض تخریبی قوت اس قدر تیز اثر ہوتی ہے کہ عمر بھر کی تعمیری قوتیں اس کے سامنے بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض تعمیری قوتیں اس قدر تقویت بخش ہوتی ہیں کہ تخریبی قوتوں کا ہجوم بھی انہیں بے اثر نہیں کر سکتا۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ انسانی ذات کے نشوونما پالینے کے بعد اس کا سلسلۂ ارتقاء میں آگے بڑھ جانا جنت کی زندگی ہے اور نشوونما کی صلاحیت کے سلب ہو چکنے کے بعد سلسلۂ ارتقاء میں رُک جانے کا نام جہنم کا عذاب ہے اور چونکہ رُکتا وہی ہے جس میں نشوونما کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی اس لئے جہنم سے سزا بھگتنے کے بعد جنت کی طرف منتقل ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱/۶-۹) نظامِ ارتقاء کا اٹل قانون ہے۔

جو کچھ اس وقت تک لکھا گیا ہے۔ اس سے اتنی بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ قرآنِ کریم کی رو سے کائنات میں سلسلۂ ارتقاء جاری وساری ہے۔ یہی قانونِ ارتقاء خود انسانی زندگی پر بھی حاوی ہے۔ موجودہ پیکرِ انسانی اس کے طبعی ارتقاء کی آخری کڑی ہو تو ہو لیکن جہاں تک اصل انسان یعنی اس کے جوہر و شرفِ انسانیت کے ارتقاء کا تعلق ہے، اس ارتقاء (نشوونما) کا آغاز اسی زندگی سے ہو جاتا ہے اور طبعی موت اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ جو اس سلسلے میں اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی جنّت کی زندگی کہلاتی ہے۔ جنّت و جہنّم سے مقصود ہی یہ ہے کہ کون آگے بڑھتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷) جو تم میں سے چاہے آگے بڑھ جائے، جو چاہے پیچھے رہ جائے۔ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۸) اس کا فیصلہ ہر شخص کے اعمال پر منحصر ہے۔ جہنّم میں نشوونما، تزکیہ (GROWTH) رُک جاتی ہے۔ چنانچہ اہلِ جہنّم کے

جنّت اور جہنّم مقام نہیں

متعلق سورۂ بقرہ میں ہے کہ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ (۲/۱۷۴) اللہ ان کی نشوونما روک دے گا۔ (نیز ۳/۷۶) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، چونکہ حیات مسلسل آگے بڑھتی ہے، اس لئے جنّت اور جہنّم (آگے بڑھنے کی صلاحیت اور رُک جانے کا مرض) اسی زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے جنّت یا جہنّم کسی خاص مقام کا نام نہیں، کیفیاتِ زندگی کی تعبیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنّت کے متعلق قرآن میں ہے کہ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (۳/۱۳۳، ۵۷/۲۱) اس کی وسعت تمام کائنات (ارض و سماوات) کو محیط ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جنّت کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ اسی طرح جہنّم کے متعلق فرمایا کہ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ (۲۹/۵۴) جہنّم نے کفار کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے اور دوسری جگہ ہے نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ (۱۰۴/۷-۶) اللہ کی سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے۔

اس دنیا میں جنّت اور جہنّم کی آگ کیسی ہوتی ہے، اسے ہم دیکھ بھی سکتے ہیں اور محسوس بھی کر سکتے ہیں۔ قرآن نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کر دی ہے۔ (یہ عنوان ایک مستقل موضوع ہے۔ جس کے متعلق ضمنی طور پر لکھنا کافی (فلہذا مفید) نہیں ہوگا۔ اس پر مستقل طور پر الگ لکھا جائے گا) ان تصریحات کے بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اصولی طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ قرآن کی رُو سے ایک خاص اجتماعی نظام کے ماتحت "جنّت کی زندگی" بسر ہو سکتی ہے اور اس کے برعکس غلط نظامِ اجتماعی (معاشرے) میں جہنّم کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ جنّت کی زندگی کے لئے شرطِ

دنیا میں جنّت

اوّلین "وراثتِ ارض" (یعنی اپنی مملکت کا وجود) ہے۔ جس میں کسی دوسرے کا عمل دخل نہ ہو۔ چنانچہ "سورۂ زمر" میں اہلِ جنّت کے متعلق لکھا ہے کہ

وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَیْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ (۳۹/۷۴)۔

وہ (اس کیفیت کو دیکھ کر) پکار اٹھیں گے کہ سزاوارِ حمدیت اللہ کی ذات ہے جس نے اپنے قانون کے مطابق اپنے وعدوں کو ہم سے سچا کر دکھایا اور ہمیں اس مملکت کا مالک بنا دیا جس میں ہم پورے پورے طور پر صاحبِ اختیار ہیں۔ قانونِ خداوندی کے مطابق کام کرنے والی قوموں کے لئے یہ اجر کسقدر خوشگوار ہے۔

اس مملکت میں قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ ربوبیت کی ترویج و تنفیذ سے جوہر و شرفِ انسانیت کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے اور یہی نشوونما جنت کی زندگی کا آغاز ہے۔ اس کے برعکس، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جس نظام میں یہ نشوونما رک جاتی ہے، وہ نظام جہنم کی زندگی کی تمہید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنت اور جہنم کو اجتماعی زندگی کا مظہر بتایا ہے۔ جنت میں بھی قوموں کی قومیں داخل ہوتی ہیں۔ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۳۹/۷۳) اور جہنم میں بھی (وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (۳۹/۷۱) سورۂ اعراف میں ہے کہ جہنم میں داخل ہونے والی ہر نئی قوم سے کہا جائے گا کہ جاؤ اپنے جیسی پہلی قوموں کے ساتھ مل جاؤ۔ (قَالَ ادْخُلُوْا فِیْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِی النَّارِ (۷/۳۸) جب وہ اس میں داخل ہوگی تو اس کی ہم مشرب قوم اس پر لعنت بھیجے گی۔ (كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا (۷/۳۸) سورۂ ملک میں ہے کہ جہنم میں یہ اقوام فوج در فوج داخل ہوں گی (۶۷/۸) اسی طرح سورۂ ابراہیم میں ہے۔ (اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جنہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمت (مملکت و حکومت) کو غیر خدائی آئین کے خطوط پر متشکل کر کے اس کی ناسپاس گزاری کی اور اس طرح اس کی ابھارنے والی قوتوں کو دبا کر رکھ دیا (کفروا) اور یوں وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴/۲۸)۔ اپنی پوری کی پوری قوم کو جہنم میں لے گئے۔

اجتماعی جنت و جہنم

غور کیا آپ نے کہ کس طرح اربابِ حل و عقد کی غلط روش سے پوری کی پوری قوم جہنم میں چلی جاتی ہے یعنی ان کے معاشرے کا قیام نظامِ ربوبیت کے مطابق نہیں ہوتا، اس لئے اس قوم کی نشوونما کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور یہی ان کے لئے جہنم ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، قرآن نے جنت اور جہنم کی زندگیوں کی اس قدر تفاصیل بیان کر دی ہیں کہ ان سے ان اجتماعی نظامہائے حیات کا پورے کا پورا نقشہ مرتب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

جس کا نتیجہ جنّت یا جہنّم کی زندگی ہے۔ (یہ تفاصیل میری کتاب معارف القرآن کی آخری جلد میں شرح و بسط سے ملیں گی) ان نظامہائے حیات کے جو نتائج اس وقت ہمارے سامنے آجاتے ہیں انھیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں لیکن زندگی کی اگلی منزل (حیاتِ اُخروی) کی کیفیات کس قسم کی ہوں گی، اس کا علم و احساس آج کی زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی سے پچھلی کڑی کا حیوان نہیں سمجھ سکتا کہ انسانی شعور و ادراک کی خصوصیات اور اس کے جوہرِ انسانیت کی کیفیات کیا ہیں۔ ان کا احساس صرف انسانی زندگی کے درجے میں پہنچ کر ہی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح انسان کی موجودہ زندگی میں اس حقیقت کا احساس ناممکن ہے کہ اس سے اگلی منزل کے خصائص و امتیازات کی کیا نوعیت ہوگی۔ اسی لئے فرمایا کہ:

فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (۳۲/۱۷)

کوئی شخص نہیں جانتا کہ ان کے اعمال کے بدلے میں ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے جو کچھ پس پردہ چھپا ہوا ہے۔ وہ کیا ہے؟

آج ان حقائق کا ادراک اور ان کوائف کا احساس ناممکن ہے۔ لہٰذا اُن کے متعلق قرآن کی بیان فرمودہ تصریحات یا اشارات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ اُس وقت یہ چیزیں مشہود پیکروں میں سامنے آجائیں گی اور لوگوں کے اعمال کے نتائج ان کے سامنے نمودار ہو جائیں گے، بایں نمط کہ نشو و نما سے محروم رہ جانے والے آگے بڑھ جانے والوں کی خوش بختیوں پر اپنے ہاتھ کاٹیں گے اور فرطِ حسرت سے پکار اٹھیں گے کہ

یٰلَیۡتَنِیۡ قَدَّمۡتُ لِحَیَاتِیۡ ۚ (۸۹/۲۴)

اے کاش! میں نے اس زندگی کے لئے پہلے سے کچھ بھیجا ہوتا۔

یہی وہ شدّتِ احساس ہے جو اہلِ جہنّم کی زندگی کو اس درجہ درد انگیز و کرب آمیز بنا دے گی کہ وہ چلاّ اٹھیں گے کہ یٰلیتنی کنت ترابا۔ (اے کاش! میں ذی احساس ہونے کے بجائے بے حس مٹی کا تودہ ہوتا)۔

آدمؑ کی جنّت

اس جنّت کے علاوہ، جو انسان کو اس دنیا میں یا اخروی زندگی میں اس کے اعمال کے نتیجے میں ملتی ہے، قرآنِ کریم میں اس "جنّت" کا بھی ذکر ہے، جس میں آدمؑ رہتا تھا اور پھر اسے وہاں سے نکالا گیا۔ یہ "جنّت" کیا تھی اور "آدم" کے وہاں سے نکلنے سے مراد کیا ہے، ان موضوعات کا تعلق داستانِ آدمؑ سے ہے جس کا یہ مقام نہیں۔ (اسے میں نے اپنی کتاب "ابلیس و آدم" میں

تفصیل سے بیان کیا ہے) اس جگہ صرف اتنا بتادینا کافی ہوگا کہ قصۂ آدم درحقیقت انسانی زندگی کی رُوداد ہے جسے قرآنِ کریم نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ "آدم" سے مراد آدمی ہے نہ کہ کوئی خاص فرد۔ نوعِ انسانی کی ابتدائی زندگی میں، سامانِ رزق کی بڑی افراط تھی، اس لئے اس وقت ابھی "میری اور تیری" کی کشمکش پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص کو جہاں سے جی چاہے بافراط کھانے پینے کو مل جاتا تھا اور افراد میں باہمی کسی قسم کی چپقلش نہیں تھی۔ یہ تھی آدم کی ابتدائی جنت کی زندگی۔ پھر اس کا دورِ تمدن شروع ہوا جس میں افراد کے مفاد میں باہمی تصادم ہونے لگا۔ اس سے ان میں عداوت پیدا ہوگئی۔ نوعِ انسانی قبیلوں اور خاندانوں میں بٹ گئی۔ (یہی قبائل اب قوموں کی شکل میں تبدیل ہوگئے ہیں) قبائل میں باہمی لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ یوں اس زمین پر خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کے سلسلے کی ابتدا ہوئی جو ابھی تک جاری ہے بلکہ اس کی شدت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ اس سے اس کی زندگی کی وہ پہلی سی حالت نہ رہی۔ یہ اس کا "ہبوط" تھا — یعنی جنت کے مقامِ بلند سے نیچے اُتر آنا۔ اس کے بعد اس سے کہا گیا کہ اگر تم پھر اُسی جنت کی زندگی حاصل کرنا چاہتے ہو تو خدا کی وحی کے مطابق اپنے معاشرہ کو متشکل کرو۔ اس سے تمہیں اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی میسر آجائے گی اور آخرت میں بھی۔ چونکہ یہ زندگی تمہارے اعمال کا فطری نتیجہ ہوگی، اس لئے اس "جنت" سے نکالے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ یوں جنت سے نکالا ہوا "آدم" دوبارہ جنت حاصل کرلے گا — اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی — اور پھر اسی جنت کا سلسلہ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

دوام سے مراد گذشتہ صفحات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے جنت اور جہنم میں قیام ہمیشہ کے لئے ہوگا۔ (خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا) لیکن اس دوام اور ہمیشگی سے وہ ابدیت اور سرمدیت متصور نہیں، جو صرف ذاتِ خداوندی کے لئے مختص ہے۔ یہ دوام قانونِ مشیت کے ساتھ مشروط ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں جنت اور دوزخ دونوں کے متعلق فرمایا کہ (خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ[1] (11/107)) وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک کہ ارض و سما قائم ہیں۔ مگر یہ کہ جو تیرے نشوونما دینے والے کے قانونِ مشیت میں ہو۔" یہ ظاہر ہے کہ سلسلۂ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والی نوع کچھ عرصے تک علیٰ حالہٖ باقی رہتی ہے، اس کے بعد ختم ہوجاتی ہے۔ آگے بڑھنے والی نوع کچھ عرصہ تک اس اگلی منزل میں رہتی ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ غیر منقطع ہوتا ہے کہ

---

[1] آیاتِ بالا میں اہلِ جنت کے متعلق اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ کے بعد ہے عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ۔ یہ عطیہ غیر منقطع ہے۔ (11/107 — 108)

زندگی جوئے رواں است و رواں خواھد بود — ایں مئے کہنہ جوان است و جوان خواھد بود

لیکن اس غیر منقطع روانی کی ابدیت، خدا کی ابدیت کی طرح مطلق نہیں ہو سکتی۔

قرآن کی رو سے "نظریۂ نجات" کے متعلق یہ چند اجمالی اشارات ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ (اس کے لئے میں نے معارف القرآن کی آخری جلد کو مخصوص کر رکھا ہے) ان اجمالی اشارات کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر علم و بصیرت پر مبنی ہے؟ اور ایسا کیوں نہ ہو؟ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جو علم حقیقی کا سرچشمہ اور دنیا بھر کو بصیرت عطا کرنے والا ہے۔ پھر یہ صحیفۂ مقدسہ ذہنِ انسانی کی آمیزش سے پاک و صاف ہے۔ اس لئے اس میں جو کچھ ہے علم و یقین ہے۔ ظن و قیاس کا اس میں کہیں گزر نہیں۔ اس تصور کے برعکس اس نظریۂ نجات کو دیکھئے جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے۔ وہ نظریہ غیر اسلامی تصورات سے اخذ کردہ اور ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے جس میں ہر بات کو "قیامت" پر اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآنی تصور کی رو سے ہماری

قدم قدم پر قیامت

زندگی کی ایک ایک سانس میں "حساب اور کتاب" پوشیدہ ہے۔ کارگہِ حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے، جس میں ہمارے اعمال تلتے اور انہیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں۔ بقا ان کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو۔ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ۭ (۱۳/۱۷) (یاد رکھو باقی وہی رہتا ہے جو نوعِ انسانی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔) بقا اور نشوونما کے لئے صرف اپنی ذات میں اصلح (THE FITTEST) ہونا کافی نہیں۔ انفع (سب سے زیادہ نفع پہنچانے والا) ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ "انفعیت" صرف نظامِ ربوبیت میں ممکن ہے۔ لہٰذا اگر ہمارا معاشرہ نظامِ ربوبیت کے خطوط پر متشکل ہے تو اس میں ہر لمحہ جوہرِ انسانیت کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔ اور اس طرح ہمارے اندر باغِ جنت کے شگوفے کھلتے اور پھول لہلہاتے چلے جاتے ہیں اور موت کا پردہ ان کی شادابیوں میں کہیں حائل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اگر ہماری زندگی نفسا نفسی (انفرادیت) کے انسانیت سوز آتش دانوں سے گزر رہی ہے تو مزرعِ حیات کی شادابیاں لمحہ بہ لمحہ خشک ہوتی چلی جاتی ہیں اور ان میں نشوونما کی

بقا الانفع

کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور بدبختی ہے ان سوختہ سامانوں کے لئے، جن کی کھیتیاں اس طرح جھلس کر رہ جائیں۔

حَتّٰی جَعَلْنٰھُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ ○ (۲۱/۱۵)

یہ بھی واضح رہے کہ حقائقِ قرآن کے متعلق جو کچھ ہم سمجھ سکتے ہیں' اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ تجارب و مشاہدات اور علم و بصیرت کے صحیح خطوط پر آگے بڑھتا جائے گا، قرآنی حقائق اور بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ ط (۴۱/۵۳)

ثواب

اکتوبر ۱۹۵۱ء

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعہ بیان کرتا ہے ۔ اسی لئے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے وہ وضع ہوئے تھے وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئے گی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ادنیٰ تعمق ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ متعدد الفاظ ہیں جنھیں ہم صبح سے شام تک بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دوائرِ حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے اس لئے کہ "مذہب[۱]" کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کے مباحث نظری (THEORETICAL) ہوتے ہیں اور نظری مباحث میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "مذہب" چونکہ انسان کے دورِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے، اس لئے

الفاظ بلا مفہوم

اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ سحر کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ الفاظ (بلا مفہوم) کے الٹ پھیر اور اعادہ سے نتیجہ پیدا ہو۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے، عجیب مہملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر اس قدر

---

[۱] مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ "مذہب" ہے۔ خدا کی طرف سے دین ملتا ہے۔ اس لئے اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے

زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی ردّ و بدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب نتیجہ مرتّب نہیں ہو سکتا۔ "الفاظ بلا مفہوم" اور اعمال بلا نتیجہ، یہ ہے "مذہب" کی صحیح تعریف۔

اسلام "مذہب" کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لے کر آیا تھا۔ جسے آج کی اصطلاح میں آئینی نظامِ زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ نظامِ زندگی، نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے عملی مسائل سے بحث کرے گا اور جب اس بحث کا دائرہ عملی مسائلِ حیات پر مشتمل ہوگا تو اس کے الفاظ واضح اور متعین مفہوم کے پیکر ہوں گے۔ اس میں "لفظ بلا معنیٰ" کا تصور بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قانون اور آئین کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (DEFINITION) میں ذرا فرق ہو جائے، تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے۔ اسی لئے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف متعین کر دی جاتی ہے۔ مثلاً

متعین مفہوم

چوری جرم ہے۔ قانون کی کتاب میں پہلے یہ بتایا جائے گا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اس متعینہ مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل چوری کہلا سکتا ہے یا نہیں۔ وقس علیٰ ھذا۔

اسلام جب ایک آئینی اور قانونی نظامِ زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم متعین ہوگا۔ بلا تعینِ مفہوم نہ قانون قانون رہ سکتا ہے نہ آئین آئین۔ اسلام کا ضابطۂ آئین قرآن ہے اور قرآن کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعین کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ کتابِ آئین ہے، "مذہبی منتروں" کی کتاب نہیں لیکن جب قرآن کا دین، مذہب میں تبدیل[1] ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے، اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہراتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ انہی الفاظ میں ایک لفظ "ثواب" بھی ہے۔ مذہب پرست طبقہ میں دیکھئے۔ بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جائے گا۔ یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے، وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے۔ جس بات کے متعلق پوچھئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اس سے ثواب ہوگا لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب! ثواب ہوتا کیا ہے، تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہیں ملے گا۔ آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز سی دکھائی دے گی (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے، تعجب انگیز نظر

---

[1] اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے "اسبابِ زوالِ امت"۔

ثواب کیا ہے؟

آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امر واقعہ ہے۔ آپ دور نہ جائیے خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے۔ آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ "ثواب" کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی، یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں، جس کا کوئی اثر آپ کی ذات پر مرتب ہوتا ہو یا جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو۔ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ ہے "ثواب" کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آئے گا یا آپ کو وہ شخص بتائے گا جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پلے ہی نہیں پڑتا کہ بات کیا ہوئی۔ آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ ہمیشہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلامی احکام کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی۔ وہ اوامر اور نواہی کے پابند نہیں۔ یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟

عمل کیوں نہیں ہوتا

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کرا سکتے ہیں کہ یہ کرو، وہ نہ کرو بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ لیکن جب وہی بچہ صاحبِ فکر و شعور ہو جائے تو اس وقت آپ اس سے اس طرح احکام نہیں منوا سکتے۔ اس وقت آپ کو بتانا ہوگا، اسے سمجھانا ہوگا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ مذہب کی تاکید یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے تم "کیوں" نہ پوچھو، جو کچھ کہا جاتا ہے، چپکے سے کئے جاؤ۔ انسانی ذہن اپنے عہدِ طفولیت میں تو اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ "کیوں" کے مقام تک پہنچ جائے تو پھر مجرد حکم اس کے لئے محرکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لِم بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ چونکہ قرآن مذہب نہیں بلکہ دین لایا تھا، اس لئے اس نے ذہنِ انسانی کے اس تقاضے کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ کتاب (قانون یا حکم) کے ساتھ حکمت (اس کی لِم "کیوں") بھی بتا دی اور ہر مقام پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ اس نے اپنی دعوت کی بنیاد ہی بصیرت پر رکھی۔ (۱۲/۱۰۸) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ صاحبانِ عقل و بصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ حیات کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس نے کھلے کھلے طور پر کہہ دیا کہ بدترین خلائق (شر الدواب) وہ انسان ہیں جو عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ (۸/۲۲) دنیا کا کوئی نظام ہو، اس کی جاذبیت کا راز اس کے نتائج میں مضمر ہوتا ہے اور نتائج اس ٹھوس

حقیقت کا نام ہے جو بلا حجاب و نقاب سامنے آجائے۔ مبہم الفاظ اور غیر متعین مفہوم کبھی نتائج کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ ہے اصل وجہ اس امر کی کہ مسلمان "مذہبی احکام" کی پابندی نہیں کرتے۔ مبہم الفاظ سوچنے والے ذہن کے لئے کبھی وجہِ کشش نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف وہی طبقہ متمسک رہ سکتا ہے جس کا ذہن ہنوز "عہدِ طفولیت" میں ہو۔ سوچنے والا ذہن، کتاب (حکم) کے ساتھ اس کی حکمت (لم) کا بھی تقاضا کرتا ہے اور حکم کی لم اس کے نتیجہ ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ دین (نظامِ زندگی) نتائج پیش کرتا ہے اور یہی نتائج اس کی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔

ثواب کے معنی

اس تمہید کے بعد لفظ ثواب پر غور کیجئے۔ ثاب کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا لوٹ کر آجانا۔ کسی حوض کا اس طرح لبالب بھرے رہنا کہ جتنا پانی اس میں سے نکلے اتنا ہی اس میں واپس آتا رہے۔ استثاب کہتے ہیں (RESTORATION) کو۔

آپ کوئی کام کیجئے۔ اس میں کچھ نہ کچھ صرف ہوگا، مال، وقت، توانائی (ENERGY) ذہنی ہو یا جسمانی۔ اگر اس کام کا نتیجہ، اس صرف شدہ توانائی کو واپس لے آتا ہے، تو وہ نتیجہ اس کا ثواب ہوگا۔ ثاب جسمہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جسم سے جس قدر توانائی زائل ہو جائے ـــــ وہ پھر واپس آجائے اور اس طرح جسم تنومند اور توانا رہے۔ آپ صبح سے شام تک کوئی کام کرتے ہیں جس کے معاوضہ میں آپ کو کچھ روپیہ ملتا ہے لیکن اس کام کے کرنے میں آپ کی توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ اچھی غذا کھاتے ہیں جس سے آپ کی صرف شدہ توانائی واپس مل جاتی ہے۔ اس طرح آپ کے اس طریقِ کار کی رُو سے آپ کی توانائی بھی برقرار رہتی ہے اور جو کچھ آپ کماتے ہیں وہ آپ کا منافع ہوتا ہے۔ اوّل الذکر (توانائی کے واپس آجانے کو) ثواب کہتے ہیں اور ثانی الذکر (حاصلِ محنت) کو فوز (ACHIEVEMENT) یا مثلاً آپ سیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی کچھ توانائی (ENERGY) صرف ہوتی ہے لیکن وہ سیر آپ کی صحت کے لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ وہ صرف شدہ توانائی کو واپس لاتی ہے اور آپ کی صحت کو بھی درست کرتی ہے جس سے آپ کی نشو و نما ہوتی ہے۔ یہ سیر کا ثواب اور فوز ہے۔ اسلام کے نظام (الدّین) میں ہر فرد اپنے مفوّضہ فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان افراد کا وقت، مال، توانائی، ذہنی اور قلبی قوّتیں صرف ہوتی ہیں۔ اس نظام کے اجتماعی نتائج ان صرف شدہ قوّتوں اور قدروں کو بھی واپس دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ارتقائے انسانیّت کا وہ مقصدِ کلّی بھی پورا ہوتا (اور آگے بڑھتا) رہتا ہے جس سے انسان کارگہِ عالم کے تخلیقی پروگرام میں خدا کا رفیق بنتا ہے۔ اس قرآنی نظامِ زندگی کے نتائج کو "ثواب اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ:۔

ثَوَابُ اللّٰہِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (۲۸/۸۰)

جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور اس کے بعد ایسے کام کئے جو انسانی معاشرہ میں ہمواری کا موجب ہوں تو ان کے لئے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہوں گے۔

لہٰذا "ثواب اللہ" کے معنی ہیں اُس نظامِ زندگی کے جیتے جاگتے نتائج، جو قرآنی اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔

دنیا کے عام نظامہائے معاشرت (جن کی اساس مستقل اقدار پر نہیں ہوتی) طبعی قوانین کے مطابق اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ جو شخص اچھی خوراک کھائے گا، تندرست و توانا رہے گا۔ لیکن ان نتائج کا تعلق انسان کے پیش پا

قریبی مفاد

افتادہ مفاد تک محدود ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی جوئے رواں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ انھیں قرآن ثوابَ الدُّنیا کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ذرا سوچو! یہ تمھاری کس قدر بھول ہے کہ تم اتنی تگ و تاز بھی کرتے ہو لیکن اس کے بعد صرف قریبی مفاد پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ اگر تم اپنے معاشرے کو مستقل اقدار (وحی) کے خطوط پر متشکل کر لو تو اسی تگ و تاز سے یہ قریبی مفاد بھی حاصل ہو جائیں اور ان کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا جائے۔ ان نتائج کا نام ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡیَا جو لوگ صرف قریبی مفاد تک ہی رک کر رہ جاتے ہیں، ان سے کہو کہ فَعِنۡدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ط (۴/۱۳۴) کہ نظامِ خداوندی میں قریب اور بعید دونوں کے مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ سو بتاؤ کہ یہ نظام اچھا ہے یا تمھارا نظام؟ ظاہر ہے کہ نظام وہی اچھا ہوگا جس کے نتائج کا سلسلہ حیاتِ انسانی کے ساتھ ساتھ مسلسل قائم رہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اپنے سامنے ہمیشہ یہ آرزو رکھو۔ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً۔ یعنی دنیا اور آخرت دونوں میں خوشگوار اور حسین زندگی۔ قرآن کی

مستقبل کی درخشندگی

رُو سے نظامِ زندگی کے تین انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ نظام جس کے خوشگوار نتائج انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں چلتے رہیں اور اس طرح یہاں سے وہاں تک شاہراہِ حیات شگفتہ و شاداب رہے۔ یہ ہے الدّین کا وہ نظام، جس میں ثواب الدنیا والآخرۃ دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا نظام وہ ہے جسے دنیا کی قومیں اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت وضع کرتی ہیں اور اپنی نگاہوں کو صرف اسی زندگی تک محدود رکھتی ہیں۔ اس نظامِ زندگی کے نتائج اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں۔ وَمَا لَہٗ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنۡ خَلَاقٍ (۲/۲۰۰)۔ اس کے بعد کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ خالص دنیاداری کی زندگی ہے۔

نہ یہ، نہ وہ تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں، نہ اس کے بعد کی زندگی کی۔ یہ ہے "مذہب کی زندگی"۔ اس زندگی میں انسان اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی ذلت و خواری کی زندگی ہے تو کوئی بات نہیں۔ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے بعد حیاتِ ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگواریوں کے ہم ہی مالک ہیں لیکن قرآن کی رو سے یہ بہت بڑا دھوکا ہے، نفس کا فریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ کیا تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے کاموں کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ الذين ضل سعيهم في الحيٰوة الدنيا یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیاوی زندگی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صنعا لیکن وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قانونِ خداوندی کا عملی انکار کرتے ہیں، اس طرح کہ حقائق کا آمنا سامنا کرنے (TO FACE REALITIES) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں نکال لیتے ہیں۔ فحبطت اعمالهم ان کے کام بظاہر بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ۝ (۱۸/۱۰۳-۱۰۵) یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ ظہورِ نتائج کے سلسلے میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں۔ مذہب پرست طبقہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ سہی، آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں لیکن یہی ان کی بھول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ ۱۷/۷۲ اس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفرازیاں انہی کے حصے میں آجائیں۔ لہٰذا

۱۔ اسلام کے نظامِ حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں۔

۲۔ عام دنیاوی نظام میں صرف امروز خوشگوار ہوتا ہے۔

۳۔ اور انسانوں کے خود ساختہ "مذہب" کی دنیا میں نہ آج خوشگوار ہوتا ہے نہ کل۔ ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے اور بس۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ مسلمان صدیوں سے اس مقدس دھوکے میں مبتلا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے ثواب کے معنی کیا ہیں، یعنی

اعمالِ حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آجائیں اور جس سے ہماری دنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہو اور موت کے بعد کی زندگی بھی۔

جو اعمالِ حیات اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے، یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اب آپ اپنے لئے خود میزان قائم کرکے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے اور کون کون سے ایسے ہیں جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ ملّا سے نہ پوچھ

نظریۂ ارتقاء اور قرآن

نومبر ۱۹۵۱ء

قرآن سے پہلے دنیا، بالواسطہ یا بلاواسطہ، مفکرینِ یونان کے نتائجِ فکر سے متاثر تھی۔ اس فلسفہ کی رُو سے کائنات کا تصوّر سکونی (STATIC) تھا، یعنی یونان کے فلاسفر یہ کہتے تھے کہ کائنات کسی وقت، کسی طرح مکمل شکل میں وجود میں آگئی تھی اور اب ایک بے جان ڈلے کی طرح فضا کی پہنائیوں میں چپ چاپ پڑی ہے۔ نہ اس میں کوئی ترقی ہے نہ اضافہ، نہ تغیر ہے نہ تبدل۔ اسے جو کچھ بننا تھا بن چکی۔ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس میں اگر حرکت ہے تو وہ بھی دَوری (CYCLIC) یعنی کولھو کے بیل کی طرح ایک دائرہ میں گردش کرتی ہوئی جس میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔

کائنات کا تصوّر

قرآن نے اس نظریہ کا ابطال کیا ہے اور کہا کہ کائنات کا تصوّر سکونی نہیں بلکہ حرکیاتی (DYNAMIC) ہے۔ ہیولائے کائنات ایک بننے والی شے کے خمیر کی شکل میں وجود میں آیا اور اب کائنات مسلسل تغیر و تبدل سے اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی، اپنے منتہیٰ کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ خالقِ کائنات اس ہیولیٰ کو وجود میں لانے کے بعد معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا، بلکہ وہ اس میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ (۳۵/۱) "وہ اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق مخلوق میں برابر اضافے کرتا رہتا ہے۔" صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ ایسا تغیر و تبدل کہ ہر وہ شے جو باقی رہنے کے قابل نہیں رہتی، اسے مٹا دیا جاتا ہے ——— اور جس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اسے مستحکم کر دیا جاتا ہے (یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۚ (۱۳/۳۹)) مٹایا اُسے جاتا ہے جس کا نتیجہ منفیانہ (یا تخریبی) ہو۔ اسے قرآن کی

اصطلاح میں "باطل" کہا جاتا ہے اور قائم اسے رکھا جاتا ہے جس کا اثر تعمیری ہو۔ اسے "حق" کہتے ہیں۔
سورۂ شوریٰ میں ہے:-

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۴۲/۲۴)

خدا اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق تخریبی عناصر کو مٹا دیتا ہے اور تعمیری عناصر مستحکم کرتا ہے۔
کائنات میں یہ سلسلۂ تغیر و تبدل، یہ عملِ محو و تثبیت، کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آرہا ہے کہ سطحی آنکھ اس تماشائے تحوّل و تدرّج سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ تبدیلیاں اتنے طول طویل عرصوں کے بعد ظہور میں آتی ہیں کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے محققین و مکتشفینِ علومِ طبیعی کو ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفۂ فطرت کے اوراق و خزائن و دفائنِ ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ قرآن نے کائنات کے ان تدریجی مراحل کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ وہ کہتا ہے:-

تدریجی ارتقاء

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (۳۲/۵-۶)

اللہ ایک امر (اسکیم) کی تدبیر بلندیوں سے پستیوں کی طرف کرتا ہے۔ (یعنی وہ نہاں خانۂ قانونِ خداوندی سے اتر کر اپنے طبعی نقطۂ آغاز کے مقام پر آجاتی ہے) پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایسے طویل المیعاد عرصوں (یوم) میں جن کی مقدار تمھاری گنتی کے اعتبار سے ہزار ہزار سال ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ خدا جو ہر شے کی موجودہ اور آنے والی حالت سے باخبر ہے۔ جو ہر شے کی نشوونما کے لئے اسے ایک (PATTERN) عطا کرتا ہے۔ (رحیم) اور پھر اسے اپنے نظام کی قوّت سے تکمیل تک پہنچاتا ہے۔

یعنی مشیّتِ ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے، جسے اس کی انتہائی پستی (نقطۂ اوّلین، سب سے نچلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں، نشوو ارتقاء کے مراحل طے کرتی، اس قالب (رحم یا (PATTERN)) میں جو اس کی نمود اور پختگی کے لئے تجویز کیا جاتا ہے، اپنی تکمیل کے نقطۂ آخریں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے لمبے "ایام" (PERIODS) میں طے ہوتے ہیں۔

کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ، کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا۔ فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ (۷۰/۴) کارگہ مشیت کے ان عظیم المرتبت امور (SCHEMES) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق بھی ہے۔ یہی اسکیم سرِ دست ہماری زیرِ نظر بحث کا محور ہے۔

انسانی تخلیق

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب اس کتابِ تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف اُلٹتا ہے تو اس کی نگہِ استعجاب کا اس مقام پر جا کر رُک جانا ضروری ہے، جسے وہ اس سلسلۂ تخلیقِ انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیٔ حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تحیّر بجا اور تعجّب درست ہے۔ انسانی تحقیق و تفتیش کا ماحصل، اس کے تمام انکشافات و ایجادات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہِ عالم کے مختلف پُرزوں کے اسباب و علل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنے مژگانِ کاوش سے اٹھا لیتا ہے لیکن جہاں اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے، اس کی نگہِ تجسس کے سامنے پردۂ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقامِ تحیّر و استعجاب انسانی علم و تحقیق کی نسبت سے متعین ہوتا ہے، یعنی جس قدر علم و دانش کی منازل آگے بڑھتی جائیں گی، اسی نسبت سے یہ نظام بھی آگے سرکتا جائے گا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادّہ پرست اور ایک حق شناس عبدِ مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اوّل الذکر اس مقام سے آگے وادیٔ حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچ کر بلا تامّل پکار اُٹھتا ہے کہ اس سلسلۂ دراز کی ابتدا اس قادرِ مطلق کی اسباب فراموش مشیّت اور علل ناآشنا صمدیت کی رہینِ منّت ہے جو انسانی سلاسلِ اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے۔ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی، جو اس خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ و تار ہو چکی تھی، اس مردِ خود آگاہ و خدامست کی مشعلِ ایمان و شمعِ ایقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا انسان

"سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود پذیر ہوگیا۔ یہ مقامِ تحیّر ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ انسان نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گرد و پیش

ایک نگارخانۂ حیرت دیکھا۔ سطحِ ارض کی حدود فراموش وسعتیں، فضائے آسمانی کی ناپید اکنار پہنائیاں، سامنے ایک خوفناک بحرِ متلاطم، دائیں بائیں لرزہ انگیز دیو ہیکل سلسلہ کوہ اور ایک معلق و مہیب چھت۔ افق کے پار سے ہر صبح ایک انگارۂ آتشیں کی نمود اور ہر شام شفق کی جوئے خونیں میں اس کا غروب، محفلِ انجم کی شمع فروزاں، کہکشاں کی گردِ مرمریں، چاند کا ساغرِ نور۔ وہ اس طلسمِ ہوش ربا کو دیکھتا، تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا کہ کائنات کا یہ محیّر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آئی ہے، پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں؟ سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند، یہ تارے، یہ دریا، یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار اسے ایک نئی دنیائے حیرت میں چھوڑ جاتے۔ وہ بے چارہ کیا سمجھ سکتا کہ

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

اور جب وہ عام عالمِ آفاق کے متعلق کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کی تخلیق کس طرح سے ہو گئی تو بھلا اس معمّہ کو کیسے سلجھا سکتا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے کہ سب سے پہلے، کسی نہ کسی طرح ایک مٹی کا پتلا بن گیا ہو گا جس میں جان ڈال دی گئی ہو گی اور پھر اس پتلے کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی گئی ہو گی[1] اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ وہ بے چارہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا لیکن جب انسان اور آگے بڑھ کر، اپنے عہدِ شعور کو پہنچا، تو اس کے زمانۂ طفولیت کی یہ توجیہہ اس کے لئے باعثِ طمانیت اور وجۂ شکیبائی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے اضطراب نے کاوشِ تجسس و خلشِ تحقیق کی صورت اختیار کی اور اس علم الاشیاء کی مدد سے جو اس کے لئے وجۂ امتیاز بنایا گیا تھا، (۲/۳۱) اس نے ان پیچ در پیچ رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ اس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے آج نظریۂ ارتقا (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تفاصیل طویل ہیں لیکن ان کا ماحصل یہ ہے کہ

۱۔ صفحۂ ارض پر زندگی (LIFE) کی ابتداء پانی سے ہوئی ہے۔

۲۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اولین کو پیکر عطا ہوا۔

۳۔ زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

۴۔ ان جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

۵۔ ان طویل المیعاد مراحل کو طے کرکے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے "تخلیق بذریعہ تناسل" کہتے ہیں یعنی حیوانی زندگی۔

۶۔ حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بہ منزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔ اس طرح نوعِ انسانی کی ابتداء ہوئی۔

اب دیکھئے قرآنِ کریم اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ تخلیقِ انسانی کی اسکیم کا آغاز درجۂ جمادات (طین۔ مٹی) سے ہوا۔

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔

اس اجمال کی تفصیل قرآن کے دیگر مقامات میں موجود ہے لیکن میرے پیشِ نظر چونکہ استیعاب نہیں، اس لئے میں ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

اس منزلِ جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطۂ آغاز ہے) زندگی محوِ خواب تھی۔ (کنتم امواتا (۲/۲۸)) اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ٥ (۲۱/۳۰)

اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا۔ کیا یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

سرچشمۂ حیات

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی تحقیق اس نقطہ پر پہنچی ہے کہ حیات کے جرثومۂ اوّلین (PROTOPLASM) کی ابتدا سمندر میں ہوئی ہے۔ اسی لئے اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ یوں تخلیقِ انسانی کا قافلہ وادیٔ خاک سے منزلِ آب کی طرف منتقل ہوا۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا ط وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ٥ (۲۵/۵۴)

اور اللہ وہ ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر اس کے رشتے اور ناتے بنائے اور تیرا رب (ہر بات پر) قادر ہے۔

پانی اور مٹی کے "خلاصہ" کے امتزاج سے اس جرثومہ نے خلیہ (CELLS) کی شکل اختیار کی۔ جس کے ہیولیٰ کو قرآنِ

ؔ۱ خلیہ (CELL) مرکب ہوتا ہے مادۂ خمر NUCLEUS اور پیکر (CELL BODY) سے۔

کریم نے طینِ لازب (کیچڑ کی سی چپ چپی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝ (۳۷/۱۱)

ہم نے انھیں طینِ لازب (چپ چپی مٹی) سے تخلیق کیا ہے۔

طینِ لازب یہ طینِ لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہہ میں اور جوہڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی (کالی بھجنگ) مٹی بڑی سخت ہوجاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ (۱۵/۲۶) (نیز ۵۵/۱۴)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومۂ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ان خلیات (CELLS) میں ایک لیس دار مادہ (NUCLEUS) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے، جیسے ایک ننھا سا بیج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمود و شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ حیات کا نقطۂ آغاز یہی نفسِ واحدہ (LIFE CELL) ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ اس "نفسِ واحدہ" سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹیں

شجرِ ارتقاء اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطحِ ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (SPECIES) سمجھیے جو بڑھتی، پھولتی پھلتی، اپنی اپنی سمت میں، نشو و ارتقاء کے منازل طے کئے جارہی ہے۔ ان تمام شاخوں میں سربلند وہ شاخ ہے جو اس "نفسِ واحدہ" کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی، درجہ بدرجہ، قدم بہ قدم، جادہ بہ جادہ، منزل بہ منزل انسانی پیکر تک آپہنچتی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ (۷۱/۱۳، ۱۴، ۱۷)

تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزو مند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمھیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے اور تمھیں زمین سے اگایا ہے۔ ایک طرح کا اگانا۔

اس خوردبینی "نفسِ واحدہ" سے سلسلۂ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشاۃِ اولیٰ کے بعد وہ "نفسِ واحدہ" مختلف منازل میں ٹھہرتا ہوا اور آگے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اس پیکرِ بشریت کے مقام تک آپہنچا، جو اس حیاتِ ارضی میں اس کی جائے

قرار ہے۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ؀ (۶/۹۹)

وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشو ونما دی۔ پھر تمہارے قرار پانے کی جگہ (مستقر) اور سپردگی کا مقام (مستودع)[1] ہے۔ بلاشبہ ہم نے اپنی آیات سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے تفصیل کے ساتھ بیان کردی ہیں۔

اس انتقالِ مکانی، یعنی ایک مستقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں، قرن ہا قرن (الف سنۃ) گزر گئے اور یوں جراثیمِ حیات (LIFE CELLS) کے ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ؀ (۳۲/۸)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

حیوانی زندگی کی ابتداء

یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزار کر ہزار ہا سال کی تشکیل و تدبیر، ساخت و بافت کے بعد، اس کا سلسلہ ایک حقیر پانی کے نچوڑ سے جاری رکھا، یعنی حیوانی زندگی کا سلسلۂ افزائشِ نسل۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ؀

(۲۳/۱۲-۱۳)

اور دیکھو واقعہ یہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نطفہ سے بنایا ایک ٹھہر جانے اور دباؤ پانے کی جگہ میں۔

قافلۂ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی، اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

---

[1] غور فرمائیے قرآنِ کریم نے جائے قرار کو صرف امانت گاہ (مستودع) کہہ کر کس طرح اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے کہ موجودہ پیکرِ بشری میں حیات بطورِ امانت رکھی گئی ہے۔ حیات اس کی پیدا کردہ نہیں، نہ ہی اس کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ (۲۴/۴۵)

اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں بلکہ پرندے بھی، یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلۂ افزائش بذریعہ تناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زندگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں اِدھر اُدھر پھوٹیں۔ اس لئے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی قافلہ کے مختلف افراد ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ (۶/۳۸)

اور زمین پر چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں، جو تمہاری ہی طرح گروہ (امّت) نہ ہو۔ اور ہم نے نوشتہ (الکتٰب) میں کوئی بھی بات فروگذاشت نہیں کی۔ پھر (سب) اپنے رب کے حضور میں جمع کئے جائیں گے۔

نر و مادہ کا امتیاز | یہ وہ مقام ہے جہاں ذکور و اناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر سامنے آتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ (۳۵/۱۱)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے، پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیاتِ حیات (LIFE CELLS) میں جنسی تخلیق (SEXUAL REPRODUCTION) نمایاں ہوگئی۔ یہ جرثومے (GERM CELLS OR GAMETES) دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک (OVUM) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا (SPERMATOZOON) نر کا خلیہ۔ یعنی ایک جرثومۂ زندگی، ذوقِ تخلیق سے نر اور مادہ کے خلیوں میں بٹ گیا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۷/۱۸۹)

اللہ وہ ہے جس نے تمھیں نفسِ واحد (جرثومۂ حیات) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔
وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ (۵۱/۴۹)
اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے (اور ان امور کا ذکر اس لئے کیا کہ تم) اس سے بھولی ہوئی حقیقتوں کی یاد تازہ کر سکو۔

اس نفسِ واحدہ نے پیکرِ حیوانی میں بھی قرن ہا قرن گزارے۔ ان ادوار میں "انسان" ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔
هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ○ (۷۶/۱)
کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا، جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

پیکرِ انسانی

حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو اُبھری۔ یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی۔ پیکرِ حیوانی کو بتدریج سنوارا گیا۔ اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے اس کے لطیف و نازک جوہروں میں جلا دی گئی اور یوں عروسِ حیات حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔
الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ○ (۸۲/۷)
وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر (ہر طرح) سے درست کیا۔ پھر (اعضاء و جوارح میں) تناسب پیدا کیا۔

پھر اسے احسنِ تقویم عطا فرمائی۔
لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ○ (۹۵/۴)
اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا۔

یہ احسنِ تقویم کیا ہے؟ اس بہترین ہیئت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟ وہ کون سا جوہرِ خصوصی ہے جس کی بنا پر انسان سلسلۂ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے الگ تھلگ حیثیت کا مالک بن گیا؟ اسے قرآنِ کریم نے ایک لفظ میں بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی لفظ اس کی امتیازی خصوصیت کو ایک نمایاں جامعیت سے ادا کر سکتا ہے۔ فرمایا۔ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ (۳۲/۹) "پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی"۔ یعنی شجرِ ارتقاء کی اس شاخِ بلند و بالا کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی۔ اسے سنوارا اور آگے بڑھایا اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجۂ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی قوت کا شمہ ڈالا۔ اب وہ دیکھنے، سننے، اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔

شرفِ انسانیّت

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ○ (۳۲/۹)

اور اس نے تمہارے لئے سمع، بصر اور قلب بنایا لیکن تھوڑے ہیں جو شکرگزار ہیں۔

یہ "روحِ خداوندی" کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے ایک پیکرِ آب و گل کو کائنات کا جانِ مدعا بنا دیا؟ اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں .... اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس "نفخِ روح" سے حاصل کیا ہوا؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و قلب عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں لیکن غور سے دیکھئے تو شرف و مجدِ انسانیّت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آئی ہے۔ دنیا میں یہی ذرائعِ علم ہیں اور علم ہی وہ امتیازِ خصوصی ہے جس نے انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے نمایاں طور پر الگ کر دیا ہے۔ اس سمع و بصر سے انسان کن ذمہ داریوں کا حامل بن جاتا ہے۔ یہ پھر قرآن ہی کی ایک آیۂ مقدسہ میں دیکھئے، فرمایا:-

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ○ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ (۷۶/۳-۲)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جو باہم مل جانے والا ہوتا ہے۔ (پھر اسے) ہم مختلف حالتوں میں متغیر و متبدل کرتے رہے۔ (حتیٰ کہ) اسے سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا راستہ دکھا دیا۔ خواہ اسے قبول کرے یا اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ کا جوہر

یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرتا ہے، یعنی عقل و شعور اور اس کی بنا پر اختیار و ارادہ۔ اس مقام پر پہنچ کر سلسلۂ ارتقاء کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ انسانی پیکر اپنے سلسلہ کے گذشتہ طبقات کی استعداد اور صلاحیتوں کا حاصلِ جمع (SUM-TOTAL) نہیں، بلکہ یہاں پہنچ کر ان تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں ایک اور ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقاء کے اس سلسلہ سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آ رہا تھا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے جس سے نبضِ کائنات میں تموّج اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں، چرندوں پرندوں کا بے کیف مسکن (ZOO) رہتی۔ حسن کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتشِ سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب "نفخِ روح" کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ ویرانہ، رنگ و تعطّر کا کاشانہ بن گیا۔ یہی وہ "نفخِ روح" تھی جس

سے یہ آدمِ خاکی مسجودِ ملائکہ قرار پایا۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (۳۸/۷۲-۷۱)

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے (مختلف مراحلِ ارتقاء کے بعد) سنوار دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے جواب اس سوال کا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود میں آ گیا؟ کیسے کہ عقل و علم، دانش و بینش اور علوم و فنونِ متعلقہ اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکے ہیں اور یہ تبیانِ حقیقت ہوا کس زمانے میں؟ اس وقت جب دنیا سائنس اور اس کے مکتشفات سے آشنا تک نہ تھی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر نگہِ بازگشت ڈالئے اس آیۂ مقدسہ پر جس سے اس موضوع کی ابتداء ہوئی ہے۔ نگہ ڈالئے اور غور کیجئے کہ یہ پوری کی پوری داستانِ طول طویل کس حسن و اعجاز نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

ارشاد ہے:-

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ... الَّذِىْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○ (۳۲/۹-۵)

اللہ اپنے امر (اسکیم) کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا ہے۔ پھر وہ اسکیم (اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے) اس کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ ایک (ایک) یوم (منزل) میں جس کی مقدار تمہاری گنتی کے لحاظ سے ہزار (ہزار) سال کی ہوتی ہے۔ (مثلاً) وہ ذات جس نے اپنی مخلوق میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا کیا اور انسان کی پیدائش کی ابتدا مٹی سے کی۔ پھر اسکی نسل کو حقیر پانی کے خلاصہ سے بنایا۔ پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے تمہارے لئے سماعت و بصارت اور قلب بنایا لیکن بہت تھوڑے (انسان) ایسے ہیں جن کی مساعی ثمر بار ہوتی ہیں۔

اس سلسلۂ ارتقاء سے نوعِ انسانی وجود پذیر ہوئی۔

لیکن قرآنِ کریم تخلیقِ کائنات اور تشکیلِ انسانی (سلسلۂ ارتقاء) کے ان اصولوں کو اس لئے بیان نہیں کرتا کہ اسے طبیعیات کے طالب علموں کے لئے نصاب کی کتاب بننا تھا۔ ان تفصیلات سے اس کا مقصود کچھ اور ہے۔ وہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد، انسان سے کہتا ہے کہ ذرا غور کرو کہ کائنات میں محو و تثبیت اور فنا و بقا کا کون سا اصول کام کر رہا ہے اور کس جبروت و اقتدار سے کام کر رہا ہے۔ یہ ایسا بطشِ شدید و اخذِ وبیل کا قانون ہے جس کی گرفت سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ (۱۲/۸۵ + ۱۶/۷۳)

اعمالِ صالحہ سے مراد

وہ قانونِ ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشیں کرتا ہے کہ اس کارگہِ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو۔ (جس کے اعمال صالح ہوں) وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ وہ دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم الشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں، کتنے پھول تھے جو مرجھا مرجھا کر زمین پر آ لیے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آ کر مسلے گئے۔ اس کے برعکس، کتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں، کیسے کیسے شگفتہ اور نورستہ پھول لائیں اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھل پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور سوچو کہ اقوام و مللِ گزشتہ کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی، فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ اس فیصلہ (یعنی ان کے اعمال کے ظہورِ نتائج) میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ۝ (۷/۳۴)

اور ہر اُمّت (گروہ، جماعت، نوع) کے لئے (ظہورِ نتائج) کا وقت معیّن ہے۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

اس اصولی نکتہ کو بیان کر دینے کے بعد اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے ارشاد فرمایا:-

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ؁ (۷/۳۵)

اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں اور میرے قوانین سے تمھیں مطلع کریں، سو (اس وقت) جو ان قوانین کی نگہداشت کرے گا اور (یوں اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی) صلاحیت پیدا کرلے گا تو اس پر (مٹنے اور زوال پذیر ہو جانے کا) کوئی غم اور اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ تو ہیں وہ جو باقی رہیں گے، آگے بڑھیں گے، جنھیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا۔ برعکس ان کے

وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَکْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ؁ (۷/۳۶)

لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو وہ لوگ اہلِ جہنم ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اصول

غور فرمائیے۔ پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصولی قانون بیان فرما دیا۔ اس کے بعد اس کی وضاحت کر دی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون و بے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کون سا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن و سلامتی کی جنّت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقعہ نہیں۔ یہاں صرف اتنا دیکھئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس ضابطہ کو نصب العینِ حیات بنایا جائے جو حضرات انبیاء علیہم السّلام کی وساطت سے اللہ تعالےٰ کی طرف سے انسانوں کو ملا ہے۔ وہ نظام، جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی مخالف قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے اور اسے کسی قسم کا خوفِ ہلاکت و حزنِ بربادی نہ رہے۔ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔) اگر وہ ایسا نہ کرے گی تو خدا کا قانونِ استخلاف و استبدال (LAW OF SUCCESSION AND SUBSTITUTION) اپنا اٹل فیصلہ کر دے گا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آ جائے گی۔

وَرَبُّکَ الْغَنِیُّ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْکُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِکُمْ مَّا یَشَآءُ کَمَآ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ؁ (۶/۱۳۳-۱۴/۱۹-۳۵/۱۶)

اور (دیکھو) تیرا پروردگار بے نیاز ہے۔ (اس لئے وہ اپنے قوانین کے نفاذ میں کسی کا محتاج نہیں اور
کسی سے دبتا نہیں) اور رحمت والا ہے۔ اگر وہ چاہے (تو اپنے قوانین مشیت کے ماتحت) تمھیں
ہٹادے اور تمھارے بعد اس قانون مشیت کے مطابق جس قوم کو چاہے، تمھارا جانشین بنا
دے۔ جس طرح اس نے ایک دوسری قوم کی ذریت سے تمھیں اٹھا کھڑا کیا ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ۝

(۴۷/۳۸) (نیز ۵۶/۶۱، ۴۱/۷)

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمھاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا اور
وہ قوم تمھارے جیسی نہیں ہوگی۔ (بلکہ تم سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے وہ تمھاری جگہ لے گی۔)

مغنیِ آتش نفس موسیقار کی طرح، ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کوش ہوتی ہے۔ مٹنے والی قومیں
مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند اورا ـ وزہماں آب و گل ایجاد جہاں نیز کنند

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، اس نکتہ کی تشریح کا یہ موقع نہیں کہ وہ نظام جس سے قوموں کو ثبات و استحکام حاصل ہوتا
ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں لیکن اس ضمن میں ایک اصولی گوشہ ایسا ہے جس کی طرف اشارہ کئے بغیر آگے
بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مغرب کے نظریۂ ارتقاء کی رو سے بقا (SURVIVAL) کے لئے اصلح
(FITTEST) ہونا ضروری ہے لیکن قرآن کی رو سے قانونِ بقا و استحکام کے لئے اصلح کے ساتھ ساتھ
انفع ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بقا اس کا حصہ نہیں جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ
یہ سعادت اس کی "قسمت" میں آتی ہے جو اپنی ذات میں محکم و خود گیر ہونے کے بعد، نوعِ انسانی کے لئے سب
سے زیادہ نفع رساں ہو۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:۔

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ (۱۳/۱۷)

یاد رکھو! کرۂ ارض میں قیام و بقا اس کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع
پہنچانے والا ہے۔

بقاالاصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے نظریہ نے اقوامِ یورپ کو یہ سبق دیا کہ جو

قوم سب سے زیادہ قوّت سمیٹ لے گی اور رزق کے سرچشموں کو اپنے لئے وقف کرلے گی (خواہ اس سے باقی اقوام کے جسم میں خون کا قطرہ تک بھی باقی نہ رہے) زندگی اور اس کی شادابیاں اس کے حصّے میں آئیں گی۔ انھوں نے اس قانون پر عمل کیا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے ان اقوام پر غلبہ و تسلّط حاصل کرلیا جو قوّتِ تخلیق سے عاری ہو چکی تھیں اور جن میں زندگی کی کوئی صلاحیّت باقی نہیں رہی تھی لیکن چونکہ بقاء الاصلح کے قانون سے بقائے دوام حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ (اس سے حیاتِ خلد کا وہ فریب حاصل ہو سکتا تھا جسے ابلیس نے آدم کے لئے وجہ فسونِ نظر بنایا تھا)، اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد دنیا نے دیکھ لیا کہ ان اقوام کی اصلحیت (FITNESS) کس قدر بے بنیاد ثابت ہوئی۔ قرآن کی رُو سے زندگی کا قانون بقاء الانفع ہے۔ یعنی جو نظام نوع انسان کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو اسی کو باقی رہنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا، مغرب کے قانونِ بقاء الاصلح کا تجربہ کر چکی ہے اور اب اس نظام کی تلاش اور انتظار میں ہے جو خود اپنی ذات ہی میں اصلح نہ ہو بلکہ نوعِ انسان کے لئے بھی انفع ہو۔ قرآن کا مقصود دنیا میں اسی نظام کی ترویج و تنفیذ بھی تھا، جسے میں اپنی تحریروں میں "نظام ربوبیّت"[1] سے تعبیر کرتا چلا آرہا ہوں۔ انسانیّت کا مستقبل اسی قوم کے ہاتھوں میں ہوگا جو اس نظام کی داعی اور حامل ہوگی۔

نظامِ ربوبیت

قانونِ ارتقاء کی رُو سے وہی نوع آگے بڑھ سکتی ہے، جس کی مضمر صلاحیتیں اس قدر نشو و نما حاصل کرلیں کہ وہ تخریبی قوّتوں کی مدافعت کرسکنے کی اہل ہو جائیں۔ نظامِ ارتقاء میں یہ وہ بنیادی اصول ہے۔ جس سے کسی کو رعایت نہیں مل سکتی۔ انسانی معاشرہ میں یہ استعداد صرف نظامِ ربوبیت سے حاصل ہو سکتی ہے جس میں افرادِ معاشرہ کے مضمر جوہروں کی اس قدر آبیاری ہو جاتی ہے کہ وہ یاس و قنوط (ابلیسیّت) کی تمام تخریبی قوّتوں پر غلبہ پاکر زندگی کی بشارتوں سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ خاک کے ذرّے اپنے تدریجی مراحل طے کرکے پیکرِ انسانی میں جلوہ بار ہوگئے۔ اس منزل تک قانونِ ارتقاء طبعی قوانین کے تابع چلتا تھا۔ ڈارون اور اس کے متبعین کی یہ غلط نگہی تھی کہ انھوں نے عالمِ انسانی کو بھی اسی لاٹھی سے ہانکنا چاہا؛ حالانکہ کاروانِ حیات کو وادیٔ انسانیت میں پہنچ کر جداگانہ قوانین کی مشعل ہدایت دی گئی تھی۔ ایک حیوان کی زندگی یکسر انفرادی ہے اور وہ انفرادی طور پر اپنے طبعی تقاضوں (کھانے پینے) کی تسکین سے زندہ رہ سکتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصود ہے۔ لیکن انسان کی زندگی انفرادی زندگی نہیں، بلکہ معاشرتی زندگی ہے اور اس کے تقاضے حیوانی زندگی کے انفرادی تقاضوں

---

[1] اسے الگ کتاب کی شکل میں بھی شائع کردیا گیا ہے۔

سے مختلف ہیں۔ یہ وہ عظیم القدر اہم، لطیف اور مبنی علی الحقیقت فرق ہے، جسے قرآن نے کفر و ایمان اور جنت و جہنّم کے فرق سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (۲۲/۱۴)

یقیناً اللہ ان لوگوں کو جنھوں نے اس کے عطا فرمودہ نظام و قوانین کو نصب العین حیات بنالیا اور پھر ان کی روشنی میں ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کئے، ایسے معاشرہ میں داخل کرے گا جس کی مثال ایسے باغات کی سی ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں تاکہ ان کی شادابیوں اور سرسبزیوں میں کبھی کمی نہ آئے اور اس کا ہر پودا ثمر بار ہو۔" ان کے برعکس، وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲) جو لوگ اس نظام سے انکار کرتے ہیں، وہ اس قسم کا انفرادی نظام قائم کرتے ہیں جس میں سامانِ زیست سے تمتّع اور اکل و شرب بالکل اس انداز سے ہوتا ہے جس طرح حیوانی زندگی کا تقاضا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا معاشرہ جہنمی ہے کہ اس میں بالیدگی اور نشو و نما کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ جاتی ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے:۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجَتْكَ أَهْلَكْنَاهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ٥ (۴۷/۱۳) نیز ۷۸/۲۸ - ۳۰/۹ - ۴۴/۳۵)

اور کتنی ایسی بستیاں ہیں جو قوت میں ان لوگوں سے بڑھ کر تھیں جنھوں نے (اے رسولؐ) تجھے باہر نکال دیا ہے۔ ہم نے انھیں ہلاک کردیا۔ سو کوئی ایسا نہ ہوا جو ان کی شادابی کا سامان پیدا کر دیتا۔

اس لئے کہ ان تمام قوموں نے اپنے معاشرہ کو حیوانی قانونِ ارتقاء پر قائم رکھا جس میں بقا کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کے مطابق ان کی ہلاکت یقینی تھی۔ اس لئے کہ:۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُم (۴۷/۱۴)

جو قوم اپنے نشو و نما دینے والے کے واضح قوانین کی حامل ہو، ان جیسی کبھی نہیں ہو سکتی جن کے اعمال معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کریں اور وہ ایسے مقاصد کے پیچھے چلیں جو پستی کی طرف لے جانے والے ہوں لیکن یہ اعمال و مقاصد انھیں دکھائی دیں بڑے خوش آیند (کیونکہ وہ سمجھ

رہے ہوں کہ یہ اعمال ان کی بقا اور استحکام کے کفیل ہیں۔)

انسانی زندگی میں عروج و زوال، ترقی و تنزل، صعود و ہبوط، آگے بڑھنے اور رک جانے اور رفتہ رفتہ فنا ہو جانے کا یہی اٹل قانون ہے۔ اسی قانون کے مطابق اُمتوں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے رہے ہیں اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ جس قوم نے ایسا نظام قائم کر لیا جو نوعِ انسانی کے لئے انفع ہو (یعنی ان کی ربوبیت کا کفیل) وہ ارتقائے حیات میں ایک منزل آگے بڑھ گئی۔ اسی منزل کا نام جنت ہے۔ یہ نظام صرف قرآن کے متعین کردہ خطوط پر متشکل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی صورت نہیں لیکن جو قوم نہ اپنی ذات کے لئے اصلح ثابت ہوئی نہ نوعِ انسانی کے لئے انفع، اس کی نشوونما کی تمام صلاحیتیں جھلس کر رہ گئیں۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (56/18)

تکملہ | مندرجہ صدر مضمون پڑھ کر ایک صاحب نے لکھا۔
آپ نے لکھا ہے کہ انسان سلسلۂ ارتقاء کی اوپر کی کڑی ہے۔ ارتقاء کا قانون یہ ہے کہ ایک علت (CAUSE) سے ایک معلول (EFFECT) پیدا ہوتا ہے اور یہ سلسلۂ علت و معلول مسلسل آگے چلا جاتا ہے۔ چونکہ انسان کی ارتقاء (بقول آپ کے) مادہ سے ہوئی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ انسان میں مادی تغیرات سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں یہ کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

اگر یہ ارتقاء مادی ہے تو انسان کا مزید ارتقاء بھی مادی ہونا چاہئے۔ کیا صراطِ مستقیم پر چلنے کے یہی معنی ہیں؟ یعنی جس خط پر اس وقت تک ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اسی پر آگے ارتقاء ہو۔

اس کا جواب حسبِ ذیل دیا گیا تھا۔ آپ نے غالباً قانونِ ارتقائے طبعی کا پورا پورا مطالعہ نہیں کیا۔ اس قانون کا اصول یہی نہیں کہ ایک علت سے اسی قسم کا معلول پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ اسی شکل میں جاری رہتا ہے۔ یہ تصور نظریۂ ارتقاء کے ابتدائی دَور کی پیداوار ہے۔ بعد میں سائنس کی مزید تحقیقات نے یہ بتایا کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک علت (CAUSE) اپنے سلسلہ کی کتنی ہی کڑیاں پھاند کر کسی ایسے معلول (EFFECT) تک جا پہنچتی ہے۔ جس کا پہلے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ نتیجہ بالکل انوکھا اور یکسر غیر متوقع ہوتا ہے۔ اس نظریہ کا نام فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) رکھا گیا ہے۔ نباتات میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ

ایک ہی قسم کے بیج سے الگ الگ قسم کے پھول پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں اصطلاح میں (SPORTS) کہتے ہیں یہ واقع بڑا نادرالوقوع ہوتا ہے۔ اس لئے ارباب علم و تحقیق اس قسم (SPORTS) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انسانوں میں ایک فطین یا نابغہ (GENIUS) کی پیدائش اسی قسم (SPORTS) میں شمار کی گئی ہے چنانچہ اس باب میں (HOGBEN) لکھتا ہے :۔

> تیس سال کے گہرے تجربے نے اس امر کے لئے بیّن ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم افراد پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو (MUTANTS) یا (SPORTS) کہتے ہیں۔

(THE NATURE OF LIVING MATTER)

اس قسم ارتقاء سے جو چیز وجود میں آتی ہے، وہ اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سائنس کی تحقیقات نے ایسی اشیاء کی تخلیق اور وجود کا پتہ تو لگا لیا ہے لیکن اس کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکی کہ یہ ہوتا کیسے ہے؟ چنانچہ پروفیسر (TAYLOR) اس باب میں لکھتا ہے :۔

> ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے، ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اپنے نشو و نما کے بعد یہ شے ایک ایسی خصوصیت کی حامل بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی موجود نہ ہو، جن سے یہ شے مرکب تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کا علم ہو جانے کے بعد بھی اس نرالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(EVOLUTION IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE)

ہمارے زمانہ میں اس فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کا سب سے بڑا امام لائیڈ مارگن ہے۔ وہ اپنی کتاب میں (جو اسی نام پر ہے) لکھتا ہے :۔

> اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم (EMERGENT) کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا ؟ تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کبھی

کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ نئے روابط کس طرح ظہور پذیر ہوتے ہیں، ان کے متعلق وائی کونٹ سموئیل کہتا ہے کہ:۔

علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ظہور میں لا سکتا ہے۔ (BELIEF AND ACTION)

ایک نئے عنصر کا ظہور

فجائی ارتقاء کا نظریہ، عصرِ حاضر کے اہم انکشافات میں سے ہے اور اس کے متعلق شرح و بسط سے لکھنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے لیکن ان مختصر سے اشارات سے اتنی بات تو واضح ہو گئی کہ قانونِ ارتقاء صرف وہی نہیں جو آپ کے ذہن میں ہے، اس میں فجائی ارتقاء بھی شامل ہے جس کی رُو سے علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے غیر متوقع عناصر ظہور پذیر ہو جاتے ہیں جن کی تخلیق کے متعلق سائنس کچھ بھی نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیسے ظہور میں آ گئے۔ یہ عناصر سلسلۂ علت و معلول کی سابقہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہوتے ہیں۔ اس تمہید کی روشنی میں انسانی سلسلۂ تخلیق کو دیکھئے۔ پیچھے سے سلسلۂ طبیعی ارتقاء چلا آ رہا ہے۔ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (انسانی تخلیق کی ابتدا جامد مادہ سے ہوئی۔) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ (پھر مختلف ارتقائی منازل کے بعد یہ اس درجہ میں پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعہ حمل ہوتی ہے) یہاں تک عام ارتقائی قانون کی کڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ اس کے بعد یکایک ایک منزل سامنے آ جاتی ہے جو گذشتہ کڑیوں سے یکسر مختلف ہے۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ پھر اس میں اعتدال پیدا کیا اور اس میں "خدائی قوت" کا عنصر پھونک دیا۔ یہ بطریقِ فجائی ارتقاء ہوا۔ اب یہ "تُو" (THOU) کہہ کر پکارنے کے قابل ہو گیا کیونکہ اس میں انسانی خصوصیات کے حامل ذرائع علم و تصور (KNOWLEDGE AND IMAGINATION) اور جذبات کا حامل "دل" پیدا ہو گئے۔ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ (اور تمہارے لئے سماعت، بصارت اور دل بنایا)۔ یہ "نفخ من روحہ" (خدائی قوت کا شمہ) وہ نیا عنصر یا نیا رابطہ ہے جو سابقہ عناصر کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید اور نرالا اضافہ ہے۔ یہی انسانیت کا امتیازِ خصوصی ہے۔ اسی سے انسان صاحبِ اختیار و ارادہ بنا ہے۔ اس کے بعد اس کی ارتقاء کا خط (LINE) وہ نئی بڑی

؎۱ (THOU) کا تخاطب کن انسانی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، اس کے لئے (BUBER) کی کتاب (I AND THOU) دیکھئے

ہوگی۔ جسے نفخ من روحہ نے متعیّن کیا ہے، یعنی انسان کی موجودہ سطح دو حصوں سے مرکب ہے۔ ایک خالص طبیعی ارتقاء کا نتیجہ ہے جسے اس کا طبیعی جسم کہنا چاہیے۔ اس کی نشوونما اسی قانون کے مطابق ہوگی جو حیوانی زندگی کو محیط ہے۔ دوسرا حصّہ وہ جو "نفخِ روح" (خدائی قوّت کی تنفیخ) سے ظہور میں آتا ہے۔ یہ وہ حصّہ ہے جسے انسان کی مضمر صلاحیتیں کہا جاتا ہے۔ حصّہ اوّل (یعنی جسم) درحقیقت ان صلاحیتوں کا مَرکَب یا ذریعۂ شہود (پیکر) ہے۔ اس لئے اصلِ انسانیت یہی صلاحیتیں ہیں۔ (اس کی مزید تفصیل ذرا آگے چل کر آتی ہے) ان کی خصوصیات کا اہم نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے اور جسم اس اختیار و ارادہ کے فیصلوں کو نافذ کرنے کا ذریعہ۔ اب اس کا ارتقاء ان صلاحیتوں کے ارتقاء کا نام ہوگا۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے،۔

ارتقاء کی اگلی منزل

> انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں بلکہ ذہنی اور نفسی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کرکے حیوانیت سے انسانیت کے درجے پر آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دَور میں انسان نے صنعت و حرفت پر پورا کمال حاصل کرلیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کردیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کرکے انسان کے درجہ میں قدم رکھے، پھر اس کی جبلّی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور اسٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہوگا۔

صرف ذہنی اور نفسیاتی ارتقاء نہیں بلکہ ان کے ساتھ انسانی ذات (PERSONALITY) کا وہ ارتقاء بھی جو اس پر اس حقیقت کو منکشف کردے کہ زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے، اس لئے ہر فرد کی اپنی صلاحیتوں کے ارتقاء کا راز تمام افرادِ انسانیہ کی صلاحیتوں کی برومندی میں مضمر ہے۔ (اسی کا نام نظامِ ربوبیّتِ عامہ ہے جس کی طرف میں شروع سے دعوت دیتا چلا آرہا ہوں اور جو قرآنی نظام کا نقطۂ ماسکہ ہے) اسی قسم کے جامع ارتقاء کو (کسی اور موزوں اصطلاح کے نہ ہونے کی وجہ سے) "ارتقائے انسانیت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قرآن نے اس کے لئے تزکیۂ نفس کی اصطلاح استعمال کی ہے[1]۔ لیکن چونکہ تصوراتِ عجم کی بدولت اس اصطلاح کا عام مفہوم غیر قرآنی ہوچکا ہے، اس

---

[1] (REALIZATION GROWTH AND DEVELOPMENT OF NAFS (SELF)) یہ ہیں "تزکیۂ نفس" کے معنی۔

لئے اس اصطلاح کو اس وقت تک استعمال نہیں کرنا چاہیئے جب تک یہ پھر قرآنی مفہوم کی آئینہ دار نہ بن جائے بہرحال اب انسانی ارتقاء اس جدید خط پر ہو گا اور چونکہ قرآن کی رُو سے زندگی صرف یہی طبیعی زندگی نہیں، اس لئے اس ارتقاء کی منازل موت کے بعد بھی طے ہوتی رہیں گی۔

قرآن کا حرکیاتی تصوّر

آپ نے " صراطِ مستقیم " سے جو مفہوم اخذ کیا ہے، وہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ قرآن کی یہ جامع اصطلاح بڑے اہم نکات کی حامل ہے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، قرآن سے پہلے ذہنِ انسانی زندگی کی دَوری حرکت کا قائل تھا، جس میں آگے بڑھنے کا تصور ہی نہ تھا۔ قرآن نے زندگی کا حرکیاتی (DYNAMIC) تصور پیش کر کے یہ بتایا کہ حیات کسی چکر (CYCLIC) میں گردش نہیں کر رہی بلکہ اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا اس کی حرکت آگے بڑھنے کی (PRO-GRESSIVE) ہے۔ صراطِ مستقیم سے اس غلط فلسفۂ حیات (یعنی زندگی کے چکر میں گردش کرنے) کا ابطال اور اس صحیح مقصودِ حیات (یعنی زندگی کے آگے بڑھنے) کا اثبات ہو گیا۔ پھر چونکہ "مستقیم" میں توازن قائم رکھنے کا پہلو بھی مضمر ہے، اس لئے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ زندگی مختلف قوتوں میں توازن رکھتے ہوئے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ "صراطِ مستقیم" پر چلنے سے مراد یہ نہیں کہ زندگی اپنی موجودہ سطح پر چلتی رہے گی۔ زندگی کی راہ سیدھی بھی ہے اور بلندیوں کی طرف جانے والی بھی یعنی ایسا خط جو نچلے نقطہ سے اوپر کے نقطہ کی طرف جائے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴/۱۹) " تاکہ تم طبقاً طبقاً اوپر چڑھتے جاؤ"۔ اس نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا کہ "صراطِ مستقیم" تمہارے اس نشوونما دینے والے (ربّ) کی راہ (قانون) ہے، جو " ذی معارج " (۷۰/۳) ہے۔ یعنی " سیڑھیوں والا خدا "۔ سیڑھی سیدھی بھی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف لے جانے کا ذریعہ بھی۔ (گھسٹتے ہوئے اوپر جانے کا ذریعہ نہیں، بلکہ اُبھرتے ہوئے (JUMP) کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کا ذریعہ) یہ وہ ذریعہ ہے جس سے انسان اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۵/۳۳) یعنی موجودہ زمان و مکان کی حدود سے آگے نکل سکتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ ارتقا اس نظامِ ربوبیت کے بغیر ناممکن ہے جو قرآن کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ اس نظام میں انسانی معاشرہ انہی خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے جن خطوط پر خارجی کائنات خدائی قوانین کے سامنے طوعاً وکرہاً "سجدہ ریز" اپنی ارتقائی منازل طے کئے چلی جا رہی ہے یعنی خارجی کائنات طوعاً وکرہاً مشیت کے پروگرام کو پورا کر رہی ہے لیکن انسان اپنی دنیا میں اپنے اختیار و ارادہ سے اس پروگرام کو پورا کرتا ہے۔ اس طرح خدا اور بندے میں باہمی رفاقت کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے یعنی ایک عظیم القدر پروگرام کی تکمیل میں ایک

دوسرے کے رفیق، بقول علامہ اقبالؒ۔

اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و نہج میں خدا خود بندے کا رفیق بن جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس باب میں پہل کرے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ لیکن اگر وہ اس باب میں پہل نہیں کرتا، اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا، اگر وہ ابھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا، تو اس کی روح، پتھر کی قسادت اختیار کر لیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا بلکہ) جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (تشکیلِ جدید)

پیرگ یونیورسٹی کا پروفیسر ہنس ڈریش (HANS DRIESH) اس مقام کے متعلق کہتا ہے کہ وہاں پہنچ کر ہم اپنے آپ کو خدا کا سپاہی کہہ سکتے ہیں۔ قرآن اس جماعت کو "حزب اللہ" کے نام سے پکارتا ہے (۵/۵۶)۔ یہ "حزب اللہ" وہ معاشرہ ہے جو قرآنی نظامِ ربوبیت کی رُو سے متشکل ہوتا ہے۔ جس چیز کا نام ہم نے "نفخ روحِ خداوندی" کا نتیجہ رکھا ہے، ذرا غور کیجئے کہ اس کی خصوصیت کبریٰ کیا ہے؟ قرآن نے

قوتِ فیصلہ

اس فیجائی ارتقاء کے بعد فرمایا کہ پھر انسان کو سماعت و بصارت اور فوائد مل گئے۔ سماعت و بصارت وغیرہ اس خارجی دنیا کی معلومات حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ معلومات انسان کی داخلی دنیا میں ایک مقام پر پہنچتی ہیں، جہاں سے مختلف امور کے فیصلے ہوتے ہیں۔ "فیصلہ کرنے" کا نام اختیار و ارادہ ہے۔ حیوانات کی نقل و حرکت ان کے جبلّی تقاضوں (INSTINCTS) کی رُو سے ہوتی ہے لیکن انسان کے سامنے بیک وقت ایک سے زیادہ ممکنات (POSSIBILITIES) آتے ہیں۔ ان ممکنات میں سے وہ صرف ایک کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس انتخاب کو فیصلہ کہتے ہیں اور یہ فیصلہ اختیار و ارادہ کی رُو سے ہوتا ہے۔ یہ ایک بنیادی خصوصیت ہے جو انسان کو حاصل ہے۔

انسانی جسم کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔ اس کا کام یہ ہے کہ خارجی دنیا کی معلومات حاصل کر کے "اندر" پہنچا تا رہے اور پھر اندر سے جو فیصلہ صادر ہو اس کی تعمیل کرے۔ اس کے برعکس حیوانی سطح کی زندگی میں تمام تقاضے جسم کے ہوتے ہیں (جنھیں طبعی خواہشات کہا جاتا ہے) اور "اندر" کے فیصلے کو وہاں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اب دو چیزیں ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک حیوانی سطح کی زندگی جس میں جسم کے پورے تقاضے جبلّی طور پر (INSTINCTIVELY) پورے ہوتے رہیں اور انسانی اختیار و ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ ہو۔ دوسرے انسانی سطح کی زندگی، جس میں اصل شے انسانی فیصلہ ہو اور جسم اس فیصلہ کرنے والی قوت کے لئے آلہ اور ذریعہ

کا کام دے۔ اس اعتبار سے انسانی معاشرے کی تین قسمیں ہو جائیں گی۔

۱۔ جس میں نہ جسم کے تقاضے پورے ہوں نہ قوّتِ فیصلہ کے استعمال کے مواقع۔ یہ زندگی انسانی سطح تو ایک طرف، حیوانی سطح سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔

۲۔ جس میں انسانی جسم کے تقاضے تو پورے ہوتے رہیں لیکن انسانی ذات کی تربیت و پرورش کا سامان نہ ہو۔ یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی۔ اور

۳۔ جس میں جسمِ انسانی کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذات کی وسعتیں بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جائیں، یہ انسانی زندگی کی سطح ہوگی۔ قرآن یہی زندگی عطا کرتا ہے۔ اس میں ہر وہ عمل جو انسانی اختیار کو وسعت و تقویت بخشتا ہے 'عملِ خیر' کہلاتا ہے۔ (خیر اور اختیار کا مادہ ایک ہی ہے) لیکن چونکہ اختیار و ارادہ تخریبی مقاصد کے لئے بھی صرف ہو سکتا ہے اور تعمیری کے لئے بھی، اس لئے وہ اختیار و ارادہ کے استعمال کے لئے ایک روشنی، ایک میزان، ایک معیار بھی دیتا ہے تاکہ ہر اختیار تعمیری نتائج کا حامل ہو، تخریبی کا نہ ہو۔ یہ میزان، ضابطۂ آئینِ خداوندی (قرآن) ہے۔

قرآنی معاشرہ

لہٰذا جس معاشرے میں
(ا) انسانی جسم کے تقاضے بطریقِ احسن پورے ہوتے رہیں۔
(ب) انسانی اختیارات کے حدود وسیع سے وسیع ہوتے رہیں اور
(ج) انسانی اختیارات کا استعمال وحی کی روشنی میں ہو۔

وہ قرآنی معاشرہ یا مسلمان کی زندگی ہے۔ اس معاشرے میں انسانیت اپنے ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھے گی۔ اس میں تمام خارجی دنیا کی تسخیر ہوگی۔ (وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (45/14)) اور چونکہ انسانی جسم بھی خارجی (طبیعی) دنیا سے متعلق ہے، اس لئے سب سے پہلے اس کی تسخیر ہوگی۔ یعنی جسم کا کام انسانی قوّتِ فیصلہ (نفس) کے لئے معلومات فراہم کرنا اور اس کے فیصلوں کو جاری کرنا ہوگا، اس قوّت میں جس قدر پختگی اور وسعت ہوتی جائے گی، اسی قدر انسانی زندگی دوام (IMMORTALITY) سے ہمکنار ہوتی جائے گی۔ جب جسمانی نظام طبعی قانون کے ماتحت مضمحل ہو کر منتشر ہو جائے گا، (جسے موت کہتے ہیں) تو اس پختگی اور وسعت یافتہ ذات (نفس) کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کے بعد اسے معلومات فراہم کرنے اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے والا اور نظام مل جائے گا۔

نظامِ ربوبیت

اس قوّت کی پختگی اور وسعت صرف اسی نظام میں ہو سکتی ہے جسے نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی محنت کے ماحصل کو اپنے اختیار و ارادہ سے دوسروں کی پرورش و تربیت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس سے اس کے اختیارات کی وسعتیں زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسانی جسم کے تقاضوں کے پورا کرنے کا انتظام از خود موجود ہو۔ اس نظام میں یہی ہوتا ہے۔ ہر فرد کی بنیادی ضروریات (جسم کے تقاضوں) کے پورا کرنے کا ذمّہ نظام اپنے سر لے لیتا ہے اور افراد اس فکر سے آزاد ہو کر اپنی محنتوں کے ماحصل کو پورے کے پورے معاشرے کی تعمیر و تربیت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ معاشرہ (حزب اللہ) جس کی کھیتی پکتی ہے۔ (هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ) جس کے درخت برگ و بار لاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ جو سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزلوں میں پہنچنے کے اہل ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ نہ تو انسان خالص طبیعی ارتقاء کی آخری کڑی ہے، بلکہ اس کی "انسانیت" طبعی ارتقاء کے سلسلۂ علّت و معلول سے الگ ہے، اور نہ ہی اس کا مزید ارتقاء طبیعی ہوگا۔ طبیعی ارتقاء کی پیداوار صرف اس کا جسم ہے۔ اس میں جوہرِ انسانیّت غیر طبیعی ہے۔ جسمِ انسانی اس جوہرِ انسانیّت کے فیصلوں کے لئے معلومات فراہم کرنے کا ذریعہ اور ان فیصلوں کو نافذ کرنے کا آلہ یا واسطہ ہے۔ اس کے بعد مزید ارتقاء، جسمانی نہیں بلکہ اس غیر طبیعی جوہرِ انسانیّت کا ہوگا۔ جسے ہم موت کہتے ہیں، وہ درحقیقت جوہرِ انسانیّت کا جسم کے آسرے کو چھوڑ دینے کا نام ہے۔ جوہرِ انسانیّت (انسانی ذات) کی نشو و ارتقاء قرآنی نظامِ ربوبیّت سے ہوتی ہے۔ زندہ وہ ہے جس کے اختیار و ارادے کی قوتیں (قرآنی روشنی میں) تمام خارجی کائنات کو (جس میں خود اس کا جسم بھی شامل ہے) مسخّر کئے جاتی ہیں۔ جو اس طرح زندہ ہے وہ موت سے نہیں مر سکتا۔ اسی کا نام سلسلۂ ارتقاء کی اگلی منزل طے کرنا ہے۔

سوچئے کہ ہم میں آج کتنے زندہ ہیں!

آدمؑ

ایک صاحب نے لکھا تھا۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے انسان سلسلۂ ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا اس شکل میں آیا ہے۔ اس صورت میں آدم سے کیا مراد ہوگی؟ کیونکہ اب تک تو یہی سمجھا جاتا تھا کہ ہم سب بابا آدمؑ اور اماں حوّا کی اولاد ہیں، یعنی انسان کے ایک جوڑے سے ساری نسل آگے چلی ہے۔

جواب آدمؑ کے متعلق میں تفصیل سے "ابلیس و آدم" میں لکھ چکا ہوں۔ وہاں سے معلوم ہوگا کہ قرآن کے بیان فرمودہ قصۂ آدم میں، آدم سے مراد کوئی خاص فرد نہیں بلکہ اس سے مراد نوعِ انسانی کا نمائندہ (REPRESENTATIVE OF MANKIND) ہے اور وہ قصہ کسی ایک شخص کی سرگذشت نہیں بلکہ انسانی زندگی کے واقعات و کیفیات کی تمثیلی داستان ہے۔

مملکت کا قرآنی تصوّر

نوشتہ مارچ ۱۹۵۴ء

(کراچی یونیورسٹی کی ہسٹوریکل سوسائٹی کی دعوت پر محترم پرویز صاحب نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۴ء کی شام کو مملکت کے قرآنی تصوّر کے عنوان سے یونیورسٹی کے طالب علموں کے ایک مختصر سے گروپ سے خطاب کیا تھا۔ ان کی اس تقریر کو ان کے اشارات کی رُو سے مرتب کر لیا گیا ہے۔ اگرچہ اس تذکرہ میں انھوں نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس اختصار کے باوجود اس میں وہ بنیادی اصول آگئے ہیں جن کے واضح ہونے کی آج بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کے ان مختصر سے اشارات کو بڑے غور اور فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔)

(طلوعِ اسلام)

عزیزانِ ملت!

آج کے اجتماع کی شرکت میرے لئے دوگونہ خوشی کا باعث ہے۔ ایک تو اس لئے کہ میں اس وقت نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ سے خطاب کر رہا ہوں۔ جیساکہ میں ایک عرصہ سے کہتا چلا آرہا ہوں، قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ ان کی تقدیر کا نوشتہ انہی کی پیشانیوں کی لکیروں میں مضمر ہوتا ہے اور ان کی کشتی کی عافیت کا مدار انہی کی قوتِ بازو پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قوم کے نوجوان طبقہ کو اپنا مخاطب قرار دیا ہے اور حضرت علامہ اقبالؒ کی ہمنوائی میں ہمیشہ اس کی آرزو کی ہے کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

دوسری خوشی یہ ہے کہ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ مملکت کا قرآنی تصور کیا ہے؟ اگر ہماری قوم کا نوجوان طبقہ یہ روش اختیار کرلے کہ زندگی کا جو مسئلہ اس کے سامنے آئے، اس کے متعلق وہ پوچھے کہ قرآن اس کی بابت کیا کہتا ہے، تو مجھے یقین ہے کہ ایک ہی نسل کی زندگی میں ہماری قسمت کا پانسہ پلٹ جائے۔

چونکہ آپ میں پولیٹکل سائنس کے طالب علم بھی موجود ہیں، اس لئے مجھے ان تفاصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ مملکت کے تصور کا تاریخی پس منظر کیا ہے؟ اور اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ مملکت کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ بلند ترین معاشرتی ادارہ جو انسانوں کے تمدنی معاملات کو قانون اور ضابطہ کی رُو سے سرانجام دینے کے لئے وجود میں آتا ہے، اسے مملکت کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا، ہمارے دَور میں مملکت کی تین بنیادی خصوصیات بتائی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مملکت کو مذہب اور اخلاق سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ مملکت ہمہ گیر ہوتی ہے، یعنی وہ افراد کی پوری زندگی پر چھائی ہوئی ہوتی ہے اور اپنے عمل اور فیصلوں کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتی۔ اور تیسرے یہ کہ مملکت اپنی قوت وطنیت کی گروہ بندی سے حاصل کرتی ہے۔

شق اوّل کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ مملکت افراد کے مذہب اور پرائیویٹ کیریکٹر کے معاملہ میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتی لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو اس کا مطلب اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت خود کسی ضابطۂ اخلاق کی پابند نہیں ہوتی۔ مغرب (اور اس کی دیکھا دیکھی باقی دنیا میں بھی) مملکت کی عمارت میکیاوَلی کے نظامِ سیاست کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اس نظام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ مملکت کو ہر قسم کے ضابطۂ اخلاق سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس کا مقصد مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ ہر وہ اقدام جس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے جائز بلکہ مستحسن ہے اور ہر وہ فیصلہ جس سے اس کے مفاد پر زد پڑتی ہے مذموم ہے۔ مصلحت کوشی اس کا ایمان اور مفاد پرستی اس کا مذہب ہے۔ چونکہ اس عقیدہ کی رُو سے مملکت خود اپنے آپ کو کسی اخلاقی ضابطہ یا مذہب کی پابند تسلیم نہیں کرتی، اس لئے وہ افرادِ معاشرہ پر بھی اس قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔ اگر کوئی شخص مملکت کے قوانین کی پابندی کرتا ہے، تو اس کے بعد باقی معاملات میں اسے کھلی چھٹی ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرے۔

جدید مملکت کی دوسری خصوصیت اس کی ہمہ گیری اور کلیت ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ وہ افرادِ مملکت کی زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے معاملات میں مختارِ کُل ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے سے بالا کسی قوت کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس باب میں شخصی حکومت یا جمہوریت میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح ایک مطلق العنان بادشاہ اپنے حکم کو آخری لفظ قرار دے کر نافذ کرتا ہے، اسی طرح جمہوری نظام میں اکیاون فیصدی والے اپنے فیصلہ کو کامل اختیارات

کے ساتھ نافذ کر دیتے ہیں اور وہ اپنے اس فیصلے کے لئے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔

مملکت کی تیسری خصوصیّت جذبۂ وطنیّت ہے۔ اگرچہ آج تک وطنیّت (NATIONALISM) کی کوئی جامع تعریف نہیں ہو سکی لیکن اس کا عمومی مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ ایک خطّۂ زمین میں بسنے والے افراد جو ایک حکومت کے ماتحت زندگی بسر کریں، ایک نیشن (NATION) ہوتے ہیں۔ نیشن کا مفاد باقی تمام مفادات پر غالب ہوتا ہے۔ سب سے بڑی نیکی نیشن کے مفاد کا تحفظ ہے۔ حتیٰ کہ جو وطن پرست (PATRIOT) نیشن کے مفاد کے تحفظ کے لئے جان دے دے اسے شہید سمجھا جاتا ہے۔ اپنی نیشن کے تحفظ کے مقابلہ میں باقی افرادِ انسانیہ کا تحفظ کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں جدید مملکت کی بنیادی خصوصیات۔ قرآن جس بنیاد پر مملکت کی عمارت تعمیر کرتا ہے اس کی رُو سے یہ تینوں خصوصیّات باطل ہو جاتی ہیں۔ وہ مملکت کی عمارت آئیڈیالوجی (IDEOLOGY) پر استوار کرتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس ایک فرق سے جدید مملکت کے تصوّر اور مملکت کے قرآنی تصوّر میں کتنا بنیادی فرق آجاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ قرآنی مملکت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی کہ اس کے افراد کس آئیڈیالوجی کو تسلیم کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن کی رُو سے آئیڈیالوجی ہی کا دوسرا نام دین اور ایمان ہے، اس لئے قرآنی مملکت میں افرادِ مملکت آئیڈیالوجی کے معاملہ میں بے زمام نہیں رہ سکتے۔ اس مملکت میں دو گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ وہ جو قرآنی آئیڈیالوجی پر یقین رکھے اور دوسرا گروہ وہ جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے۔ مملکت کا نظم و نسق پہلے گروہ کے ہاتھ میں ہوگا۔ باقی رہا دوسرا گروہ، سو اس کے تمام انسانی حقوق کی ذمّہ داری مملکت کے سر پر ہوگی اور وہ دیکھے گی کہ ان کے حقوق میں کسی قسم کی دست بُرد نہ ہونے پائے۔

آئیڈیالوجی کے پیشِ نظر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنی مملکت مختارِ کل نہیں ہوتی بلکہ یہ اس آئیڈیالوجی کی عائد کردہ حدود کے اندر ہی فیصلے صادر کر سکتی ہے۔ یہ ان حدود کو کسی صورت میں بھی توڑ نہیں سکتی۔ نہ اپنے آپ کو ان پابندیوں سے اوپچا لے جا سکتی ہے۔ یہ پابندیاں غیر متبدل ہیں اور ان میں تغیّر و تبدل یا ترمیم و تنسیخ کا مملکت کو کوئی حق نہیں ہوتا۔

آئیڈیالوجی کے ماتحت وطنیّت کا تصوّر بھی باطل ہو جاتا ہے۔ اس کی رُو سے قومیّت کی بنیاد آئیڈیالوجی پر ہوتی ہے نہ کہ وطن، رنگ، نسل، زبان وغیرہ کے اشتراک پر۔ خود ایک ہی وطن میں بسنے والے ایسے افراد جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم نہیں کرتے غیر قوم کے افراد کہلائیں گے اور اس کے برعکس، دنیا کے کسی حصّہ میں بسنے والا انسان جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح تسلیم کرتا ہے، اس قوم کا فرد قرار پائے گا۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس ایک فرق کی بنا پر قرآنی مملکت کس طرح جدید مملکت سے یکسر منفرد ہو جاتی ہے، خواہ یہ مملکت جمہوری نظام کی حامل ہو یا آمریت کے نظام کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آئیڈیالوجی کیا ہے جس پر قرآنی مملکت متشکل ہوتی ہے۔ اس سوال کی تفصیل میں جائیے تو بات طویل ہو جائے گی لیکن اگر اسے سمٹا کر بیان کیا جائے تو بغیر کسی تردّد اور تامّل کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آئیڈیالوجی ہے۔

لَآ اِلٰہَ ـــــــ اِلَّا اللّٰہُ ـــــــ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

یعنی وہی چیز جسے ہم کلمہ کہتے ہیں۔ کلمہ کے معنی نظریۂ زندگی یا تصورِ حیات کے ہیں۔ اسی کو دورِ حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کہتے ہیں۔ اس آئیڈیالوجی کے تین اجزاء ہیں۔ پہلا جزو ہے لَآ اِلٰـہَ ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں کوئی قوت ایسی نہیں، جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ ذرا غور کیجئے کہ قرآن نے اس تصورِ حیات سے انسان کا مقام کس قدر بلند کر دیا ہے۔ اس نے انسان کو وہ آزادی عطا کر دی ہے جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ بابرؔ نے کہا تھا کہ اپنا حکم منوانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ قرآن نے کہا کہ انسان اپنا حکم اشیائے فطرت سے تو منوا سکتا ہے لیکن کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ قرآن کا یہی تصور تھا جس سے متأثر ہو کر برگساںؔ نے کہا ہے کہ مملکت کا تصرف اشیاء پر ہونا چاہیئے، انسانوں پر نہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے اپنی ایک آیت میں نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے جس میں اس نے کہا ہے۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ (۳/۷۹) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ اللہ اسے کتاب، حکومت اور نبوّت عطا کرے اور وہ دوسرے انسانوں سے یہ کہنے لگ جائے کہ تم میرے حکم کو مانو! غور کیجئے اس میں، اور تو اور خود نبی کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ اسے بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں سے اپنے احکام منوائے۔

آپ کہیں گے کہ یہ تو انارکی ہوئی۔ اگر انسان کسی کا حکم نہ مانے تو پھر انسانی معاشرہ قائم کیسے رہے گا۔ کلمہ کے دوسرے جزو نے انسانوں کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اس انارکی کو ختم کر دیا، جب اس نے کہا کہ ـــ الا اللّٰـــہ ـــ ہاں مگر ایک ذات ایسی ہے، جس کے قانون کی پابندی ضروری ہے اور وہ ذات ہے اللہ کی۔ اگر میں اس تفصیل میں چلا جاؤں کہ اللہ کسے کہتے ہیں اور اس کے قوانین کیا ہوتے ہیں تو یہ بحث فلسفہ، بلکہ مابعد الطبیعات کے دائرہ میں چلی جائے گی۔ اس لئے مختصر الفاظ میں یہ سمجھئے کہ اقبالؒ کے الفاظ میں خدا کے قوانین کی اطاعت غیر کے احکا کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ انسان کی اپنی بلند فطرت (IDEAL NATURE) کا اتّباع

ہوتی ہے۔ خدا بھی ایک (PERSONALITY) ہے اور انسانی فرد بھی ایک (PERSONALITY) ان دونوں میں فرق درجہ کا ہے۔ خدا مکمل ترین (PERSONALITY) ہے اور انسان اپنی (PERSONALITY) کی تکمیل اس مکمّل ترین ذات کی صفات کو اپنے اندر منعکس کرنے سے کر سکتا ہے۔ (PERSONALITY) جہاں بھی ہو اس کے تقاضے یکساں ہوتے ہیں۔ یہ ہے مطلب اقبالؒ کے اس کہنے کا کہ قوانینِ خداوندی سے مراد انسان کی اپنی مثالی فطرت کے تقاضوں کی اطاعت ہے۔ جنھیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے، وہ قرآنی تصوّر کی رو سے صفاتِ خداوندی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے معنی ہوئے مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ سورۂ آلِ عمران کی جس آیت کا پہلا ٹکڑا پہلے پیش کیا جا چکا ہے۔ (یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منوائے) اس کا اگلا ٹکڑا یہ ہے۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ لیکن تمھیں چاہیئے کہ تم ربّانی بن جاؤ۔ اس نفی اور اس اثبات سے قرآنی آئیڈیالوجی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

لیکن یہاں تک گفتگو محض تجریدی ہے۔ اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ یہ قوانین ہیں کہاں، اس کا جواب کلمہ کے تیسرے ٹکڑے — محمد رسول الله — میں ہے۔ یعنی یہ قوانین انسانوں کو رسالتِ محمدیہ کی وساطت سے ملیں گے۔ اسی کی تفصیل سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ بالا آیت کے تیسرے ٹکڑے نے کر دی جس میں کہا گیا ہے۔ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ یعنی اس کتاب کے ذریعہ سے جو تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے نقوش تمھارے لوحِ قلب پر نہایت گہرے ہیں۔

لہٰذا قرآنی مملکت کے معنی ہوئے — انسانی معاشرہ کی تشکیل قرآنی قوانین کے مطابق — یہی چیز قرآن نے سب سے پہلے خود نبیٔ اکرم صلعم سے فرما دی، جب آپ کو حکم دیا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) کہ تم قرآن کے مطابق حکومت قائم کرو اور اس اصول کو اس نے کفر و ایمان کا معیار قرار دیا، جب کہا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں، یعنی قرآنی آئیڈیالوجی کے منکر ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظریہ کی عملی صورت کیا ہے۔ آپ انسانی زندگی پر غور کیجئے۔ اس کے کچھ تقاضے تو ایسے ہیں جن میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ زندگی کے یہ غیر متبدّل تقاضے بنیادی اور اصولی ہیں۔ انھیں مستقل اقدار کہتے ہیں لیکن زندگی کے دوسرے تقاضے ایسے ہیں جو زمان اور مکان کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، یا یوں کہئے کہ مستقل اقدار یا بنیادی اصول تو اپنی جگہ پر محکم رہتے ہیں لیکن ان کی عملی جزئیات مختلف زمانوں میں بدلتی جاتی ہیں۔ قرآن نے زندگی

کے ان بدلنے اور نہ بدلنے والے دونوں پہلوؤں کے متعلق رہنمائی دی ہے۔ اس نے کہا کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵/۸۷) یعنی ہم نے تجھے زندگی کے بنیادی اصولوں کا ضابطہ اور بار بار دہرائے جانے والے واقعات، دونوں کی رہنمائی دی ہے۔ یہ مستقل اور غیر متبدل اصول وہ حدود ہیں جن کے اندر انسانوں کو آزاد چھوڑا گیا ہے کہ وہ باہمی مشاورت سے اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عملی جزئیات خود متعین کرلیں۔ اس کی بابت سب سے پہلے خود نبی اکرم صلعم سے کہا گیا کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) مملکت کے معاملات میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو اور نبی اکرم صلعم کے بعد مسلمانوں کی جماعت کے متعلق کہا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کی مملکت کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ دوام اور تغیر (PERMANENCE AND CHANGE) کے اس فطری امتزاج کی رُو سے یہ نظامِ مملکت ارتقائی منازل طے کرتا، بڑھتی ہوئی انسانیت کی رہنمائی کرتا چلا جائے گا۔ قرآن نے شوریٰ کا اصولی حکم دیا ہے، اس کی جزئیات سے بحث نہیں کی۔ شوریٰ کی عملی مشینری زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلی جائے گی لیکن یہ شوریٰ جمہوریت کی بدلگامی کا مظہر نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ یہ اختیار کسی کو بھی نہیں ہوگا کہ وہ ان حدود سے تجاوز کر جائے جو قرآن نے مستقل طور پر متعین کر دی ہیں۔ اگر شورائی فیصلے ان حدود سے تجاوز کر جائیں گے تو وہ مملکت قرآنی نہیں رہے گی۔

ان تصریحات سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کی رُو سے مملکت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کی رُو سے مملکت وہ اجتماعی نظام ہے، جس میں خدا کی صفات انسانی دنیا میں ایک ٹھوس شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ فلسفہ کی زبان میں اسے ہم (OBJECTIVISATION OF PERMANENT VALUES) کہہ سکتے ہیں اور چونکہ یہ مستقل اقدار خود انسان ہی کی مثالی فطرت کے پرتو ہیں، اس لئے یوں سمجھئے کہ قرآن کی رُو سے مملکت اس اجتماعی نظام کا نام ہے، جس میں افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ فلسفہ کی زبان میں اسے (ACTUALIZATION OF REALIZABLE HUMAN POTENTIALITIES) کہتے ہیں۔ یہ ہے نظامِ مملکت کا وہ مقصد جس سے قرآن نے اپنی ابتدا کی ہے جہاں کہا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ وہی نظام قابلِ حمد و ستائش ہو سکتا ہے جو قوانینِ خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی ربوبیت کا حامل ہو۔

اس مقصدِ بلند کے لئے قرآن نے نظامِ مملکت اور افراد کے درمیان ایک معاہدہ تجویز کیا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱) افرادِ معاشرہ اپنی وہبی اور اکتسابی املاک نظام کے سپرد کر دیتے ہیں، اور وہ ان کے بدلہ میں انہیں اَلْجَنَّۃَ عطا کر دیتا ہے۔ اَلْجَنَّۃ کس کو

کہتے ہیں؟ اس کی تفصیل پورے قرآن میں دی ہوئی ہے۔ اس میں اس موجودہ زندگی کی تمام خوشگواریاں بھی آجاتی ہیں اور انسانی صلاحیتوں کی وہ نشوونما بھی، جن کی رُو سے یہ اس زندگی کے بعد، زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس جنت میں زندگی کی بنیادی ضرورتوں کی بہم رسانی نظامِ مملکت کے ذمہ ہوتی ہے، اس لئے کہ قرآن نے اَلْجَنَّۃ کے متعلق کہا ہے کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْھَا وَلَا تَعْرٰی وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْھَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) یعنی اس میں نہ کھانے پینے کی کوئی تنگی ہوگی اور نہ لباس اور مکان کی۔ اور اس کے ساتھ ہی لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ انھیں کسی قسم کا کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ لہذا قرآنی مملکت کی یہ اولین ذمہ داری ہوگی کہ وہ تمام افرادِ مملکت کے لئے کھانے پینے کا سامان اور لباس اور مکان بہم پہنچائے اور ان کی ہر قسم کی حفاظت کا انتظام کرے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس   نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

o

یہ ہے عزیزانِ من! مملکت کا قرآنی تصور جس کے صرف اُبھرے ہوئے خطوط کی طرف میں اشارہ کر سکا ہوں۔ قرآن سے ان اشارات کے متعلق تفصیلی گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن اس کی عملی ضرورت کا وقت وہ ہوگا جب قرآنی مملکت کی تشکیل کا مسئلہ درپیش ہو۔ والسّلام۔

وہ مردِ درویش ....

مارچ ۱۹۵۵ء

غالباً ۳۱-۱۹۳۰ء کا ذکر ہے۔ میں نے (جامعۂ ملّیہ اسلامیہ، دہلی کے) رسالہ جامعہ میں حدیث کے متعلق ایک مضمون دیکھا۔ اس کا بیشتر حصّہ خود میرے خیالات کا ترجمان تھا لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے جن میں مجھے کچھ تردّد تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس موضوع پر اس قسم کا مضمون دیکھا ہو۔ سُلجھی ہوئی عبارت، خیالات صاف اور واضح، سادہ انداز، الفاظ کم از کم لیکن ہر لفظ اپنے مقام پر منتخب، محکم اور بجُود خزیدہ، دلائل دلکش۔ تبحر عالمانہ لیکن اسلوبِ بحث طالب العلمانہ۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ہر دعوے کی تائید قرآن سے۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ہی صاحبِ مضمون سے ملنے کا شوق دل میں اُبھرا۔ اسی وقت خط لکھا اور تیسرے ہی دن (ایک دوست کی زبانی) اس کا جواب آگیا۔ چنانچہ میں اتوار کے دن دوپہر کے وقت قرول باغ پہنچا۔ قرول باغ اس زمانہ میں مختصر سی بستی تھی اور زیادہ تر جامعۂ ملّیہ کی وجہ سے مشہور۔ چنانچہ وہاں "چھپر والے کنوئیں" کو تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی۔ مکان پر پہنچا، دستک دی، دروازہ کھُلا تو خود صاحبِ خانہ اور (صاحبِ مضمون) میرے سامنے تھے۔ بلند قامت، سَر کے بال قریب قریب سفید، لیکن مانگ نکلی ہوئی، کھچڑی ڈاڑھی لیکن تراش موزوں، گاڑھے کا کرتہ اور گاڑھے ہی کا پاجامہ، ازاربند کرتے سے نیچے لٹکا ہوُا اور اس میں ایک چابی بندھی ہوئی، پاؤں میں دیسی جوتا، پیشانی کشادہ، ایک آنکھ کی سیاہی ذرا اپنے مقام سے ہٹی ہوئی، لبوں پر مسکراہٹ اور چہرے پر بشاشت اور متانت کا ایسا امتزاج جو خیالات کی پاکیزگی اور حسنِ ذوق کا آئینہ دار ہو۔ میں نے اپنا نام بتایا تو بڑے شفقت آمیز انداز سے اندر آنے کے لئے کہا۔ کمرے کے اندر پہنچے تو مکان خود مکین کی سادگی کا مظہر۔ سامنے ایک چٹائی بچھ رہی تھی، جس پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈسک تھا اور اس

پر لکھنے پڑھنے کا مختصر سامان ــ قلم، دوات، تھوڑے سے کاغذ۔ اسی چٹائی پر بیٹھ گئے اور دو ہی چار باتوں کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا، جیسے ہم مدتوں کے ملاقاتی ہوں۔ ان کی باتوں کا بھی وہی انداز تھا جو تحریر کا تھا۔ مختصر، جامع، دلنشیں، صاف، واضح اور شگفتہ، جن میں سادگی کے ساتھ عجیب قسم کا معصومانہ انکسار بھی تھا۔ قرآن ــــ سینے، دل اور دماغ تینوں میں، کتبِ روایات و سِیَر پر عبور، تاریخِ اُمم، بالخصوص مسلمانوں کی تاریخ پر گہری نظر، شعر کا ذوق نہایت پاکیزہ، مذکورہ صدر مضمون کے اختلافی مقامات کے متعلق گفتگو رہی۔ میرے اعتراضات میں (بہ تقاضائے عمر ــــ میں اس وقت ۲۶/۲۷ برس کا تھا) شدّت اور جوش تھا۔ ان کے جواب میں نرمی اور متانت۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ دو تین اور حضرات ملنے کے لئے آ گئے ــــ ان میں ایک تو مولانا عبدالقادر قصوری (مرحوم) اور ایک صاحب بمبئی کونسل کے ممبر اور تیسرے صاحب کسی ریاست کے عہدیدار۔ انھیں بھی اسی بے تکلفی سے چٹائی پر بٹھا دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو مولانا! چائے پینے کے لئے آئے ہیں۔ مسکرا کر کہا یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ کہہ کر خود ہی اندر گئے (گھر میں ملازم کوئی نہیں تھا)۔ پہلے ایک دسترخوان لا کر بچھا دیا جو بتا رہا تھا کہ وہ گاڑھے کے پرانے کرتوں کو دھلوا کر تیار کیا گیا ہے۔ پھر چار پانچ پرچیں پیالیاں (جن میں شاید ہی کوئی صحیح سالم ہو) ایلومینیم کی ایک چائے دانی۔ میں ان چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس تکلف کے دَور میں اس قدر سادگی کے لئے کتنے بڑے وسیع ظرف اور بلند نگاہ کی ضرورت ہے۔

یہ تو تھا چائے کا سامان، لیکن جب صاحبِ خانہ نے چائے پر گفتگو شروع کی تب معلوم ہوا کہ آنے والوں نے خاص طور پر چائے کی فرمائش کیوں کی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی (غبارِ خاطر میں) اپنی چائے کی رنگینی اور گرم جوشی کا بڑا حسین نقشہ کھینچا ہے لیکن چائے کا جو نقشہ وہاں کھینچ رہا تھا اس میں اور غبارِ خاطر کے نقشے میں اتنا ہی فرق سمجھئے جتنا فرق بادیہ نشین عربوں کے قہوۂ نخلستانی اور عجمی محفلوں کے بادۂ ارغوانی میں ہوتا ہے۔ گفتگو میں عربوں کی سی سادگی، بے تکلفی، سینہ کی کشاد، ذوق کی پاکیزگی اور شگفتگی اُبل اُبل کر سامنے آ رہی تھی۔ حتیٰ کہ لطائف بھی عربی کتبِ محاضرات ہی کے تھے۔ قریب ایک گھنٹے تک یہ محفل گرم رہی۔ وہ محفل، جس میں خلوص کی پہنائیاں، علم کی گہرائیاں اور ذوق کی بلندیاں، سب سمٹ کر آ گئی تھیں۔

یہ تھی علامہ اسلم جیراجپوری (مدظلہٗ) سے میری پہلی ملاقات۔ دنیا میں خیالات کی ہم آہنگی کا رابطہ بھی عجیب رابطہ ہے اور جب اس ہم آہنگی کی بنیاد قرآن پر ہو تو پھر اس قلبی تعلق کا پوچھنا ہی کیا۔ (یہ میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ جن لوگوں سے قرآن کی بنیادوں پر تعلق پیدا ہوا وہ رشتہ بڑا ہی محکم رہا) چنانچہ چند ہی دنوں کے بعد صورت یہ ہو گئی کہ میری فرصت کے بیشتر اوقات انہی کے پاس گزرنے لگے۔ اس زمانے میں ہمارے دفاتر چھ ماہ کے لئے (سردی میں) دہلی رہا کرتے تھے اور گرمیوں کے

چھ ماہ شملہ میں۔ گرمی کے موسم میں جامعہ میں کم و بیش تین ماہ کی تعطیلات ہو جاتیں اور مولانا اپنے وطن تشریف لے جاتے۔ (علامہ اسلم اپنے وطن میں "حافظ صاحب" اور جامعہ میں "مولانا" کے لقب سے متعارف تھے (اور اب بھی ہیں) یہ لقب اُن کے لئے ایسا مُزرد ہو چکا تھا کہ ہر شخص جانتا تھا کہ جب صرف "مولانا" کہا جائے تو اس سے کون مراد ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر وہ احباب کے حلقہ میں بھی "مولانا" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ (بعض اوقات اتفاقات کی ستم ظریفی بھی عجیب ہوتی ہے۔ جو شخص مولانائیت سے اتنا دُور نکل چکا ہو، وہ عمر بھر "مولانا" کے نام سے موسوم رہے۔ یہ اتفاقات کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے!) بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ مولانا سے میرا ملنا موسمِ سرما ہی میں ہوا کرتا تھا۔

میں عربی ادب کی بعض کتابوں میں ناپختگی محسوس کیا کرتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھاؤں اور عند الفرصت مولانا سے یہ کتابیں از سرِ نو پڑھ لوں۔ چنانچہ (غالباً) ۱۹۳۵ء میں میں نے اس کے متعلق مولانا سے ذکر کیا اور وہ اس کے لئے بخوشی رضامند ہو گئے۔ چنانچہ میں شملہ سے تنہا دہلی آگیا اور چونکہ مولانا بھی اس زمانے میں اکیلے ہی رہتے تھے، اس لئے فیصلہ یہی ہوا کہ میں انہی کے ساتھ رہوں۔ یہ چھ مہینے کا عرصہ میری زندگی کے یادگار دنوں میں سے ہے۔ میں آیا تو تھا عربی ادب کی ناپختگی دُور کرنے کے لئے لیکن [وہ جو کہتے ہیں ___ کہ آگ لینے کو جائے پیمبری مل جائے] ہمارا بیشتر حصہ قرآن کے رموز و غوامض پر بحث و تحقیق میں گزرتا۔ اس زمانے میں مولانا کا ایک ملازم تھا رحمت اللہ۔ وہی روٹی پکاتا تھا۔ (بلکہ اسے روٹی پکانا بھی میں نے ہی سکھایا تھا) اور مولانا کا چھوٹا لڑکا (عزیزی معظم سلمہٗ اللہ تعالیٰ جو اس زمانہ میں طبیہ کالج میں پڑھتا تھا اور اب اعظم گڑھ میں ایک کامیاب طبیب ہے) یہ ساتھ تھے۔ اوپر کے کمرے میں میری اور مولانا کی چارپائی آمنے سامنے بچھی رہتی۔ رحمت اللہ مولانا کو حقہ بھر کر دے جاتا اور ہم باتوں میں مصروف رہتے۔ ان باتوں کا محور تو (ظاہر ہے) قرآن ہوتا لیکن شاید ہی کوئی ایسا موضوع تھا جو اس محور کے گرد نہ گھومتا۔ میں اس زمانے میں (اپنی تصنیف) معارف القرآن کے ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا تھا، اس لئے میرے پیشِ نظر بھی ہر وقت قرآن رہتا تھا اور مولانا کے تو سینے ہی میں قرآن تھا۔ نہ معلوم اس چھ ماہ کے عرصہ میں ہم نے قرآنی تحقیق کے ضمن میں کتنا کچھ کھنگال ڈالا۔ میں نے اپنی حیثیت ہمیشہ ایک شاگرد کی سی سمجھی لیکن مولانا کی کشادہ نگہی کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑے مسئلہ پر بھی انہوں نے اگر دیکھا کہ میری رائے صحیح ہے، تو وہ اسے ایسی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے کہ بعض اوقات مجھے شُبہ گزرنے لگتا کہ وہ کہیں میرے پاسِ خاطر سے ایسا تو نہیں کرتے (لیکن بعد کے تجربے نے بتایا کہ دین کے معاملہ میں مولانا کسی کے پاسِ خاطر سے کوئی بات قبول کرتے ہیں، نہ کوئی خیال چھوڑتے ہیں۔ وہ اختیار صرف اسے کرتے ہیں، جسے حق سمجھتے ہیں۔ اگر کسی بات کے متعلق تحقیق ہو جائے کہ وہ قرآن کے مطابق نہیں تو اسے نہایت جرأت اور آسانی سے جھٹک کر الگ کر دیتے ہیں) اس قیام کے دوران میں

مولانا کا علمی تبحر، قرآن سے عشق اور سب سے بڑھ کر ان کی سیرت و کردار کی بلندی نکھر کر میرے سامنے آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ (بذریعہ ڈاک استفسارات کے علاوہ) ممالکِ اسلامیہ کے جید علماء اور مشاہیر اکثر انھیں ملنے کے لئے آتے اور اہم مسائل پر ان سے استفادہ کرتے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اگرچہ حدیث کے متعلق ان کا مسلک اہلِ حدیث سے مختلف تھا اور فقہ کے متعلق اربابِ فقہ سے الگ لیکن اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ کے بڑے بڑے علماء اس انداز سے آپ کے پاس آتے جیسے کوئی شاگرد استاد کے پاس، یا کوئی خورد، اپنے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کئے تھا۔ مصر ہو یا حجاز، شام ہو یا ترکی، ایران ہو یا ہندوستان، کہیں مسلمانوں پر کوئی آفت آئے، مولانا مضطرب و پریشان ہو جاتے اور ان کی خیر طلبی کی دعائیں مانگنے لگتے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ رات کو ۲ بجے کے قریب اُٹھتے، تہجد پڑھتے، حفظ کردہ قرآن کی منزل دہراتے۔ اس کے بعد نہایت عجز و الحاح سے دعائیں مانگتے۔ اپنے لئے قرآن سمجھنے اور قرآن پر چلنے کی دُعا اور باقیوں کے لئے اس عمومی دُعا کے علاوہ ان کی پریشانیاں دُور ہونے کی دعائیں۔ (ان دُعاؤں میں میرا نام التزاماً شامل ہوتا اور چہ عجب کہ اب تک شامل ہوتا ہو!) افراد کے بعد ملت کی اجتماعی بہبودی کے لئے دُعائیں مانگتے۔ اس کے بعد اللہ کے حضور ایک خاص سجدۂ شکرانہ گزارتے، جس میں نہائیت عجز اور مسرت سے کہتے کہ مجھ سے زیادہ اس دنیا میں خوش نصیب کون ہو سکتا ہے جسے اے میرے پروردگار، تیرے سوا نہ دنیا میں کسی کی محتاجی ہے نہ کسی کا ڈر۔ وہ اس دوران میں مجھے کبھی نہ جگاتے۔ سمجھتے کہ میری عمر ابھی سونے کی ہے۔ (اگرچہ میں ایسی کچی نیند کا واقع ہوا ہوں کہ ذرا سی آہٹ سے میری آنکھ کھل جاتی اور اب تک یہی عالم ہے لیکن میں نیم بیدار نیم خفت بستر پر پڑا رہتا تاکہ ان کے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہوں) اس کے بعد وہ تھوڑی سی ورزش کرتے اور مجھے آواز دیتے کہ صبح کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ مکان سے ملحقہ مسجد میں نماز کے لئے جاتے۔ وہاں کا امام، عام "بچی روٹی" والا امام تھا لیکن مولانا ہمیشہ اسی کے پیچھے نماز پڑھ لیتے۔ مجھے کبھی کبھی اس کا بھی خیال آتا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر روک دیتے کہ یہ امام محلّہ والوں کا منتخب کردہ امام ہے، اس لئے نماز اسی کو پڑھانی چاہیئے۔ نماز سے واپسی پر چائے ملتی۔ دو پیالی چائے۔ (خواہ کسی برانڈ کی ہو، بلکہ برانڈ کا لفظ تو میں نے استعمال کیا ہے۔ وہاں کبھی برانڈ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا) اور اس کے ساتھ ایک پیسے والا نان پاؤ۔ یہ ہوتا عام طور پر ان کا ناشتہ لیکن (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) چائے کا وقت تو ان کے لئے (غالبؔ کے الفاظ میں) "شگفتنِ گل ہائے ناز" کا وقت ہوتا۔ میں اُس زمانے میں چائے نہیں پیتا تھا۔ اس لئے چائے کے وقت سب سے پہلا موضوع میری یہی "کم نصیبی" ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی دلچسپ لطائف اور کتب محاضرات کے شہ پارے، عربی، فارسی اور اُردو کے نہائیت پاکیزہ اور بلند پایہ اشعار۔ بعض اوقات خود اپنے (پُرانے) اشعار بھی

(کیونکہ اس زمانے میں انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا) چائے کے بعد حقہ کی ایک چلم۔ پھر وہ جامعہ تشریف لے جاتے اور میں دفتر آجاتا۔

مولانا کی "درویشی" کا یہ عالم تھا کہ وہ علی گڑھ کالج کی پروفیسری چھوڑ کر جامعہ میں آئے تھے۔ (جامعہ میں چھوٹے بڑے سب، ان کی عزت کرتے اور ان کا نام بڑی ہی عقیدت اور احترام سے لیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عزت اور عقیدت کے بجائے "محبت" کا لفظ اس کیفیت کا زیادہ بہتر ترجمان ہوگا۔) جامعہ پر اس زمانے میں بڑی عُسرت کا دَور تھا۔ ویسے تو وہاں تمام اساتذہ کا مشاہرہ اسّی روپے مقرر تھا لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے ملتے صرف چالیس ہی تھے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ یہ چالیس بھی کئی مہینوں تک نہ مل سکے۔ میں نے مولانا کو اس زمانے میں بھی کبھی پریشان نہ دیکھا۔ مجھ پر اس کا اثر تھا لیکن ان پر اس کا مطلقاً کوئی اثر نہ تھا۔ وہ بالکل ویسے ہی مطمئن اور شاداں و فرحاں زندگی بسر کرتے۔ وہ جو اقبالؒ نے کہا ہے ــــــــ با اضطرابِ موج سکونِ گہر بدہ ــــــــ تو میں نے مولانا کے قلب کو اس کا صحیح مظہر پایا۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اس قدر سمٹا رکھا تھا کہ جس مقام پر لوگ عُسرت محسوس کرنے لگتے ہیں وہ ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا لیکن یہ سمٹاؤ بُخل کی وجہ سے نہ تھا بلکہ سیر چشمی اور مومنانہ استغناء کی بنا پر تھا۔ (میں مولانا سے بصد معذرت اس حقیقت کا انکشاف کر رہا ہوں کہ) ان کی آمدنی کا بیشتر حصّہ مستحقین کی امداد میں صرف ہوتا تھا اور وہ اس کا کسی کو علم تک بھی نہیں ہونے دیتے تھے اور اس امداد کی بعض شکلیں بھی عجیب ہوتیں۔ (مثلاً) ایک دفعہ کا ذکر ہے (اور یہ اس زمانے کے بعد کا واقعہ ہے جب میں ان کے ہاں قیام پذیر تھا) کہ ایک شام میں ان کے ہاں پہنچا تو کھانے کا وقت تھا۔ سالن میں شلغم تھے۔ معظم میاں کو شلغم ناپسند تھے۔ آلو بہت پسند تھے۔ (جب میں وہاں مقیم تھا تو "کیا پکے گا" کے مسئلہ پر اکثر میں اور معظم اکثریت میں ہوتے اور مولانا اقلیت میں رہ جاتے) میں نے پوچھا کہ کیا معظم یہاں نہیں، جو آج پھر شلغم پک رہے ہیں۔ ہنس کر کہا نہیں۔ ان شلغموں کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ تم نے نیچے "بڑے میاں" کو دیکھا ہے۔ یہ جہلم کے رہنے والے ریٹائرڈ فوجی سپاہی ہیں۔ دو چار دن ہوئے ملازمت کی تلاش میں آگئے۔ میں نے پوچھا کہ بڑے میاں! روٹی پکانا جانتے ہو۔ کہنے لگا کہ جی ہاں! فوجی سپاہی کو کیا نہیں آتا۔ میں نے کہا اچھا ہماری روٹی پکا دیا کرو۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اسے روٹی سالن کچھ بھی تو پکانا نہیں آتا۔ جب میں نے کہا کہ میاں یہ کام تو تجھ سے نہیں ہو سکے گا، تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنی درد بھری داستان سنائی، جسے سننے کے بعد اسے الگ کر دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔ اب یہ ہر روز کوئی نہ کوئی دلچسپ بات کرتا ہے۔ آج صبح میں نے کہا کہ بڑے میاں تجھے کوفتہ پکانا آتا ہے، کہنے لگا۔ "کوفتہ کوفتہ، گول گول" میں نے کہا ہاں، گول گول۔ کہنے لگا! پکا لوں گا۔

اب جو شام کو کھانا سامنے آیا تو اس میں شلغم ہیں۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ یہی تو ہیں گول گول، گونگلو (پنجاب میں شلغم کو گونگلو کہتے ہیں) یہ کہہ کر مولانا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد جب تک وہ بڑے میاں خود ہی ملازمت چھوڑ کر نہیں چلے گئے، مولانا نے کبھی ایک لفظ بھی تُرش روئی سے نہیں کہا۔ اس نے جو کچھ پکا دیا، ہنس کر کھا لیا۔ (یا علی گڑھ کی پرانی اصطلاح میں، یوں کہئے کہ "کھا دیا"۔)

ویسے تو مجھے بہت سے واقعات یاد ہیں، جن سے مولانا کی وسعتِ ظرف اور بلندئ سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے لیکن ان میں ایک واقعہ ایسا ہے، جس کے نقوش میرے دل کی گہرائیوں میں اُترے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ مولانا نے ہندوستان کے ایک نامورِ اہلِ قلم کی کتاب پر تبصرہ لکھا، جس میں بتایا کہ اس کتاب میں کتنی باتیں قرآن کے خلاف ہیں۔ یہ تبصرہ ان پر ذرا سخت پڑا۔ اس زمانہ میں خود مولانا کی ایک کتاب زیرِ طباعت تھی، جس کا چرچا علمی حلقوں میں پہلے ہی سے ہو رہا تھا۔ ان صاحب کے مجھ سے بھی مراسم تھے۔ وہ میرے پاس آئے اور مولانا کی کتاب کو ایک فتنۂ عظیم قرار دے کر کہا کہ میں اس کے خلاف لکھوں؟ میں نے کہا کہ میں جب تک اس کتاب کو دیکھ نہ لوں، اس وقت تک اس کے خلاف کس طرح کچھ لکھ سکتا ہوں۔ انھوں نے بہت اصرار کیا لیکن میں اس پر آمادہ نہ ہؤا۔ جب وہ مجھ سے مایوس ہو گئے تو وہ جامعہ میں پہنچے اور وہاں اس (آنے والی) کتاب کے خلاف محاذ قائم کرنے کی کوششیں شروع کیں اور وہ اس حد تک کامیاب بھی ہو گئے کہ وہ کتاب مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع نہ ہو۔ یہ سب کچھ مولانا کے علم میں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا نے ان کے متعلق نہ تو ان سے کبھی ایک حرف تک کہا اور نہ ہی ان کے ساتھ اپنے تعلقات میں کوئی فرق آنے دیا۔ یہ کچھ انہوں نے ظاہرداری کے طور پر نہیں کیا تھا، اس لئے کہ ظاہرداری مولانا کی طبیعت کے یکسر خلاف ہے۔ ان کے دل میں فی الواقعہ ان صاحب کے خلاف کوئی ملال نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے بعد کئی مرتبہ یہ واقعہ زیرِ گفتگو آیا اور مولانا ہمیشہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ وہ معذور ہیں۔ ان کی طبیعت ہی ایسی ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور لوگ بھی تھے جو آئے دن مولانا کے خلاف کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے اور ان میں بعض نہایت پست سطح پر بھی اُتر آتے لیکن میں نے ان میں سے کسی کے خلاف مولانا کی زبان سے ایک لفظ بھی سختی کا نہیں سُنا۔

یوں تو اس عرصہ میں مولانا سے ہر ملاقات ایک نہ ایک اثر چھوڑ جاتی تھی لیکن شروع جنوری ۱۹۳۸ء میں لاہور کا سفر، ایک یادگار واقعہ ہے۔ انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیرِ اہتمام لاہور میں (غالباً پہلا) یومِ اقبال سنایا گیا اور اس میں شرکت کے لئے احبابِ دہلی کا قافلہ مولانا کی زیرِ قیادت روانہ ہؤا۔ افرادِ کارواں میں راقم الحروف کے علاوہ محترم اسد ملتانی صاحب، شیخ سراج الحق اور (ہمارے ایک مرحوم دوست) قاضی محمد اشرف تھے۔ یومِ اقبالؒ کے اجتماعات میں شرکت کے

علاوہ، خود علامہ اقبالؒ سے (ہماری آخری) ملاقات زندگی کے ناقابلِ فراموش لمحات میں سے تھی۔ اس تقریب اور اس ملاقات کا حال خود مولانا نے بھی ایک مضمون میں قلم بند فرمایا تھا (جو غالباً رسالہ نیرنگِ خیال کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا) نیز علامہ اقبالؒ سے اس آخری ملاقات کی روئداد میں نے بھی ایک مقالہ میں محفوظ کر لی تھی، جو طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ (اب یہ روئداد، علامہ اقبالؒ سے متعلق میرے مجموعہ مضامین میں شامل ہو گی) ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام شائع ہوا، تو مولانا نے اسے اپنی خصوصی (قلمی) اعانت سے نوازا۔ جب جامعہ اوکھلا میں چلا گیا (جو نواحاتِ دہلی میں ایک بستی ہے) تو صورت یہ رہتی کہ جمعہ کے روز (جب جامعہ میں چھٹی ہوتی) مولانا میرے ہاں تشریف لاتے اور اتوار کے دن، میں معہ اپنے دیگر احباب کے، جو مولانا سے بھی اتنے ہی قریب تھے جتنے مجھ سے، اوکھلا چلا جاتا۔ یوں تو مولانا کے ملنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، جس کی وسعتیں ہندوستان سے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں، (اب بھی ہیں) لیکن جو خصوصی اور قلبی تعلق انہیں اس حلقۂ احباب سے تھا، وہ شاید کسی اور کے حصہ میں نہ آیا ہو گا۔ اس اعتبار سے اس حلقۂ احباب کی مجلس ایک خاص رنگ لئے ہوتی تھی۔ اتوار کی دوپہر باہر دھوپ میں چارپائیاں بچھ جاتیں۔ دریا کی تازہ مچھلی آ جاتی۔ کڑھائی چڑھ جاتی۔ مچھلی تلی جا رہی ہے اور اہم ترین مسائل وحقائق پر گفتگو ہو رہی ہے۔ احباب میں بے لوث تعلق، قلبی یگانگت، مخلصانہ محبت، خیالات میں یک رنگی، ذوق کی ہم آہنگی، باہمی کوئی راز نہیں، درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں، کسی قسم کی مغائرت نہیں۔ ایک دوسرے میں کسی غلط فہمی کا اندیشہ نہیں۔ فرقِ مراتب ضرور ملحوظ رکھا جاتا لیکن مولانا نے اپنے آپ کو کبھی باقی احباب سے بڑا محسوس نہیں ہونے دیا۔ ان محفلوں کے متعلق میرے ہی نہیں بلکہ دیگر احباب کے بھی یہ تاثرات تھے کہ مولانا کی موجودگی میں دل کو ایک خاص قسم کا انبساط اور سکون حاصل رہتا تھا۔ محفل کیا، حقائق ولطائف کی سمٹی ہوئی دنیا ہوتی۔ گفتگو نہایت متین لیکن شگفتہ وشاداب، پُرمغز لیکن صاف اور سادہ، ٹھوس لیکن رواں اور شیریں، موضوع ہمیشہ واقعات اور اشیاء سے متعلق ہوتے۔ ذاتیات ان میں کبھی نہ آنے پاتیں۔ اگر کسی کی ذات درمیاں میں آ بھی جاتی، تو نہ کسی کی بے جا تعریف ہوتی نہ ناحق تنقیص۔ مولانا کا حافظہ اتنا قوی تھا (اور خدا کرے اب تک ایسا ہی ہو) کہ واقعات کی جزئیات اس طرح بیان کئے جاتے، جیسے کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ یہ محفلیں درحقیقت ہماری درسگاہ تھیں ـــــ اور اب محسوس ہوتا ہے کہ حاصلِ زیست بھی۔

اسی دوران میں میری کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی، جس کا مقدمہ مولانا نے (بکمالِ عنائت) خود تحریر فرمایا۔ اس کے بعد اس کی دوسری اور تیسری جلد بھی وہیں شائع ہوئی۔ قرآنی تحقیق کے اس تمام دشوار گزار مراحل میں مولانا کی رفاقت اور شفقت میرے لئے ہر مقام پر وجہ تقویت رہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اسے ان کی طرف سے حوصلہ افزائی

کہوں یا غایتِ شفقت کہ جب لوگ ان کے پاس قرآنی مطالب سمجھنے کے لئے آتے، تو آپ انھیں میرے پاس بھیج دیتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ میری موجودگی میں لوگ ان کے پاس آتے، تو آپ میری طرف اشارہ کردیتے۔ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ آپ کی موجودگی میں مجھے لب کشائی کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایک مرتبہ میرے زیادہ اصرار پر فرمایا کہ قرآن کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اپنے زمانے کے تقاضے ہوں۔ تم اس دَور کے تقاضوں کو بہتر سمجھتے ہو، اسی لئے قرآن کو بھی بہتر سمجھ سکتے ہو اور سمجھا بھی ہے، اس لئے یہ فریضہ اب تمھیں ہی ادا کرنا ہوگا۔ آپ غور فرمایئے کہ اس قسم کی کشادہ ظرفی، وسعتِ قلب اور بلند نگہی، قرآن کے علاوہ اور کون سی چیز پیدا کرسکتی ہے۔ اتنا ہی نہیں، کئی مسائل ایسے بھی آجاتے، جن میں مجھے ان سے اختلاف ہوتا۔ وہ ان مقامات پر مجھے ٹوکتے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنے خیال کو مجھ پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی ہو۔ وہ دلائل و براہین سے مجھے سمجھانے کی کوشش فرماتے لیکن اگر اس کے باوجود میں کہہ دیتا کہ میرا اس سے اطمینان نہیں ہوا تو ماتھے کی شکن تو ایک طرف، دل کی گہرائیوں میں بھی اس کے متعلق کسی قسم کی کبیدگی پیدا نہ ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ ان کی موجودگی میں کسی نے مجھ سے کسی ایسی بات کے متعلق پوچھ لیا جس میں ان کا خیال مجھ سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے خیال کے مطابق بات سمجھانی شروع کردی۔ مولانا نہایت خاموشی سے سنتے رہتے اور حقہ پیتے رہتے کبھی مداخلت نہیں کی لیکن جب میں مستفسر سے کہہ دیتا کہ اس باب میں مولانا کا خیال کچھ اور ہے اور وہ ان کی طرف رجوع کرتا تو پھر آپ پوری وضاحت سے اپنے خیال کو پیش کرتے۔

مولانا سے اخذِ فیض کا یہ "حسین و سادہ و رنگین" سلسلہ اسی طرح جاری تھا کہ تقسیم ہند کا زمانہ آگیا۔ میں (اور اس حلقہ کے دیگر احباب) اس زمانے سے "پاکستانی" واقع ہوئے تھے، جب (۱۹۳۰ء میں) علامہ اقبالؒ نے اپنے الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں اسکی طرف اشارہ کیا تھا۔ لہٰذا ہمارے لئے تشکیلِ پاکستان، جن مسرتوں اور شادمانیوں کا موجب ہوسکتی تھی، وہ ظاہر ہے۔ لیکن اس ہجوم مسرت میں یہ خیال ہم سب کے لئے وجۂ ہزار اضطراب تھا کہ مولانا پاکستان نہ جاسکیں گے۔ اس خیال سے بالخصوص جو کچھ میرے دل پر گذری تھی، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بہرحال، یہ افرادِ کارواں خون کی ندیاں پیرتے اور آگ کی خندقیں پھاندتے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئے لیکن مولانا وہیں رہ گئے۔ اتنے برسوں کے بعد، مولانا سے اس طرح علیحدگی کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے مجھے ان کی کمی ہر سانس میں محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا نے میرے اس اضطراب کو محسوس فرمایا اور (ان کا کرم ملاحظہ فرمایئے کہ) تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ میرے پاس (کراچی) تشریف لے آئے اور اس طرح پھر سے میرے گھر کی تاریکیاں نور سے بدل گئیں اور دلّی کی محفلیں پھر سے تازہ و سرسبز ہوگئیں لیکن مولانا کا یہ آنا عارضی تھا۔ اس لئے کچھ عرصے کے بعد وہ واپس تشریف لے گئے۔

اس کے بعد مَیں اب تک اسی امید میں دن گزار رہا ہوں کہ شاید کبھی حالات مساعد ہو جائیں اور مجھے اس چشمۂ علوم و معارف سے، اتنے عرصہ کی تشنہ کامی کا صلہ مل جائے، اگرچہ اس باب میں مولانا کے جوابات ابھی تک حوصلہ شکن ہیں۔ چنانچہ ان کا جو حالیہ خط موصول ہوا ہے [جو میرے اس خط کے جواب میں تھا جس میں مَیں نے ضمناً ذکر کیا تھا کہ بعض احباب کے تقاضے پر، مَیں آپ سے اپنے روابط کے متعلق کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں] اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں۔

ان ملاقاتوں کے سلسلے آپ کو بخوبی یاد ہوں گے جس میں آپ نے حدیث اور نیز قرآن کے متعلق اتنا کچھ سمجھ لیا کہ مجھ سے بھی آگے نکل گئے۔ بلکہ کبھی کبھی مجھے دامن پکڑ کر پیچھے کھینچنا پڑا۔ کل آپ کا کارڈ ملا۔ اس وقت مَیں ایک ادبی محفل میں صدارت کر رہا ہوں جس میں ------ بھی تھے۔ انہوں نے بھی آپ کے شوقِ ملاقات کا پیغام پہنچایا۔ مگر مَیں تو ایک بار پہلے بھی آپ کو لکھ چکا ہوں کہ " وہ قطرہ ہوں شبنم کا جو خارِ مغیلاں پہ پیرانہ سالی کہیں کے سفر کی اجازت نہیں دیتی سوائے ایک سفر کے

محمد اسلم - جامعہ نگر - دہلی

بایں ہمہ، مَیں مایوس نہیں ہوں۔

یہ ہے مولانا سے میرے روابط کی داستان، جسے مَیں نے بعض احباب کے تقاضے پر مختصر الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ باقی رہے خود مولانا تو ان کے متعلق اگر آپ مجھ سے دو لفظوں میں پوچھنا چاہیں تو میں بلا تأمل کہہ دوں گا کہ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جس کے افکار و کردار دونوں میں قرآن اس وسعت اور گہرائی سے سمایا ہو۔ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے۔

نورِ قرآں درمیان سینہ اش
جامِ جم شرمندۂ آئینہ اش

[یہ تعارف مارچ ۱۹۵۵ء میں لکھا گیا تھا۔ افسوس کہ اُسی سال دسمبر میں مولانا دہلی میں انتقال کر گئے]

پروفیسر ٹوئن بی سے چھ سوالات

پروفیسر ٹوئن بی (TOYN BEE) علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کی ساری عمر تہذیبِ عالم کی تحقیقات اور مطالعہ میں گذری ہے اور اس کی زندہ شہادت ان کی وہ معرکہ آرا کتاب ہے جو (A STUDY OF HISTORY) کے عنوان سے دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ آپ اس کے مرکزی خیال سے متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے اس دور کا جو ترکہ آنے والی نسلوں کی طرف منتقل ہوگا، اس میں یہ کتاب ضرور شامل ہوگی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے اسپنگلر کی بلند پایہ کتاب (DECLINE OF THE WEST) بھی اس موضوع پر ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی تھی اور اس کی اہمیت میں آج بھی کوئی کمی نہیں آئی لیکن ٹوئن بی کا اُفق نسبتاً وسیع اور اس کی نگاہ مقابلۃً کشادہ ہے۔ انہی پروفیسر ٹوئن بی سے پچھلے دنوں نیویارک ٹائمز کے نمائندوں نے عند الملاقات چھ سوالات پوچھے یہ سوال اور ان کے جواب "ریڈرز ڈائجسٹ" کی جون ۵۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئے ہیں۔ انکی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر انہیں معہ پرویز صاحب کے تبصرے کے ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ ——— (طلوعِ اسلام اگست ۵۵ء)

پہلا سوال: تہذیبِ مغرب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ فنا ہو جائے گی یا باقی رہے گی؟
جواب: میں کبھی ناامید نہیں ہوا کرتا۔ میرا خیال ہے کہ تہذیبِ مغرب کو نہ زوال آئے گا اور نہ ہی یہ فنا ہو گی۔ اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہ خود بخود آگے بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جائے گی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ چیز ہم اہلِ مغرب کے امکان میں ہے کہ ہم کوشش کر کے اپنی تہذیب کو بچا سکتے ہیں۔ مجھے اس کی توقع ہے کہ وہ تخریبی قوتیں جو آج ہمارے سامنے آ رہی ہیں، ہم میں ایک ایسا جذبہ پیدا کر دیں گی، جس سے ہم اپنی غلط روش سے تائب ہو کر اپنی اصلاح کریں گے اور زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر چل پڑیں گے۔

تبصرہ سوال یہ ہے کہ اگر تہذیبِ مغرب ایک متاعِ عزیز ہے تو پھر اس سے تائب ہو کر ایک نئی روش پر چلنے کے معنی کیا ہیں؟ جب ہم موجودہ روش سے تائب ہو کر ایک نئی روش پر چل نکلے تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ ہماری موجودہ تہذیب کا مستقبل شاندار ہے۔ اس تہذیب کو تو ہم نے اس دن چھوڑ دیا، جب ہم ایک نئی شاہراہ پر چل پڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی تہذیب میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ انسانی امن اور فلاح کی ضامن بن سکے۔ اس کی بنیادی کمزوریاں یہ ہیں کہ وہ

(۱) نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کے تصور کے بجائے قومیت کے تنگ دائروں میں گھری ہوئی ہے۔ ان دائروں میں مسلسل تصادم کا موجود رہنا ناگزیر ہے۔
(۲) اس کے پاس کوئی غیر متبدل اصول ایسے نہیں، جن پر ہر حالت میں عمل پیرا رہنا اہلِ مغرب کا ایمان ہو۔ نتیجہ یہ کہ ان اقوام کے فیصلے ان کی مصلحتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔
(۳) یہ تہذیب خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان نہیں رکھتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قوم اتنی قوت فراہم کر لیتی ہے کہ اسے دوسری قوموں کی مخالفت کی پروا نہ رہے، وہ بلاتامل سب کچھ کرتی چلی جاتی ہے۔

ہمارا یہ منہ تو نہیں کہ ہم اہلِ مغرب کو ان کی کسی روش پر ٹوکیں، اس لئے کہ ہم تو اپنی زیست تک کے لئے ان کے محتاج ہیں لیکن قرآن کی دی ہوئی بصیرت کے ماتحت ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ جس تہذیب کی بنیاد خدا کی متعین کردہ غیر متبدل اقدار پر نہ ہو، اس کی تقدیر میں فلاح اور بقا نہیں ہو سکتی۔

دوسرا سوال: کیا روس اور جمہوری اقوامِ مغرب سفرِ زندگی میں دوش بدوش چل سکتے ہیں۔

جواب : جی ہاں! تاریخ کا تجربہ ہمیں ایسا ہی بتاتا ہے۔ سترھویں صدی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کا خیال یہ تھا کہ جب تک دوسرا فرقہ ختم نہیں ہو جاتا ان کے لئے جینا نا ممکن ہے۔ اسی طرح صلیبی جنگوں کے زمانے میں ایسے عیسائی اور مسلمان موجود تھے، جن کا خیال یہ تھا کہ جب تک دشمن کے مذہب کو نیست و نابود نہ کر دیا جائے ہماری بقا محال ہے۔ بایں ہمہ صدیاں گزر گئیں اور یہ فرقے اور گروہ بدستور موجود ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ روس اور جمہوری اقوام کو دوش بدوش رہنے میں کچھ ناگواری بھی ہو گی اور خطرات بھی لیکن یہ اس وقت تک ہوں گے، جب تک ہم یہ سمجھتے رہیں کہ ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کے ساتھ چلنا ہے لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک تیسری عالمگیر جنگ نہ ہونے پائے تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور باہمی اعتماد بھی پیدا کریں۔ دوراندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ایسی راہیں نکالیں جن سے ہمیں ان مسائل کے حل کرنے میں جن سے آج روس اور جمہوری قومیں دونوں کو واسطہ پڑ رہا ہے، ایک دوسرے سے تعاون کریں۔

تبصرہ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا میں مختلف نظریاتِ زندگی رکھنے والی قومیں دوش بدوش چلتی رہتی ہیں لیکن فطرت کا اٹل قانون یہ ہے کہ بقا اسی نظام کے حصہ میں ہے جو عالمگیر انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔ وَاَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ؕ (۱۳/۱۷) فطرت کا اٹل فیصلہ ہے۔

تیسرا سوال : وہ اہم مسائلِ حیات کیا ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

جواب : سب سے پہلی چیز یہ کہ ہم تیسری جنگِ عظیم کو کس طرح سے روک سکتے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر اگلا سوال یہ ہے کہ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کی حد بندی کیسے کی جائے۔ صحت کے متعلق حفاظتی تدابیر کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی آبادی اس سُرعت سے بڑھ رہی ہے کہ یہ خطرہ ہے کہ ایک دن پوری نوعِ انسان بھوک سے نہ مر جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم افزائشِ نسل کے متعلق اپنی ذہنیت میں جلد سے جلد تبدیلی پیدا کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی عائلی زندگی ہم بسر کر رہے ہیں، اس میں یہ مشکل ہے کہ ہم اپنی عادات کو جلدی سے بدل لیں یعنی یہ مشکل نظر آتا ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں کے ذہن میں یہ بات آسکے کہ بچوں کی تعداد کا مسئلہ ایسا ہے جس میں باہر کی دنیا والے بھی دخل اندازی کا حق رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان بچوں کی غذا اور سامانِ پرورش کا انتظام تو انھی باہر والوں ہی نے کرنا ہے۔

اگر ہم نے جنگ کو روک دیا اور افزائشِ نسل پر بھی پابندیاں عائد کر دیں تو اس کے بعد تیسرا اہم سوال مذہب کے

احیا کا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ انسان آزادی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اس کی روحانی زندگی کا دائرہ ایسا ہے جس میں اسے سب سے زیادہ آزادی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا آنے والی دنیا کا جو نقشہ سامنے آرہا ہے اس میں شاید مذہب کا میدان ہی ایسا ہو گا جس میں انسان کو آزادی حاصل ہوگی۔

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آجکل تین قوتیں ایسی ہیں جو آزادی کے خلاف نبرد آزما ہیں، اور ہمارے معاشرے کو آمریت کی طرف لے جارہی ہیں، یعنی بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ، نئے نئے آلاتِ حرب، اور عمرانی عدل کا تقاضا۔ جہاں تک سیاست اور معیشت کا تقاضا ہے، یہ نظر آتا ہے کہ فرد کی آزادی دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا اگر ہم نے مذہب کے معاملے میں بھی آزادی کو برقرار نہ رکھا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آزادی دنیا سے بالکل معدوم ہوجائے گی۔ اور اگر آزادی ہی معدوم ہوگئی تو پھر انسان، انسان نہیں رہے گا۔

تبصرہ حیرت ہے کہ پروفیسر ٹوئن بی نے قومیت اور رزق کی صحیح تقسیم کو ان اہم مسائل میں شمار نہیں کیا، جو امنِ عالم کے لئے اس قدر خطرہ کا موجب بنے ہوئے ہیں۔ افزائشِ نسل پر پابندیوں کا خیال بجا اور درست لیکن جب تک دنیا کا نظام "ربّ العالمینی" کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ "ربّ العالمینی" کا تصور ہی صحیح آزادی بھی دے سکتا ہے کیونکہ اس کی رُو سے معاشرہ، حکومت یا نظام کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کرے، یعنی اس نظام میں فرد کو معاشرہ کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھایا جاتا بلکہ معاشرہ فرد کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔

چوتھا سوال، اگر مذہب کا احیاء نہ ہوا تو مغرب پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

جواب، اگر ایسا نہ ہوا تو مغرب کا مستقبل خوش آئند نہیں ہوسکے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے مغربی اندازِ زندگی میں فرد کی تقدیس کو اہمیت حاصل ہے۔ کمیونزم انسانی ذات کی قدروقیمت سے انکار کرتی ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ فرد صرف جماعت کے لئے ہوتا ہے۔ اگر ہم نے اپنے مغربی تصورِ حیات کو برقرار رکھنا ہے تو اسے محکم بنیادوں پر قائم کرنا ہوگا۔ اس کی اصلی بنیادیں مذہب ہی پر قائم تھیں۔ ہم اہلِ مغرب کے دلوں میں فرد کی تقدیس کا جو تصور موجود ہے تو اس کا سبب بھی یہی ہے کہ یہودی اور نصاریٰ دونوں کے ہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ خدا کی نگاہوں میں انسانی ذات کی ایک مطلق قدر موجود ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر مذہب نہ رہے تو ہمارا یہ عقیدہ اور کس بنیاد پر قائم رہ سکے گا۔

تبصرہ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی ذات کے تقدس کا تصور وہ محور ہے جس کے گرد امن اور فلاح کا پورا نظام گھومتا ہے لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ تصور یہودیت یا عیسائیت کا عطا فرمودہ ہے۔
یہودیت ہر بنی آدم کو نہیں، بلکہ صرف بنی اسرائیل (بلکہ ان میں بھی صرف دو خاندانوں) کو خدا کی چہیتی اولاد قرار دیتی ہے۔ باقی رہی عیسائیت، سو اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرتًا گناہگار ہوتا ہے۔ نیز وہ بھی غیر اسرائیلیوں کو عزت و تکریم کا مستحق نہیں سمجھتی کیونکہ انجیل کے بیان کے مطابق حواریوں کو تعلیم یہ دی گئی تھی کہ "بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے نہ ڈالو"۔ یہ عظیم اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (17/70)" ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

پانچواں سوال: کیا ہمارا موجودہ دور ایٹم بم اور کمیونزم جیسی بے مثل چیزوں کی رُو سے ایک منفرد دور نہیں ہے۔

جواب: ایٹم بم انسانوں کی تباہی کے لئے "پہلا آلۂ جنگ" نہیں۔ یہ تو اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں اس سے پہلے بارود اور ہوائی جہاز آ چکے ہیں۔ نہ ہی موجودہ اشتراکی حکومتیں وہ پہلی حکومتیں ہیں جنھوں نے کسی خاص آئیڈیالوجی یا مذہب کو شمشیر کے زور پر پھیلانے کا مسلک اختیار کیا ہو۔ جس بات میں ہمارا زمانہ منفرد ہے، وہ یہ ہے کہ جس نوعیت کی لڑائی اب لڑی جاتی ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں لڑی جاتی تھی۔ اس سے پہلے لڑائی کا مفہوم یہ تھا کہ ایک سپاہی میدانِ جنگ میں خطرات کو مول لے کر یا اپنی جان دے کر ان کی محافظت کر رہا ہے جو اس کے پیچھے ہیں لیکن ایٹم بم نے میدانِ جنگ اور سول آبادی کی تفریق ہی کو مٹا دیا ہے۔ اب تو جنگ سے مراد عالمگیر تباہی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ ہمارے ذرائع رسل و رسائل اس قدر تیز ہو گئے ہیں کہ ہم نے گویا فاصلہ کے تصور ہی کو مٹا دیا ہے۔ فاصلہ کے تصور کو مٹانے سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پوری نوعِ انسان ایک خاندان کی شکل اختیار کر لے لیکن ہم نے ایسا کرنے کے بجائے اس چیز کو خود اپنی تباہی کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے جس میں اگر ہم چاہیں تو تمام نوعِ انسانی ایک خوش حال برادری کی طرح بھی رہ سکتی ہے اور یا سب کے سب موت کے گھاٹ اتارے جا سکتے ہیں۔

تبصرہ ظاہر ہے کہ تمام نوعِ انسانی ایک برادری کی شکل اُس وقت اختیار کر سکتی ہے، جب قوموں کے موجودہ دائرے مٹ جائیں اور انسانیت کی تشکیل ایک عالمگیر آئیڈیالوجی پر ہو جائے۔ قرآن ایک ایسے ہی نظام کا عملی تصور پیش کرتا ہے۔

چھٹا سوال: کیا آپ کا خیال ہے کہ مستقبل کمیونزم کے ہاتھ میں رہے گا۔

جواب: نہیں میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ کمیونزم آخرکار انسانوں کے لئے جاذبِ نگاہ بننے میں ناکام رہ جائے گی۔ اس لئے کہ انسانوں کی انفرادی مشکلات اور ذاتی تکالیف میں جس روحانی سہارے یا رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، کمیونزم میں وہ چیز نہیں۔ مجھے کسی ایسے مذہب یا آئیڈیالوجی کا علم نہیں، جو انسانوں کی مشکلات میں سہارا نہ بہم پہنچاتی ہو اور اس کے باوجود وہ ان کے نزدیک جاذبِ نگاہ ہو۔ ان وجوہات کی بناء پر میرا عقیدہ یہ ہے کہ مستقبل کمیونزم کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اُس مذہب کے ہاتھ میں ہے جو انسان کو انفرادی مصائب میں روحانی سہارا دے سکے۔

لیکن اس عقیدے کو عام کرنے کے لئے ہمیں بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ کمیونزم ایک بہت بڑی تحریک ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم اس انتظار میں خاموش بیٹھے رہیں کہ ایک دن نوعِ انسانی کے سامنے کمیونزم کا پردہ خود بخود چاک ہو جائے گا اور یہ اس سے متنفر ہو جائے گی۔ اگر ہم نے سعیِ تبلیغ کی، تو ہم انسانوں کو صحیح راستے پر لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہمارا ایمان صداقت پر مبنی ہے اور صداقت میں وہ قوت ہوتی ہے کہ وہ آخرالامر کامیاب جاتی ہے۔"

تبصرہ آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اتنے بڑے مبصر نے اس مقام پر کتنی بڑی غلطی کھائی ہے۔ کمیونزم تو پیدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ جو مذہب انسانوں کے سامنے تھا، وہ ان کی مشکلات اور مصائب کا صحیح اور عملی حل پیش کرنے کی بجائے انھیں محض "روحانی سہاروں" پر جینے کی تلقین کرتا تھا۔ یہ سہارے صرف عقیدت کی بنیادوں پر قائم رہ سکتے تھے۔ جب انسانوں نے دیکھا کہ وہ سہارے ان مشکلات کا صحیح حل پیش نہیں کرتے تو انھوں نے ان سہاروں کو چھوڑ دیا اور کمیونزم کے آغوش میں چلے گئے۔ کمیونزم کا توڑ اس نظامِ زندگی کے اندر ہے جو افرادِ انسانیہ کی تکالیف اور مصائب کا صحیح حل پیش کرے، یعنی ایسا نظام، جس میں فرد کے سامنے کوئی ایسی تکلیف اور مصیبت آئے ہی نہیں، جس کے دور کرنے کی ذمہ داری تنہا اس پر ڈال دی گئی ہو۔ قرآن ایک ایسا عملی نظام پیش کرتا ہے اور نوعِ انسانی کو ایسا سہارا دیتا ہے جو محض ذہنی اور تصوراتی نہیں ہوتا بلکہ ان کی مشکلات کا حقیقی علاج بنتا ہے۔ پروفیسر ٹوئن بی کے ذہن میں مذہب کا وہ تصور ہے، جسے عیسائیت نے پیش کیا۔ یہ اس تصورِ مذہب کی ناکامی ہی تو ہے جس نے کمیونزم کو جنم دیا ہے۔ لہٰذا اس کے احیاء سے کمیونزم کا مقابلہ کیسے ہو سکے گا؟ کمیونزم کا مقابلہ صرف قرآنی نظامِ ربوبیت کر سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے مغرب کا تحت الشعور قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں خود ان کے نظامِ سرمایہ داری کی بھی تو نفی ہوتی ہے اور جہاں تک پروفیسر ٹوئن بی کا تعلق ہے، انھیں ذرا کھرچ کر دیکھئے، جلد کے نیچے سے کٹر عیسائی نکلیں گے۔

اُردو زبان میں نماز

(جون ۱۹۵۷ء)

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کے بجائے) اُردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کا بیشتر حصّہ قرآنِ کریم پر مشتمل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آجاتا ہے کہ کیا قرآن عربی زبان کے بجائے اُردو زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر، کیا قرآن کا ترجمہ (اردو یا کسی اور زبان میں، حتیٰ کہ خود عربی زبان کے اور الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟ اس سوال کا دوٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے[1] اور ان الفاظ کی جگہ کوئی اور الفاظ، خواہ وہ عربی زبان ہی کے کیوں نہ ہوں، کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے لیکن اس ضمن میں بعض گوشوں سے مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال ہے کہ خدا کی طرف سے نبیٔ اکرمؐ کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہوا تھا، الفاظ نہیں۔ چونکہ حضورؐ کے اوّلین مخاطب عرب تھے، اس لئے آپؐ نے اس مفہوم کو ان لوگوں کی زبان میں بیان فرما دیا۔ لہٰذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں، وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کر لیں، تو یہی قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصوّر، جس کے ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں، اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے۔ یعنی —— نہیں۔

ایک غلط خیال

علّامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ سوال کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبویؐ پر وحی ہوا تھا یا اس کے

[1] ۱۶/۱۰۲ - ۲۰/۱۱۳ - ۱۶/۷۵ - ۲۶/۱۹۵ وغیرہ۔

الفاظ بھی، ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ (مسئلۂ خلقِ قرآن کے سلسلہ میں) بڑی شدید بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن ایک تو اُس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ دوسرے جن لوگوں نے اب اس سوال کو اٹھایا ہے، وہ قدامت پرست طبقہ سے متعلق نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ کے افراد ہیں' اس لئے مناسب یہی ہے کہ ان سے ان کی زبان میں گفتگو کی جائے تاکہ ان کے سامنے حقیقت واضح طور پر آجائے۔

وحی کا انکار

ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم (معاذاللہ) خود نبئ اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا مجموعہ ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خدا کی طرف سے

الفاظ اور خیالات کا باہمی تعلق

القاء ہوتے تھے لیکن ان خیالات کو حضورؐ بیان اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو سرِدست ہمارا مخاطب ہے جنھیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

علّامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں " جان و تن" کے عنوان کے تحت کہا ہے۔

ارتباطِ حرف و معنی، اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قباپوش اپنی خاکستر سے ہے

اس شعر میں انھوں نے نہایت مختصر اور مرتکز انداز سے اس فلسفیانہ بحث کو سمودیا ہے جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس سوال کو انھوں نے اپنے خطبات (خطبۂ اوّل) میں بھی ضمنی طور پر چھیڑا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں؛

> مبہم اور بے زبان احساس (FEELING) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیّل (IDEA) کی شکل اختیار کرتا ہے اور تخیّل اپنا لباس آپ بُن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیّل اور لفظ دونوں احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم (کا نقص) ہے جو یہ تصوّر کرتا ہے کہ تخیّل اور لفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کرلیتا ہے۔ (CONCEPT)

ڈاکٹر بک (R.M.BUCKE) اپنی مشہور کتاب (CONSCIOUSNESS) میں تصوّر اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلے میں لکھتا ہے؛

ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نیا لفظ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا، جب تک وہ کسی تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ (ص ۲۷)

پروفیسر اربن (W.M URBAN) نے اپنی کتاب (HUMANITY AND DEITY) میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وجدان (INTUITION) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروش (CROCH) کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ

الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شے کا تصور کرے اور اس کے بعد اس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے۔ یہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے (ص ۵۳) اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص ۲۹۷)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ

جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے، اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص ۲۹۷)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (POETRY) کو بطورِ مثال پیش کیا ہے، جس سے مطلب یہ ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کرکے وہ بات پیدا ہی نہیں کرسکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق قرآن کے اس دعوے کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظہٖ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزّل من اللہ کتاب ہے، یعنی اس کے الفاظ منزّل من اللہ ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

عربی زبان کی وسعت

اوّل تو عربی زبان ہی ایسی وسیع، گہری اور جامع ہے کہ (ماہرینِ علم السنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ (حتّٰی کہ سائنٹیفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر بک کی جس کتاب کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اس میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ (یہ بحث اس وقت ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خارج ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میری "لغات القرآن"

میں آئے گی، جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوّت و حکومت کے لئے منتخب کیا تھا' دوسری طرف بنی اسماعیل کے ذمّے (گویا) یہ فریضہ عائد کر دیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (DEVELOPE) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔ یہ ہے وہ عربی زبان' جس کے ان الفاظ میں' جنھیں خود خدا نے منتخب کیا' قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہو سکتے ہیں؟ بدل ہونا تو ایک طرف' قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس کے پورے مفہوم کو ادا کر سکے۔ یہ وہ حقیقت ہے، جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گب (H.A.R. GIBB) اس باب میں لکھتے ہیں:۔

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا

جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جا سکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح (کسی حسین و جمیل) تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے پیچ و خم اور اس کے رنگوں کے لطیف اور نازک فرق کا، ایک طویل مدت تک نہائیت غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط و الوان ہی کا نہیں بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرنے میں اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل' جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اُڑنے والے شاہین وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں! آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ' جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں' ایسے الفاظ لے آتے ہیں، جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے

قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو، اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا، تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی وقفوں کو بھی لے آئیں۔ (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہوا) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز، بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگم سا اثر ہوگا۔ (مثلاً قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (۵۰/۴۳) انگریزی کیا، دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کرسکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔ (MODERN TRENDS IN ISLAM)

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام۔ آپ سوچئے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں؟

ہمارے تراجم کا اثر

اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن کے اپنے الفاظ، گِبّ جیسے غیر مسلم کے دل میں اثر و جذب کا ایک حشر برپا کر دیتے ہیں لیکن جب ہم (مسلمان) اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے۔ اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ قٓ کی اسی آیت کو لیجئے، جسے گِبّ نے پیش کیا ہے۔ وہ ان لفظوں میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے وجد میں آرہا ہے۔ اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

تحقیق ہم جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گِبّ نے جو ترجمہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

(VERILY WE GIVE LIFE AND DEATH AND UNTO US IS THE JOURNEYING)

اسی قسم کے تراجم، مارماڈیوک پکتھل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل الفاظ سے گِبّ کے دل پر ہوا ہے؟

اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے تخیل طیب کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیش نظر

میں نے " لغات القرآن " کے بعد جب " مفہوم القرآن " کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی کسی طرح نہ اصل کا بدل ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پا سکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی، تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سندِ دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ بالکل واضح ہیں۔ اس باب میں (مشہور مؤرخ) ڈاکٹر ٹوئن بی اپنی کتاب (AN HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION) میں لکھتا ہے؛

> عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفۂ یونان کی اصطلاحات میں کیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں۔ اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانۂ مابعد کی سائنٹفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا، وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں۔ لہٰذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں زمان کی قید سے ماوراء تھیں۔ (ص ۱۳۶)

لہٰذا قرآن کا جو مفہوم بھی کسی ایک دور میں بیان کیا جائے ' وہ وقتی ہو سکتا ہے ' ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے اپنے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ قرآن کا ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ متن کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں) قرآن کی آیات آنی چاہئیں، وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ عربی زبان کے بھی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جا سکتے اور چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے، اس لئے اُردو زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آجکل پڑھی جا رہی ہے، اس میں لوگ (باستثنائے چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور انہیں بغیر سمجھے یوں ہی دہرائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس کی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں، جن کا ہم مطلب سمجھ رہے ہوں۔

بلا سمجھے الفاظ کا دُہرانا

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں، وہ نماز بے مقصد اور بے روح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے

روکا ہے۔ سورۂ نسا میں ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ (۴/۴۳) اے ایمان والو! تم جب نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ، جب تک تم یہ نہ جانو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس آیت میں حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ سے اس حکم کی علتِ غائی سامنے آجاتی ہے، یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے، جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پر نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اس کا علم نہ رکھے یا جہالت کی بناء پر ایسا ہو، تو حکم دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے، ان کے دُہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔[1] یہ قرآن کی کھُلی ہوئی تعلیم ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے، جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے، تو پھر ان الفاظ کی جگہ اُردو کے الفاظ کیوں نہ بولیں؟

سر درد کا علاج

ایسا کہنے کے معنی یہ ہیں کہ دردِ سر کا علاج سر کاٹ ڈالنا ہے۔ یہ غلط ہے۔ دردِ سر کا علاج سر کا کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اس علّت کا ازالہ ہے جو دردِ سر کا موجب ہے، یعنی اس جہالت کا دُور کرنا، جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معنی نہیں سمجھے جاتے۔ بنائً بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ہم حکومت پر زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو۔[2]

(۲) ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔

(۳) ثانوی سے آخر تک عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔

اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آجائے گا۔

عربی، اُردو نماز

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ اُردو ترجمہ بھی دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً

۱۔ اس وقت نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ باجماعت نماز میں بھی فرضوں کے

---

[1] میں اپنے موضوع سے بہت دُور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بلے سمجھے دہرانا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

[2] قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہوگی لیکن آغازِ کار کے لئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اُٹھ جائیگا۔

علاوہ، باقی نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کرلیں گے کہ امام کی عربی قرأت کے ساتھ اُردو کے الفاظ بولتے جائیں لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہوگی؟

۲۔ نیز جن نمازوں میں، یا فرضوں کی جن رکعتوں میں قرأت بلند آواز سے نہیں ہوتی، ان میں اُردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا؟ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے، ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ایسا ہوگا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اُردو ترجمہ پکار کر کہے؟

۳۔ یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے اُمت میں ایک نئے فرقے کا اضافہ کردیں گے۔ یہ ایسا جُرم ہوگا جو ان تمام (مزعومہ فوائد) کو لے ڈوبے گا، جس کے پیشِ نظر آپ اس جدت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے اور شرک جرم عظیم۔

نئی نماز

ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے، اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیّز ہوتی ہے تو خود اس فرقہ کا وجود معرضِ خطر میں پڑجائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے، وہیں اس سے بچنے کے لئے "وحدتِ صلوٰۃ" کا ذکر کردیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (۳۰/۳۱-۳۲)

"تم صلوٰۃ قائم کرو اور (مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ یعنی ان میں سے جنھوں نے دین میں فرقے پیدا کردیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔"

میرا مسلک

یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ) اس کی شدت سے تلقین کرتا چلا آرہا ہوں کہ اس وقت جس جس طریق سے نماز پڑھی جارہی ہے اس میں کسی قسم کے ردّ و بدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم کے ردّ و بدل سے مختلف فرقوں کی نماز میں وحدت تو پیدا نہیں ہوسکے گی، البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہوجائے گا۔[۱] وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں اور وحدت

---

[۱] آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس تلقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اُمت، صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک اُمت میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا، نماز میں کسی قسم کی جدّت پیدا کرنا، اُمت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے، جس کے مقابلہ میں حضرت ہارونؑ نے کچھ وقت کے لئے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا تھا۔ (دیکھئے ۲۰/۹۴) لہٰذا جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نماز اُردو یا اُردو۔ عربی نماز کی جدّتیں پیدا کر رہے ہیں، وہ دین یا اُمت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے۔ الٹا اسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو، اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں، تو اور کیا ہے؟

پھر یہ بھی سوچئے کہ جب جماعت میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ شریک ہوں گے تو آپ عربی الفاظ کا ترجمہ کون سی زبان میں کریں گے؟ کیا ان تمام زبانوں میں جنھیں مقتدی سمجھتے ہوں؟ اس سے جو صورتِ حال پیدا ہو گی، اُسے تصور میں لایا جا سکتا ہے!

بہرحال یہ ہیں اس تحریک کے خطرناک پہلو۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے، جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے، یعنی قوم کی جہالت دُور کرنے اور اسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

(بقیہ گذشتہ ورق سے) یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے۔ اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے، لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن کے باطنی معانی

جون ۱۹۵۷ء

(چند اہم اشارات)

اللہ تعالیٰ نے وحی کے متعلق ایک اصول بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِہٖ ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔ لِیُبَیِّنَ لَہُمۡ (۱۴/۴) تاکہ وہ ان کے لئے خدا کے پیغامات کا اظہار واضح کر دے۔

یعنی وہ اصول یہ ہے کہ خدا کی وحی، اس رسول کی اولین مخاطب قوم کی زبان میں آتی ہے اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم اس وحی کا مطلب سمجھ لے۔ اس کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَکَذٰلِکَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَمَنۡ حَوۡلَہَا (۴۲/۷)۔ نیز (۴۶/۱۲)

اور اس طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اہلِ مکہ اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو (ان کی غلط روشِ زندگی کے عواقب سے) متنبہ کر دے۔

عربوں کی زبان میں لفظ عَرَبِیّ کے معنی عربوں کی "زبان" بھی ہے اور "واضح" بھی۔ لہٰذا "قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا" کے معنی ہوں گے وہ قرآن جو عربی زبان میں ہے اور واضح ہے۔ دیگر مقامات میں اسے عَرَبِیٌّ مُّبِیۡنٌ کہہ کر بات کو اور واضح کر دیا۔ مثلاً سورۂ نحل میں ہے۔ وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّہُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُہٗ بَشَرٌ۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس رسول کو کوئی آدمی آ کر سکھا جاتا ہے۔ لِسَانُ الَّذِیۡ یُلۡحِدُوۡنَ اِلَیۡہِ اَعۡجَمِیٌّ۔ ایسا کہتے وقت یہ اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس آدمی کی طرف یہ اشارہ کرتے ہیں (کہ وہ آ کر رسول کو سکھا جاتا ہے) اس کی زبان اعجمی ہے۔

وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ (۱۶/۱۰۳) اور یہ قرآن نہایت واضح، کھلی کھلی عربی زبان میں ہے۔ اعجمی کے معنی غیر عرب کی زبان بھی ہے اور غیر واضح زبان بھی۔

دوسری جگہ ہے۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ اگر ہم قرآن کو اعجمی زبان میں نازل کرتے (یعنی کسی غیر عرب کی زبان میں یا غیر واضح زبان میں) تو یہ کہتے کہ اس کی آیات تو صاف اور واضح نہیں ہیں۔ ان سے کہو کہ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (۴۱/۴۴) یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ رسول تو عربی ہو اور اس کا پیغام اعجمی! یہ وجہ ہے کہ یہ قرآن بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (۲۶/۱۹۵) واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۲/۲ ، ۴۳/۳) تاکہ تم لوگ اسے سمجھ سکو۔ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ (۱۹۹-۱۹۸/۲۶) اگر ہم اس قرآن کو عجمیوں میں سے کسی پر نازل کرتے اور وہ انھیں پڑھ کر سناتا تو یہ اس پر کبھی ایمان نہ لاتے۔

سورۂ حٰمٓ میں ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۴۱/۳)

ایسی کتاب جس کی آیات کھلی اور نکھری ہوئی ہیں۔ یعنی عربی زبان کا قرآن اس قوم کے لئے جو اس کا علم رکھتی ہے۔

قرآن کے ان مقامات سے واضح ہے کہ قرآن عربی زبان کی کتاب ہے اور اس کی زبان بھی ایسی ہے جو واضح اور صاف، کھلی اور نکھری ہوئی ہے۔ عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (۳۹/۲۸) ایسی عربی زبان جس میں کوئی پیچ وخم نہیں، کوئی اُلجھاؤ اور لپیٹ نہیں۔ یہ وہ زبان تھی جسے عرب بالعموم اور اُمّ القریٰ (مکّہ) اور اس کے گرد و پیش کی آبادیاں بالخصوص بغیر کسی دقّت اور تکلیف کے بلا تامّل و توقّف سمجھتی تھیں۔ زبان الفاظ کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن کے الفاظ وہ تھے، جن کے معانی وہ لوگ بلا تکلف سمجھتے تھے۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کے الفاظ کے وہی معانی تھے جو معانی ان لوگوں کی زبان میں مستعمل تھے۔

یہ پوزیشن تھی قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی کی ظہورِ اسلام کے زمانے میں۔ اس کے بعد جب ہم تاریخ کے کچھ اوراق آگے الٹتے ہیں اور اس دور میں پہنچتے ہیں، جب ایرانی، یہودی اور عیسائی، اپنے قدیم عقائد و تصوّرات کو ساتھ لے کر اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور اس طرح مسلمانوں میں (دیگر غیر قرآنی تصوّرات کی طرح) تصوّف بھی عام ہو رہا تھا، اس وقت یہ عقیدہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے ایک معانی تو وہ ہیں جو اس کے الفاظ سے

ظاہرا طور پر متعین ہوتے ہیں لیکن دوسرے معانی وہ ہیں جو ان الفاظ کے باطن میں پنہاں ہیں اور یہ باطنی معانی قرآن کے اصلی اور حقیقی معانی ہیں۔ ہمیں اس زمانے میں یہ عقیدہ ملتا ہے اور جیسا کہ اس زمانے میں عام رواج ہو چکا تھا، اس عقیدہ کی تائید میں اس قسم کی وضعی حدیثیں بھی ملتی ہیں کہ

ما من آیة الا ظہر منہا وما باطن۔

ہر آیت کا ایک ظاہری مفہوم ہوتا ہے اور ایک باطنی۔

حالانکہ جو شخص (قرآن تو ایک طرف) زمانۂ ظہور نبویؐ کے عربوں کے مزاج اور خصائصِ ذہنی پر نگاہ رکھتا ہے، وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہے کہ عربوں کے ہاں "باطنی تعلیم" کا تصور تک نہ تھا۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ الفاظ کے باطنی معانی بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں احادیث کے جو مجموعے ہیں، ان میں وضعی حدیثیں بھی ہیں اور صحیح بھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان میں قرآن کی کسی آیت کی تفسیر میں یہ نہیں لکھا کہ فلاں لفظ کے باطنی معانی یہ ہیں۔ بہرحال قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس میں کوئی اشارہ تک بھی ایسا نہیں ملتا کہ اس کے الفاظ کے باطنی معانی بھی ہیں اور جب قرآن اس قسم کا تصور نہیں دیتا، تو ایسی حدیثیں، جن سے اس تصور کی تائید ملتی ہے، لامحالہ وضعی اور جعلی ہیں۔

قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، مختصر الفاظ میں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ "باطنی معانی" کا مطلب کیا ہے اور یہ تصور آیا کہاں سے ہے؟ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں جن توہم پرستیوں میں ماخوذ تھا ان میں سب سے گہری چیز سحر کا عقیدہ تھا۔ اس عقیدہ کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ علمائے عمرانیات انسانی تاریخ کے اس دور کا نام ہی عصرِ سحر (MAGIC AGE) قرار دیتے ہیں۔ سحر کی بنیاد ہی اس عقیدہ پر ہے کہ ہر لفظ اور ہر عدد کی تہہ میں ایک باطنی معنی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اس باطنی معنی کا احاطہ کرے تو اس سے عجیب و غریب کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ جادو کے منتر (یا تعویذ) جو اب بھی مروج ہیں، ایسے الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں جو یا تو بالکل بے معنی ہوتے ہیں اور اگر ان کے الفاظ بامعنی ہوتے ہیں، تو عبارت بالکل مبہم ہوتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ان منتروں میں الفاظ کے ظاہری معانی سے سروکار ہی نہیں ہوتا مطلب ان کے باطنی معانی سے ہوتا ہے۔

افراد کی طرح اقوام بھی اپنے زوال کے زمانے میں اس قسم کی توہم پرستیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد، بابل کی اسیری کے زمانے میں، یہودی قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس زمانے میں ان کا رجحان باطنی تعلیم اور سحر پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ (اگرچہ ان میں اس کے آثار اس سے پہلے بھی پائے جاتے تھے لیکن اس نے شدت اسی زمانے میں اختیار کی تھی) اس کا سب سے پہلا اثر یہ تھا کہ انھوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ

تورات کے الفاظ کے ظاہری معنوں کے ساتھ باطنی معانی بھی ہیں۔ چنانچہ یہودی تصوّف کی سب سے اہم کتاب زھار میں ہے کہ

> تورات کی روح درحقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پا جائے۔

ان باطنی معانی کے متعلق تاکید تھی کہ ان کا علم خواص تک محدود رہے۔ عوام ان سے مطلع نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ مشنا ("کتابِ حقیقت") میں لکھا ہے کہ

> کتابِ پیدائش کے باطنی معانی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دینی چاہیئے اور کتابِ حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہیئے تاوقتیکہ اس نے مقامِ ولائیت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ باطنی معانی اور حروفِ ابجد کے اعداد عجیب وغریب تاثیر کے حامل ہیں۔ ان حروف و اعداد کے متعلق کتابِ زھار میں ہے۔

> خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں اُدل بدل کیا انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا اور ان کے پراسرار مجموعہ سے کائنات کی ہر شے کی رُوح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ موجود ہے، وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

یہودیت سے یہی عقیدہ عیسائیت میں آیا۔ اِدھر ایران میں مجوسیّت باطنی تعلیم کا گہوارہ تھی۔ یہ تھا وہ زمانہ جس میں قرآن نازل ہوا جو ان تمام توہم پرستیوں کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ علم وحقیقت کی دنیا میں الفاظ کے باطنی معانی کا کوئی دخل نہیں۔ قرآن علم کی بناء پر نازل ہوا ہے اور اس کے معانی صاف، واضح، غیر مبہم اور بیّن ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں جو بسیط حقائق ABSTRACT TRUTHS آئے ہیں، انہیں بھی محسوس تشبیہات میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تشبیہات سے کیا بات سمجھانی مقصود ہے، اس کی بابت علم کی پختگی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ (۳/۶)۔ یہ تھی قرآن کی تعلیم، لیکن جب بعد میں یہودیت، عیسائیت اور مجوسیّت کے عقائد و مسالک، چور دروازے سے اسلام میں داخل ہو گئے، تو ہمارے ہاں بھی یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ (تورات کی طرح) قرآن کے الفاظ کے بھی باطنی معانی ہیں اور انہی معانی سے قرآن (بلکہ ذاتِ خداوندی) کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ

عباسیوں کے ابتدائی دَور میں ہی پیدا ہو گیا تھا لیکن جس شخص نے اسے ایک منظّم فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا، وہ ہسپانیہ کے مشہور صوفی محی الدین ابنِ عربی ہیں، جنھیں عام طور پر شیخ اکبر کہا جاتا ہے۔ انھوں نے فتوحاتِ مکیّہ اور فصوص الحکم میں اپنے باطنی عقائد کو بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے۔ وہی فصوص الحکم، جس کے متعلق علاّمہ اقبال نے کہا ہے کہ

اس میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔　　(اقبال نامہ، جلد ۱، صـ ۴۴)

شیخ اکبر کے ملفوظات اور یہودیوں کی کتاب زہاآر کو آمنے سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ یہ دونوں کس حد تک ملتے جلتے ہیں۔ انھوں نے قرآن کی تفسیر اس کے الفاظ کے باطنی معانی کی رُو سے کی ہے۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہے، اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآنِ کریم میں زمین (الارض) کے متعلق ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ۔ (۲۰/۵۵) ہم نے تمھیں اس (زمین) سے پیدا کیا ہے۔ اس میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے

ابنِ عربی وحدت الوجود کے عقیدے کے علمبردار ہیں۔ چنانچہ وہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

> ہم سب احدیّت سے نکلے تھے۔ فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے، پھر بقا ملے گی اور دوبارہ نمودار ہوں گے۔　　(فصوص الحکم)

یہاں سوال پیدا ہوگا کہ "الارض" کا مفہوم احدیت (ذاتِ خداوندی) کس طرح لیا گیا۔ اس کے متعلق شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ

> اولیاء ان کے متعلق براہِ راست رسولِ خداؐ سے دریافت کر لیتے ہیں۔

بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ

> جس مقام سے نبی لیتے تھے، اسی مقام سے انسانِ کامل، صاحب الزّماں، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اسی کی تشریح میں دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ

> ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالےٰ سے لے لیتے ہیں۔

یہ ہے الفاظِ قرآنی کے "باطنی معانی" کی سند! یہ ایسی سند ہے جس کا کوئی ثبوت ہی نہیں مانگ سکتا۔ اس لئے کہ ثبوت مانگنے پر جواب یہ ملے گا کہ رات ہم دربارِ خداوندی میں گئے تھے، وہاں ہم نے اللہ میاں کو خود یہ معانی بیان کرتے ہوئے سُنا۔

فرمائیے اس کے بعد آپ کیا کہیں گے۔ حتیٰ کہ جب یہ لوگ اس قسم کی تعلیم پیش کریں گے کہ ذوالنون

کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے کہ انا ربکم الاعلیٰ کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصوص الحکم)

تو آپ اس پر بھی معترض نہیں ہو سکیں گے کیونکہ وہ کہیں گے کہ یہ قرآن کی فلاں آیت کا باطنی مفہوم ہے جسے ہم نے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے معلوم کیا ہے اور یہی مفہوم حقیقی اور اصلی ہے۔ جو مفہوم الفاظِ قرآنی کے ظاہری معانی کی رُو سے متعین کیا جاتا ہے، وہ "بچوڑی ہوئی ہڈیوں" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ مولانا رومؒ کا یہ مشہور شعر انہی باطنی معنی کے متعلق ہے۔

ما ز قرآں مغز را برداشتیم
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

آپ غور کیجئے کہ یہ قرآن کے خلاف کتنی بڑی سازش تھی۔ اس سے اسلام کو جو نقصان پہنچا، اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا کسی قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت لطیف (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔

(اقبال نامہ، جلد ۱، ص ۳۵)

اُس دن سے آج تک ہمارے ہاں یہ طریق مسلسل چلا آرہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن ہمارے ہاں عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور ہر اس عقیدہ اور تصور کا نام اسلامی تعلیم قرار پا چکا ہے جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ چونکہ اسی طریق (قرآن کے باطنی معانی متعین کرنے کے طریق) کے ایجاد یا اختیار کرنے والے اسلاف کے گرد تقدس کا نورانی ہالہ قائم ہو چکا ہے، اس لئے جذبات کی رَو میں بہہ جانے والے اس طریق کی مدافعت کرتے اور اسے مسلسل آگے بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۔ (۱۳/۳۷)

اور اس طرح ہم نے اس قرآن کو عربی میں فیصلے دینے والی کتاب بنا کر بھیجا ہے۔ اگر تو اس علم کے آجانے کے بعد ان کے جذبات کی اتباع کرے گا تو خدا کے خلاف تمہارا کوئی کارساز اور بچانے والا نہیں ہوگا۔

قرآن کی موجودگی میں باطنی معنی کے عقیدہ اور مسلک کی تائید اور مدافعت وہ جذبات پرستی ہے، جس سے قرآن نے اس شدت سے روکا تھا۔

آخر میں ہم اسے پھر دہرانا چاہتے ہیں کہ قرآن عربی زبان کی واضح اور بیّن کتاب ہے۔ اس کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ

(۱) پہلے یہ دیکھا جائے کہ عربی زبان میں اس کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔

(۲) پھر اس پر غور کیا جائے کہ معاملۂ پیشِ نظر کے متعلق قرآن نے دیگر مقامات میں کیا کہا ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹)

قرآن کی تشریح (اس کے معانی کو اُبھار کر سامنے لانا) ہمارے ذمے ہے۔

اس کی آیات کی تفصیل خود خدا نے کی ہے۔

کِتَابٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (۱۱/۱)

یہ وہ کتاب ہے جس کی آیات پختہ بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے خدا کے ہاں سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

قرآن کی یہ تفصیل وتبیین، تصریفِ آیات (یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے) کی گئی ہے۔

وَکَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَہٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ (۶/۱۰۶)

اور اس طرح ہم آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ وہ کہہ دیں کہ تو نے سب کچھ سمجھا دیا ہے اور تاکہ ہم اہلِ علم کے لئے اس کی تبیین کردیں۔

اس کے لئے کسی ایک موضوع کے متعلق قرآن کے تمام متعلقہ مقامات کا سامنے رکھنا ضروری ہے۔

اس کے بعد

(۳) اس کا اطمینان کر لیا جائے کہ جو مفہوم متعین کیا جا رہا ہے، وہ قرآن کے کسی مقام کے خلاف تو نہیں۔ اس لئے کہ قرآن نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی یہ دلیل دی ہے کہ

لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (۴/۸۲)

اگر یہ قرآن اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ اس میں بہت سے اختلاف پاتے۔
یہ ہے قرآن کے سمجھنے کا طریقہ۔ اس قرآن کے سمجھنے کا، جس کے متعلق خدا نے خود کہہ دیا ہے کہ یہ سمجھنے کے لئے بڑا آسان ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۔ (۵۴/۱۷)

''اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے بڑا آسان بنایا ہے۔ کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے؟''

اس کی یہ آسانی اس کی زبان کی آسانی ہے۔

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۴۴/۵۸ ف ۱۹/۹۷)

ہم نے اسے تیری زبان میں آسان بنا دیا ہے تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کر سکیں۔

اس قسم کی روشن اور جگمگاتی کتاب (۴/۱۷۵) کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے معانی باطنی ہیں، کتاب کے دعاوی کو جھٹلانا ہے۔ جو کتاب بَيَانٌ لِّلنَّاسِ (۳/۱۳۷) اور تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۶/۸۹) ہو، اس کے مطالب و معانی میں بطون کا کیا کام؟ بَيَانٌ کے تو معنی ہی ظُهُورٌ (MANIFESTATION) کے ہیں۔ بَيَّنَ الشَّجَرُ کے معنی ہیں درختوں کے پتے باہر نکل آئے۔ بَيَّنَ الْقَرْنُ کے معنی ہیں سینگ ابھر کر باہر نکل آیا۔ ایسی کتاب کے معنی کو مخفی اور مستور سمجھنا، کتاب کے خلاف محاذِ جنگ قائم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟

آپ ذرا اس نکتہ پر غور کیجئے۔ ایک شخص قرآن کی کسی آیت کے الفاظ کے معانی محاورۂ عرب کے مطابق متعین کرتا ہے اور آیت کے مفہوم کی تائید قرآن کے دوسرے مقامات سے بھی لاتا ہے۔ آپ کو اس میں کوئی سقم نظر آتا ہے، تو آپ اسے بتا سکتے ہیں کہ اس نے لغت میں فلاں مقام پر غلطی کھائی ہے اور اس کا پیش کردہ مفہوم قرآن کے فلاں مقام سے متصادم ہوتا ہے۔ اس طرح صحت و سقم میں بآسانی تمیز ہو سکتی ہے لیکن اگر ایک شخص کا دعویٰ یہ ہو کہ اس نے اس آیت کا مفہوم الفاظِ قرآنی کے باطنی معانی کی رُو سے متعین کیا ہے تو آپ اس کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً اگر وہ یہ کہے کہ باطنی معانی کی رو سے خمر سے مراد (معاذ اللہ) عمرؓ ہیں اور میسرہ سے (پناہ بخدا) ابوبکرؓ[1]۔ تو فرمایئے اس کے خلاف آپ کیا کہہ سکیں گے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ اپنے پیش کردہ باطنی

---

[1] ایسا کہا جاتا ہے۔ (پناہ بخدا)

معانی کو صحیح قرار دیں، اور دوسروں کے پیش کردہ باطنی معانی کو غلط!

آپ نے غور فرمایا کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے؟ یاد رکھئے! خدا کی کتاب صاف اور واضح عربی زبان کی کتاب ہے، جس کے باطنی معانی کوئی نہیں۔ باطنی معانی کا عقیدہ ہی غیر قرآنی ہے اور اسلام کے خلاف سازش۔ فھل من مدکر۔

لاہور کا ایک علمی مذاکرہ

(فروری ۱۹۵۹ء)

نظارتِ دینیہ و عربک سوسائٹی، دیال سنگھ کالج، لاہور کی طرف سے ۱۴ جنوری ۱۹۵۹ء تین بجے دن کے لئے ایک علمی مذاکرہ کا اعلان ہوا جس کا عنوان تھا "اسلام، سائنس اور علومِ مشرق"۔ صدارت کے لئے جسٹس شیخ محمد شریف صاحب، سابق چیئرمین اسلامک لا کمیشن کا نام تجویز کیا گیا تھا۔ مذاکرہ میں حصہ لینے والوں کے اسماء گرامی میں لاہور کے اکثر اربابِ علم و فکر شامل تھے اور پرویز صاحب کو منجملہ مبصّرین دعوت دی گئی تھی۔

محترم پرویز صاحب کو اس کا علم اس وقت ہوا جب مذاکرہ سے ایک دن پہلے مطبوعہ پروگرام ان تک پہنچا۔ بایں ہمہ، دیال سنگھ کالج کے طلباء سے سابقہ مراسم کی رعایت سے وہ شریکِ مذاکرہ ہوئے لیکن صرف مبصر کی حیثیت سے۔ اجتماع لاہور کی روایات کا آئینہ دار تھا۔ علاوہ مختلف کالجوں کے طلباء اور پروفیسر حضرات کے، شہر کے اربابِ فکر و بصیرت کی اچھی خاصی تعداد بھی شریکِ اجتماع تھی اور ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ابھی ڈاکٹر رفیق احمد خان اور علامہ علاؤالدین صدیقی ہی تقریر کر پائے تھے کہ صدر نظارتِ دینیہ (مرزا عبدالحمید صاحب) نے یکایک اعلان کر دیا کہ اب چوہدری غلام احمد پرویز، اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں گے۔ حاضرین کی طرف سے اس اعلان کا گرمجوشی سے استقبال ہوا۔ جیسا کہ ظاہر ہے، اعلان غیر متوقع (اور پروگرام کے خلاف) تھا لیکن چونکہ یہ جناب معلّن کے، پرویز صاحب کے ساتھ ان دیرینہ مراسم پر مبنی تھا جس کا انہوں نے اعلان کے ساتھ اظہار فرمایا تھا، اس لئے پرویز صاحب کے لئے مجالِ انکار نہ تھی۔ چنانچہ وہ اُٹھے اور دس پندرہ منٹ کے اندر (جو وقت مقررین کے لئے طے شدہ تھا) برجستہ تقریر فرمائی جسے قارئین کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

(طلوعِ اسلام)

صدرِ محترم و برادرانِ عزیز!

اس مذاکرہ میں موضوع زیرِ بحث یہ ہے کہ اسلام اور سائنس کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ سائنس سے مراد وہ علوم ہیں، جن کی رُو سے خارجی کائنات (اور خود انسان کی طبعی زندگی) کے متعلق تحقیق کی جاتی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ اس تحقیق کا مدار ان معلومات پر ہوتا ہے جو حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف جب ہم اسلام کے متعلق گفتگو کریں گے، تو ہمیں اس کے اوّلین اور اساسی سرچشمہ قرآنِ کریم کی طرف آنا ہوگا۔ قرآن علومِ سائنس کی کتاب تو ہے نہیں کہ اس میں کیمیا اور طبعیات کے فارمولے اور ایٹم بم بنانے کے طریقے درج ہوں۔ وہ ایک ضابطۂ حیات ہے جو انسان کے قلب ونگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے، جس سے ہر شے کا صحیح مقام سامنے آجاتا ہے۔ لہٰذا (سمٹ سمٹا کر) سوال کی شکل یہ رہ جاتی ہے کہ قرآن خارجی کائنات اور ادراک بالحواس (SENSE-PERCEPTION) کے متعلق انسان کو کس قسم کا نقطۂ نظر دیتا ہے؟ کیا زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے؟ ان مسائل کے متعلق اس کا (ATTITUDE) کیا ہے؟ اگر وہ نقطۂ نگاہ سامنے آجائے تو اس سے اسلام اور علومِ سائنس کا تعلق واضح ہو جائے گا۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس باب میں قرآن کا نقطۂ نظر پیش کروں، چند الفاظ میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نزولِ قرآن سے پہلے خارجی کائنات اور ادراک بالحواس کے متعلق دنیائے مذاہب کا (ATTITUDE) کیا تھا۔ اس پس منظر میں، قرآن کا نقطۂ نگاہ زیادہ واضح طور پر سامنے آسکے گا۔

جب ہم علم و فکر کی تاریخ کے متعلق بات کریں گے تو ہماری نگاہ لامحالہ خطۂ یونان کی طرف اٹھے گی، جہاں کے حکماء کو اس باب میں اوّلیت کا مقام حاصل ہے۔ ان حکماء میں سقراط اور افلاطون کی جو حیثیت ہے، وہ اربابِ علم کی نگاہوں میں پوشیدہ نہیں۔ سقراط کے نزدیک خارجی کائنات اس قابل ہی نہیں کہ اسے کسی توجّہ کا مستحق قرار دیا جائے۔ وہ انسان کے لئے مطالعہ کا موضوع خود انسان کو قرار دیتا ہے۔ افلاطون اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ محسوس کائنات کا درحقیقت وجود ہی نہیں۔ حقیقی وجود عالمِ امثال (WORLD OF IDEAS) کا ہے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے، وہ اس عالم کا سایہ بلکہ ہماری نگاہوں کا فریب (ILLUSION) ہے لہٰذا جو معلومات ہمیں حواس کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں، وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ ان پر اعتماد کیا جاسکے۔

افلاطون کا یہ نظریہ اگر فلسفہ کی دنیا تک محدود رہتا، تو کچھ زیادہ نقصان کا موجب نہ بنتا لیکن یہ انسانیّت کی بدبختی تھی کہ اس سے مذہب کی دنیا بھی متاثر ہوگئی اور یہ نظریہ ان کے نزدیک عین حقیقت بن گیا۔ ہندو دھرم (بلکہ ان کے تصوف

ویدانت) کی رُو سے پراکرتی (مادہ) مایہ (فریب) کا جال ہے، سراب ہے۔ کائنات ایشور کا خواب ہے۔ جب اس کی آنکھ کھل جائے گی، تو ہستی اور اس کے تمام مناظر خود بخود معدوم ہو جائیں گے۔ کائنات کے متعلق اس تصور کا لازمی نتیجہ تھا کہ مادی دُنیا کو قابلِ نفرت سمجھا جائے۔ اس سے دُور بھاگا جائے۔ یہاں کی ہر شے کو حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ چنانچہ ان کے ہاں یہی مسلک مذہب کا منتہٰی اور انسانی زندگی کا کمال سمجھا گیا۔

دنیا کے متعلق یہی تصوّر بُدھ مت کی بنیاد ہے اور اسی پر عیسائیت کی عمارت استوار ہے۔ یہ تھا افلاطونی نظریّہ کا اثر، جس نے پوری کی پوری دنیا کے مذاہب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا کہ اتنے میں قرآن کا نزول ہوا اور اس نے طلسمِ افلاطون کی دھجیاں فضا میں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی پوری تائیدات کے ساتھ اس انسانیت کُش تصوّر کو چیلنج دیا اور حتم و یقین کے ساتھ للکار کر کہا کہ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ (۳۸/۲۷)

ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل پیدا نہیں کیا۔ جو ایسا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔

یہ انداز منفیانہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مثبت طور پر اعلان کیا کہ

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۲۹/۴۴)

اللہ نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس میں حقیقت کو تسلیم کرنے والوں کے لئے بہت بڑی نشانی ہے۔

کائنات کے متعلق یہ پہلی آواز تھی جو "مذہب" کے اسٹیج سے بلند ہوئی اور اس نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات حقیقت (REALITY) ہے، فریبِ نگاہ نہیں ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ اس پر پوری سنجیدگی سے (SERIOUSLY) غور و فکر کیا جائے۔ یہ یونہی رائیگاں جانے کے لئے (باطل) پیدا نہیں کی گئی۔ اس کی تخلیق کے پیچھے بہت بڑا مقصد (PURPOSE) ہے۔ یہ خواب نہیں، فی الواقعہ موجود ہے۔ جو اسے فریبِ نگاہ اور سراب سا سمجھتے ہیں، وہ کافر ہیں۔ ان کا یہ نظریّہ علم و حقیقت پر مبنی نہیں، ظن و قیاس پر مبنی ہے۔ ان کے برعکس، جو لوگ اسے حقیقت (REALITY) سمجھتے ہیں، وہ مومن ہیں اور ان کے لئے اس میں حقائق کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

کائنات کے متعلق (صحیح اور غلط) تصوّر کو کفر اور ایمان کا مدار قرار دینا، نہ صرف دنیا کے مذاہب بلکہ جہانِ فکر و

نظر کے لئے بھی بڑی اچنبھے کی بات تھی۔ قرآن کی اس انقلاب آفریں آواز نے، کاروانِ انسانیت کا رُخ ایک نئی سمت کی طرف موڑ دیا۔ اس سے دنیا کو کیا کچھ حاصل ہوا، اس کے متعلق اربابِ فکر و بصیرت سے پوچھئے۔

کائنات کے متعلق اس قسم کا تصور دینے کے ساتھ قرآن نے علم کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) پیش کی ہے، جس نے انسانوں کے سامنے ایک جہانِ نو کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ جس بات کا تمھیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو اور اس کے بعد علم کے متعلق کہا کہ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) یاد رکھو! تمھاری سماعت اور بصارت، اور فؤاد، ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ جس بات کو علم کہہ کر پکارا گیا تھا، اس کے ساتھ تمھاری تائید اور شہادت موجود تھی یا نہیں؟ اس سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے، علم اسے کہا جاسکتا ہے، جس کے ساتھ سمع، بصر اور فؤاد کی شہادت موجود ہو۔ قرآن سمع و بصر کا ذکر، حواس (SENSES) کے نمائندہ کی حیثیت سے کرتا ہے اور فؤاد وہ ہے، جسے آج کی اصطلاح میں (MIND) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن نے ان ہر دو عناصر (SENSES AND MIND) کو علم کی بنیادیں قرار دے کر کس طرح پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ سمع و بصر، ادراک بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) کو محیط ہیں اور فؤاد (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کو حاوی۔ قرآن کا کہنا یہ ہے کہ تم حواس کے ذریعہ کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرو اور پھر انہیں فواد کی بارگاہ میں پیش کرو تاکہ وہ ان سے صحیح صحیح نتائج مستنبط کر سکے۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! کائنات کے متعلق وہ تصور جو قرآن نے پیش کیا اور یہ ہے ادراک بالحواس کا وہ مقام، جس کا اس نے تعین کیا۔ کائنات کے متعلق یہ تصور، اور حواس کا یہ مقام آپ کو دنیا کے مذاہب میں کہیں نہیں ملے گا۔ یہ صرف قرآن کے پیش کردہ دین میں ملے گا۔ اس تصور سے انسان کی نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ کائنات کو اپنے گہرے مطالعہ کا موضوع بنائے اور اس کے محیر العقول نظام پر غور و فکر کرے۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآن عقل و بصیرت اور ایمان و تقویٰ کا لازمی تقاضا قرار دیتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔

یہ حقیقت ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں اور رات اور دن کی گردش میں اربابِ عقل و بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ۔

یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر وقت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔
وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور ارض و سما کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں۔ کائنات کی ایک ایک چیز کو لیتے ہیں اور اس کے متعلق ریسرچ کرتے ہیں اور علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۱۹۰ - ۱۸۹/۳) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے کارگہِ کائنات کی کسی شے کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ تمام سلسلہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے۔ یہ نہ ہی بیکار ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔

قرآن اپنے دعاوی کے اثبات کا طریقہ یہ بتاتا ہے کہ

سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)
ہم انفس و آفاق کی دنیا میں انھیں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے۔ حتیٰ کہ یہ بات اُبھر کر ان کے سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔"

مطلب اس کا صاف ہے۔ جوں جوں انسانی علم آگے بڑھتا اور بلند ہوتا جائے گا، خارجی کائنات اور خود انسانی دنیا کے رازہائے سربستہ بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے اور جو لوگ ان حقائقِ مستور کو یوں بے نقاب دیکھ لیں گے، ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن کا ایک ایک دعویٰ کس طرح سچا ہے۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کے دعاوی کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت وہی لوگ ایمان لاسکیں گے جو خارجی کائنات اور انسانوں کی داخلی دنیا میں غور و فکر کریں گے۔

وقت نہیں ورنہ میں اس موضوع پر قرآنِ کریم کی بے شمار آیات آپ کے سامنے پیش کر کے اس حقیقت کو واضح سے واضح تر کرتا چلا جاتا کہ قرآن سائنٹفک ریسرچ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس کے نتائج کو کس طرح علم و ایقان کے استحکام کا موجب اور حق و صداقت کی تائید کا باعث قرار دیتا ہے۔

میں نے شروع میں بتایا تھا کہ قرآن کے نزدیک علم کی تعریف یہ ہے کہ اسے سمع و بصر اور فؤاد کی شہادت حاصل ہو۔ اسی کو علمِ سائنس کہتے ہیں۔ اب میں آخر میں ایک ایسی آیت پیش کرتا ہوں، جس سے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے علماء کا لفظ ٹھیک انہی لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے، جنھیں ہم آج سائنسدان (SCIENTISTS) کہتے ہیں۔ سورۂ فاطر میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ (اپنے قانونِ طبعی کے مطابق) بادلوں سے بارش برساتا ہے۔ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُھَا۔ پھر ایک ہی پانی (اور مٹی) سے قسم قسم کے پھل پیدا کرتا ہے، جن کے رنگ جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ وَمِنَ الْجِبَالِ

جُدَدٌۢ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ (۳۵/۲۷)۔ زمین اور اس کی پیداوار پر ہی نہیں، اس سے آگے بڑھ کر، تم نے پہاڑوں کی ساکت وصامت چٹانوں پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ ان میں رنگا رنگ طبقات کیوں ہیں؟ کوئی سفید، کوئی سرخ، کوئی کالا بھجنگ۔ اگر تم ان (پہاڑوں) سے پوچھو گے تو یہ تمہیں بتائیں گے کہ یہ شاہراہِ ارتقاء کی کون کون سی منزلوں سے گزرے ہیں، جن کے نشانات مختلف طبقات کی شکل میں موجود ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۔ اور اسی طرح یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ انسان، حشرات الارض اور مویشیوں کی الگ الگ قسمیں کیوں ہیں۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے صرف "علماء" کا طبقہ ہی ایسا ہے جو کائنات کے محیّر العقول سلسلہ پر غور و خوض سے قانونِ خداوندی کی عظمت اور ہیبت کے احساس سے لرزہ براندام رہتا ہے اور اس حقیقت کا علیٰ وجہ البصیرت مشاہدہ کر لیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۳۵/۲۸) یقیناً خدا کا قانون بڑے غلبہ اور سطوت کا مالک اور کائنات کو تخریبی عناصر سے محفوظ رکھنے کا ضامن ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ "عُلَمَاء" کا لفظ کس مقام پر آیا ہے اور کن لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد، اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اسلام اور سائنس کا باہمی تعلق کیا ہے۔

اس مقام پر آپ کے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہو گا کہ اقوامِ مغرب نے علومِ سائنس میں اس قدر ترقی کی ہے لیکن اس کا نتیجہ وہ جہنم ہے، جس میں آج ساری دنیا اس بُری طرح ماخوذ ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کی بے پناہ قوتوں کو تو مسخر کر لیا لیکن ان کا استعمال مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کے مطابق نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ مستقل اقدار ان کے سامنے ہیں ہی نہیں۔ یہ اقدار، عقلِ انسانی کی پیداوار نہیں۔ انسانی فکر انھیں پیدا کر نہیں سکتا۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب تک فطرت کی قوتوں کو قرآن کی راہ نمائی میں صرف نہیں کیا جاتا، دنیا جہنم کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتی۔

اس مختصر سے وقت میں جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا ملخّص (SUMMARY) یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے

جو قومیں تسخیرِ فطرت نہیں کرتیں، وہ (مقامِ مومن تو ایک طرف) مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں، اس لئے کہ آدم وہ ہے جس کے سامنے ملائکہ سجدہ ریز ہوں۔

اور جو آدم وحیِ خداوندی کا اتباع نہیں کرتا۔ وہ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ کا مظہر رہتا ہے۔ (۲/۳۰) فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ کا مورد نہیں بنتا۔ (۲/۳۸)

مومن وہ ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں وحیِ خداوندی کی روشنی میں، نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے استعمال کرے۔ اس کا نتیجہ وہ جنّتِ ارضی ہے، جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔

وَذَالِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ (۴/۱۳ - ۶۱/۱۲)

اِنسان اور خارجی کائنات

۲۱/ اگست ۱۹۵۹ء کی شام محترم پرویز صاحب نے لاء کالج ہال کراچی میں، عنوانِ بالا پر ایک جامع تقریر فرمائی۔ سامعین میں زیادہ تعداد طالب علموں اور اساتذہ حضرات کی تھی۔ دیگر اہلِ علم طبقہ بھی کثیر تعداد میں شریکِ اجتماع تھا۔ تقریر کا ماحصل درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔
(طلوعِ اسلام)

افراد ہوں یا اقوام (اقوام بالخصوص) ان کی موت و حیات کے فیصلے کے لئے ایک اہم عنصر یہ بھی ہے کہ خارجی کائنات کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ یا ردِّعمل کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے، جس نے انسان کو ہمیشہ وقفِ اضطراب رکھا ہے۔ قرآن نے اُسے بڑی اہمیّت دی ہے اور اس کا صحیح جواب، نہائت واضح اور بیّن الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جب انسانی شعور نے پہلے پہل آنکھ کھولی، تو اس نے اپنے آپ کو عجیب دنیا میں پایا۔ سر پر مسلسل آتش باری کرنے والا عظیم اور مہیب گولا، چاروں طرف بڑے بڑے پہاڑ، اِدھر اُدھر ساحل ناآشنا سمندر اور اس کی خوفناک تلاطم انگیزیاں، یہاں وہاں کف بردہاں اور سیلاب در آغوش دریاؤں کی وحشت سامانیاں، میلوں تک ڈراؤنے جنگل اور ان میں بڑے بڑے خطرناک درندے اور اژدھے، کبھی بادل کی لرزہ انگیز گرج، کبھی بجلی کی جگر پاش کڑک، کبھی وحشت انگیز آندھی، کبھی بلاخیز جھکڑ، کبھی کوہِ آتش فشاں کی مرگِ سیّال کی یلغار، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں کا ہجوم، شش جہات میں اس قسم کی خوفناک بلاؤں کا اژدھام اور ان کے اندر گھرا ہوا بے یار و مددگار اور بے سر و سامان، نہتّا ابنِ آدمؑ۔ آپ سوچیئے کہ ان حالات میں خارجی کائنات کے متعلق اس کا ردِّعمل اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا کہ جو بلا

انسان کا پہلا ردِ عمل

سامنے آئے، یہ گڑگڑانا شروع کر دے۔ جہاں کوئی خطرہ آنکھ دکھائے، یہ زمین پر سر رکھ دے۔ اس طرح فطرت کی ہر قوت اس کا "الٰہ" اور یہ ان قوتوں کا پرستار بن گیا۔ چاند، سورج، ستارے، گرج، کڑک، بارش، آندھی، آگ، دریا، سانپ، شیر حتیٰ کہ وبائی امراض سب دیوی اور دیوتا تصور کر لئے گئے اور ان کی بارگاہ میں نذر و نیاز، منت و سماجت اور مدح و ستائش سے انہیں خوش کرنے اور راضی رکھنے کی تدابیر اختیار کی جانے لگیں۔ یہ تھا (اُس ماحول میں) انسان کا اوّلین ردِ عمل خارجی کائنات کے متعلق۔ رفتہ رفتہ اس ردِ عمل نے مذہب[1] کی شکل اختیار کر لی۔ اور یہ آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی عقیدہ یا تصور، مذہب کی شکل اختیار کر لے تو حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، اس میں تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ چنانچہ دنیا کے بیشتر مذاہب کائنات کے متعلق انسان کے اسی اوّلیں ردِ عمل کے مظاہر ہیں۔

یہ توہم پرستی کی دنیا تھی۔ دوسری طرف جہانِ علم و بصیرت کی طرف آیئے تو وہاں (بدقسمتی سے) انسانیت ایک ایسے حادثے سے دوچار ہوئی جس نے اسے توہم پرستی کی جہالت سے بھی زیادہ نقصان پہنچایا۔ جہاں تک تاریخی نوشتے ہماری راہ نمائی کرتے ہیں، علم و حکمت کا اوّلیں گہوارہ خطۂ یونان تصور کیا جاتا ہے اور سقراط کو وہاں کے حکماء کا ابوالآباء قرار دیا جاتا ہے۔

افلاطونی نظریہ

سقراط کا نظریہ تھا کہ مطالعہ کے قابل صرف انسان کی ذات ہے، خارجی کائنات نہیں۔ افلاطون، جو سقراط کا شاگرد لیکن خود ایک الگ مکتبِ فکر کا امام ہے، اس سے بھی دو قدم آگے بڑھا۔ اس نے کہا کہ یہ دنیائے محسوسات (خارجی کائنات) درحقیقت اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ حقیقی دنیا عالمِ امثال (WORLD OF IDEAS) کی ہے جو کہیں آنسوئے افلاک واقع ہے اور یہ مرئی کائنات اس دنیا کا عکس ہے۔ اس نظریہ سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ یعنی جب یہ عالمِ محسوسات درحقیقت اپنا وجود نہیں رکھتا بلکہ محض فریب اور سراب ہے (بلکہ عالمِ خواب) تو اس کے متعلق جو علم انسانی حواس (SENSES) کے ذریعہ حاصل ہوگا، وہ بھی اپنی کچھ حقیقت نہیں رکھے گا۔ حقیقی علم وہی ہوگا جو انسان کو چشم بند، گوش بند و لب بر بند کے بعد — اپنی دنیا میں جذب ہو جانے سے حاصل ہو۔ یہی علم قابلِ اعتماد اور یقینی ہوگا۔ محسوسات کا علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) قطعاً قابلِ اعتماد نہیں ہوگا۔

---

[1] مذہب سے مراد انسانوں کا خود ساختہ توہم پرستانہ مسلک ہے۔ خدا کی طرف سے بوساطت انبیاء کرامؑ دین ملتا رہا ہے۔ اسلام بھی دین ہے، مذہب نہیں۔

یہ تھا کائنات اور علم محسوسات کے متعلق افلاطون کا وہ نظریہ جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ یہ تصوف وہاں سے نکل کر ساری دنیا کو متاثر کر گیا۔ اس نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ اس (ہندو) فلسفہ

یہ تصوف کا نظریہ ہے

کی رُو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ کائنات برہما (خدا) کا خواب ہے۔ جس دن اس کی آنکھ کھُل گئی، یہ خواب معدوم ہو جائے گا۔ یہ عظیم کارگہِ کائنات، ایشور کی لیلا (ناٹک کا کھیل) ہے، جس میں کوئی شے اپنے حقیقی رنگ میں سامنے نہیں آتی، بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ یہی وہ فلسفہ ہے جو ایرانی مغبچوں کے ہاتھوں "شرابِ معرفت" بن کر چھلکا اور عیسائیت کی خانقاہوں تک کو کیف آلود کر گیا۔ اسی فلسفہ کا نتیجہ تھا کہ کائنات کو باطل قرار دے دیا گیا اور دنیا ایک قابلِ نفرت شے تصور کر لی گئی، جس سے دُور بھاگنے میں ہی انسانی نجات کا راز پوشیدہ سمجھا گیا۔

یہ تھا کائنات کے متعلق ذہنِ انسانی کا ردّعمل اس زمانے میں جب قرآن نازل ہوا۔ یعنی دنیائے مذاہب، کائناتی قوتوں کو معبود بنا کر ان کے سامنے سجدہ ریز تھی اور عام تصوف کائنات کو باطل قرار دے کر اس سے نفرت میں "روحانی ترقی" کا راز پا رہا تھا (اس میں شبہ نہیں کہ قرآن سے پہلے بعض قرائن ایسے ملتے ہیں، جن میں کائنات کی صحیح پوزیشن بھی سامنے آ جاتی ہے۔ یہ وحی پر مبنی تعلیم کا اثر تھا جو مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً آتی رہی۔ لیکن چونکہ نزولِ قرآن کے وقت وحی کی تعلیم اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں کہیں بھی موجود نہ تھی، اس لئے فکرِ انسانی کی عمومی حالت وہی تھی، جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔)

قرآن آیا اور اس نے سب سے پہلے مذہب کی دنیا کو للکارا۔ اس نے پہلے ہی پارہ کی ابتدا میں انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کو قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا۔ واضح رہے کہ قصۂ آدم کسی فرد (بابا آدم) کی داستان نہیں۔ آدم خود آدمی ہے اور اس کا قصہ آدمی کی اپنی کہانی ہے۔ اس نے کہا کہ آدمی کا مقام یہ ہے کہ فطرت کی تمام

قرآن کا تصوّر

قوتیں (جنہیں قرآن ملائکہ کہہ کر پکارتا ہے) اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں[1]۔ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (۲/۳۴) اس ایک (انقلاب انگیز) اعلان سے، قرآن نے مسجود کو ساجد اور ساجد کو مسجود بنا دیا۔ اس نے انسان سے کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ (۱۴/۳۳) خدا نے چاند اور سورج کو تیرے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے کہ وہ تیری خدمت

---

[1] تفصیل ان امور کی میری کتاب "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

میں مصروفِ خرام رہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (۱۴/۳۳) اس نے دن اور رات کو بھی تیرے لئے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ (۱۴/۳۲) اس نے دریاؤں (اور سمندروں) کو بھی تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ المختصر یہ کہ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اسے تمہارے لئے تابعِ تسخیر کر دیا ہے۔ یہ سب خدا کے مقرر کردہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم ان قوانینِ فطرت کا علم حاصل کرو اور ان کے ذریعہ ان تمام قوتوں کو اپنے کام میں لاؤ۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے کس طرح مقامِ آدم کو بے نقاب کر کے کائنات اور خود انسانی دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ اس کی اس حقیقت کشا تعلیم سے ذہنِ انسانی کے تراشیدہ دیوی دیوتا، جن، بھوت پریت، سب اس کے حضور دست بستہ خدمت کے لئے حاضر ہو گئے اور پتھروں کے سامنے ماتھا رگڑنے والا انسان کس طرح آسمان کی بجلیوں تک کا مخدوم و مسجود بن گیا۔

طلسمِ فلاطون کی شکست

دوسری طرف قرآن نے دنیائے تصوف کو پکارا اور ایک غلغلہ انگیز نعرہ سے طلسمِ فلاطون کی دھجیاں فضائے بسیط میں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ہم نے باطل پیدا نہیں کیا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ یہ ان لوگوں کا وہم و قیاس ہے جو حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ۔ (۳۸/۲۷) اور جو حقیقتِ ثابتہ کا انکار کر کے، کائنات کو باطل بتاتے ہیں، ان کی سعی و عمل راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے اور آخر الامر ان کے حصے میں ملامت و پشیمانی اور تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے کائنات کے متعلق غلط زاویۂ نگاہ کو کفر (اور اس کے برعکس صحیح زاویۂ نگاہ کو ایمان) قرار دے کر اس سوال کو کتنی اہمیت دی ہے؟ جو شخص کائنات کو باطل قرار دے، وہ قرآن کی رُو سے مومن نہیں کافر ہے۔ خدا نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ۔ اس نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (۲۹/۴۴) اس میں ایمان والوں کے لئے (بہت بڑی) نشانی ہے۔

یہ کھیل تماشہ نہیں

کائنات کو ایشور کی لیلا قرار دینے والوں سے اس نے کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ (۴۴/۳۸) ہم نے کائنات

کی پستیوں اور بلندیوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، یوں ہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ وَمَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ــــ (۴۴/۳۹) ہم نے اُنھیں بالحق پیدا کیا ہے۔ یہ خیال کہ کائنات یوں ہی بطور کھیل تماشہ کے پیدا کردی گئی ہے، ان لوگوں کا وہم ہے جو علم وحقیقت سے بے خبر ہیں۔

کائنات کے متعلق زاویۂ نگاہ میں اس قدر تحیر انگیز انقلاب پیدا کرنے کے بعد ضروری تھا کہ علم بالحواس (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) کے متعلق بھی انسانی نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷/۳۶) جس بات کا تمھیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)

علم کی تعریف

تمھارے سمع اور بصر اور فواد سب سے یہ پوچھا جائے گا کیا تم نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی جسے صحیح سمجھا گیا تھا؟ یہ آیت بڑی غور طلب ہے۔ اس میں علم اسے کہا گیا ہے، جس کی شہادت سمع وبصر و فواد دیں۔ " سمع وبصر" انسانی حواس SENSES ہیں، جن کا کام یہ ہے کہ وہ خارجی کائنات کے متعلق معلومات فراہم کرکے فواد (MIND) تک پہنچادیں اور پھر فواد (MIND) ان سے استنباطِ نتائج کرے۔ علم کی اس تعریف (DEFINITIDN) میں علم بالحواس (PERCEPTUAL KNDMFEDGE) اور فکری وتصوراتی علم (CDNCEPTUAL KNDWLEDGE) دونوں آجاتے ہیں۔

قرآن کے نزدیک " سمع وبصر و قلب" کی اہمیت کس قدر ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے صاف

سمع وبصر سے کام نہ لینے والے جہنمی ہیں

الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے وہ انسانی سطح پر نہیں، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جہنمی ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷/۱۷۹)

شہری اور صحرائی آبادیوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انھیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ یعنی

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں

رکھتے ہیں لیکن اس سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن اس سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (۷/۱۷۹) اس لئے کہ یہ لوگ حقائق کائنات سے بے خبر رہتے ہیں۔

ان کے برعکس، وہ ایک اور گروہ کا ذکر کرتا ہے، جن کے متعلق کہتا ہے کہ

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (۳/۱۸۹)

یقیناً کائنات کی بلندیوں اور پستیوں کی تخلیق اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔

کائنات میں غور و فکر کرنے والے

ان اربابِ دانش و بینش کے لئے جن کی حالت یہ ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ (۳/۱۹۰) جو اُٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اور تخلیقِ ارض و سماء میں انتہائی غور و فکر کرتے ہیں اور اپنے مسلسل تجربات اور پیہم مشاہدات سے علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰) اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس عظیم سلسلۂ کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ سُبْحٰنَكَ یہ تجھ سے بہت بعید تھا کہ تیرا تخلیقی پروگرام بلا مقصد ہوتا، تیرے متعلق ایسا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض ہماری کوتاہ علمی اور ریسرچ (تحقیق) کی کمی ہے جو ہم کائنات کی بہت سی چیزوں کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتے ہیں اور اس لئے ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم عدمِ علم کی بناء پر اشیائے کائنات کے تخریبی پہلو سے محفوظ رہیں۔ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳/۱۹۰) اس لئے کہ جو قومیں اشیائے فطرت کے متعلق تحقیقات نہیں کرتیں اور اس لئے ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں، وہ دنیا میں ذلت اور رسوائی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ (۳/۱۹۱) اور ایسی قوموں کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۱)

یہی مومن و متقی ہیں

اس مقام پر ان لوگوں کو جو اشیائے کائنات کے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد رموزِ فطرت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں، قرآن نے "صاحبانِ عقل و بصیرت"

کہا ہے۔ دوسرے مقام پر انھیں " مومنین " سے تعبیر کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۴۵/۳) یقیناً کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں مومنین کے لئے نشانیاں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے قوانین کے متعلق حتمی یقین رکھتے ہیں۔ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۔ (۴۵/۴) اور تمھاری پیدائش میں اور دیگر جانداروں کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو (کائنات کے بالحق ہونے پر) یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ صاحبانِ عقل و بصیرت ہیں۔ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴۵/۵) اور دن رات کی گردش میں اور بارش میں جسے خدا بادلوں سے برساتا ہے اور اس سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے اور ہواؤں کے رخ کی تبدیلی میں اربابِ عقل و فکر کے لئے نشانیاں ہیں۔

کائنات پر غور و فکر کی اس قدر تاکید کے بعد کہا گیا کہ تِلْکَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْکَ بِالْحَقِّ۔ یہ وہ اللہ کی آیتیں ہیں، جنھیں خدا حق کے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ جو اس کے بعد بھی حق پر ایمان نہیں لاتے، ان سے پوچھو کہ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (۴۵/۶) یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے بعد اور کس چیز پر ایمان لائیں گے؟

انہی سے ایمان حاصل ہوتا ہے

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو گوشے ہیں۔ ایک اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک حکیم و خبیر ہستی اپنے محکم، اٹل اور تعمیری قوانین کی رُو سے چلا رہی ہے۔ دوسرے قرآنی تعلیم میں تدبر و تفکر سے، جس نے اُس زمانے میں انسان کے لئے تسخیرِ کائنات کا اعلان کیا، جب ساری دنیا یا تو کائناتی قوتوں کو معبود بناتے ہوئے تھی اور یا اسے فریبِ نظر اور قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دُور بھاگتی تھی، ایسے ماحول میں اس قسم کی انقلاب آفریں آواز بلند کرنا کسی انسانی ذہن کا کام نہیں تھا۔ اس آواز کا سرچشمہ یقیناً وہی خدائے علیم و بصیر ہو سکتا تھا جو انسان اور کائنات دونوں کے صحیح مقامات سے باخبر ہو۔ لہٰذا اگر کوئی شخص مطالعۂ فطرت اور قرآن میں غور و تدبر کے بعد بھی خدا پر ایمان نہیں لاتا تو پھر کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس سے وہ خدا پر ایمان لا سکے۔

ایمان وہ تصورِ حیات ہے جو انسانی زندگی کا نصب العین قرار پاتا ہے۔ اس کے بعد تقویٰ آتا ہے۔ تقویٰ کے

معنی یوں سمجھئے کہ یہ وہ مسلک اور منہاج ہے، جس کے مطابق مومن اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ مومنین کے لئے خارجی کائنات کے شواہد و مظاہر پر غور و فکر کس قدر ضروری ہے، اس کے متعلق ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ یہ غور و فکر متقیوں کے لئے بھی ویسا ہی ضروری ہے۔ سورۂ یونس میں ہے۔

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ۔ (۱۰/۶)

یعنی اختلافِ لیل و نہار اور جو کچھ اللہ نے آسمانوں اور زمینوں میں پیدا کیا ہے، ان میں تقویٰ شعار قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن نے "سمٰوات والارض" پر غور و فکر کرنے کی تاکید کی ہے۔ سمٰوات (اجرامِ فلکی) پر غور و فکر کا ایک شعبہ تو وہ ہے جسے علم الافلاک (ASTRONOMY) کہتے ہیں لیکن قرآن اس سے بھی آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ زمین میں ہی نہیں بلکہ اجرامِ فلکی میں بھی ذی حیات مخلوق ہے اور اس کے متعلق غور و فکر کرنا بھی ضروری ہے۔ سورۂ شوریٰ میں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ۔ (۴۲/۲۹)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سمٰوات کو پیدا کیا اور ان دونوں میں ذی حیات مخلوق کو پھیلایا۔

آسمانوں میں ذی حیات مخلوق

غور فرمائیے کہ آسمانی کرّوں میں زندہ مخلوق کی نشاندہی بھی سب سے پہلے قرآن ہی نے کی ہے۔

قرآن کی رُو سے علم کی تعریف کیا ہے، یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ یعنی علم وہ ہے، جس کی شہادت انسان کے حواس دیں اور جس کی تائید اس کا قلب (MIND) کرے۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کے نزدیک عالم کون ہے؟ قرآن میں علماء کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ شعراء میں (۲۶/۱۹۷) اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔

عالم کی تعریف

یہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورۂ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے علماء کا ذکر ہے، اس تذکرہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا (۳۵/۲۷) کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون

کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ (۳۵/۲۷)

اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سُرخ و سفید طبقات ہیں، جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ط

اور اس طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے؟ کائنات کے مختلف گوشوں کا، بساطِ فطرت کے متنوّع شعبوں کا، سائنس کے مختلف علوم کا، جن میں طبیعیات (PHYSICS) نباتات (BOTANY) حیوانات (ZOOLOGY) طبقات الارض (GEOLOGY) فضائیات (METEOROLOGY) اور عالمِ انسانیت کے تمام شعبے آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے "علماء" ہی وہ ہیں، جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے۔ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۳۵/۲۸) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگہٗ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر، اس کی منزلِ مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان کے لئے جنہیں دورِ حاضر کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہا جاتا ہے۔ قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح خدا کی عظمت و ہیبت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کائناتی مظاہر پر غور کریں، اسی طرح خود قرآن کے حقیقتِ ثابتہ ہونے کا یقین بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خارجی کائنات اور دنیائے انسانیت میں غور و فکر کریں۔ اس کا ارشاد ہے۔

انفس و آفاق میں آیات

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۴۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں عالمِ آفاق اور عالمِ انفس میں دکھائیں گے۔ تا آنکہ یہ بات اُبھر کر ان کے سامنے آ جائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، یعنی جوں جوں کا کُل زمانہ کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے حقائق، مساعیٔ علم و تحقیق سے کھلتے جائیں گے، قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ

عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ ۔ (۴۱/۵۳) قرآن اس خدا کی کتاب ہے، جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے اور یہ چیز اس امر کی کافی دلیل ہے کہ حقائقِ کائنات کے متعلق جو کچھ خدا کہے گا، وہ یقینی طور پر درست ہوگا۔ اَنۡزَلَہُ الَّذِیۡ یَعۡلَمُ السِّرَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ (۲۵/۶۱) قرآن کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کے اسرار و رموز سے واقف ہے۔ لہٰذا جو لوگ انفس و آفاق کی ان نشانیوں پر غور و فکر کریں گے، انھیں ان میں تجلیاتِ خداوندی بے نقاب نظر آجائیں گے۔ جو قومیں ان آیات اللہ سے آنکھیں بند کرکے گزر جاتی ہیں، یوں سمجھو کہ انھیں خدا کو اس طرح اپنے

لقاءِ ربّ

سامنے بے نقاب دیکھ لینے پر یقین نہیں ہوتا۔ اَلَاۤ اِنَّہُمۡ فِیۡ مِرۡیَۃٍ مِّنۡ لِّقَآءِ رَبِّہِمۡ (۴۱/۵۴) حالانکہ انھیں اس کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ جس شے کی بھی ریسرچ شروع کردیں، اس میں خدا کا قانونِ ربوبیّت جھلمل جھلمل کرتا نظر آئے گا۔ اس لئے کہ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ ۔ (۴۱/۵۴) خدا کا قانونِ ربوبیّت ہر شے کو محیط ہے۔ وہ کسی ایک شے کے ساتھ مختص نہیں۔

ہم نے شروع میں دیکھا ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ کائنات میں مومنین اور متّقین کے لئے ہر جگہ آیات اللہ ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ایمان اور تقویٰ کے معنی اشیائے کائنات پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق

صرف تسخیرِ فطرت ایمان نہیں

ہے اور جو قومیں تسخیرِ فطرت کرتی ہیں، وہ مومن اور متّقی ہوتی ہیں۔ مومن و متّقی وہ ہیں جو تسخیرِ فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق (نوعِ انسانی کی ربوبیّتِ عامہ) کے لئے صرف کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ مومن ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ضروری ہیں، یعنی تسخیرِ فطرت اور اتباعِ قوانینِ خداوندی،

مومن ہونے کی شرائط

جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی بھی کمی ہے تو وہ مومن و متّقی نہیں کہلا سکتی۔ وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ۔ (۵/۴۴) "جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔" جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرلیتی ہیں لیکن امورِ زندگی کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق نہیں کرتیں، وہ بھی ان قوموں کی طرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جو سرے سے تسخیرِ فطرت نہیں کرتیں۔ یہی وہ قومیں ہیں، جن کے متعلق قرآن

نے کہا ہے کہ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ (۴۶/۲۶) ان کے سمع و بصر و فواد ان کے کسی کام نہ آئے کیونکہ وہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے۔ وہ تباہ و برباد ہو گئے۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے صورت حال یوں ہوئی کہ

حاصلِ مبحث

(۱) جو قومیں سمع و بصر و فواد سے کام لے کر تسخیرِ فطرت کرتی ہیں اور پھر فطرت کی قوتوں کو قوانینِ خداوندی (قرآن) کے مطابق صرف کرتی ہیں، وہ مومن و متقی ہیں۔ ان کی اس دنیا کی زندگی بھی درخشندہ اور تابناک ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی خوشگوار و شاداب۔

(۲) جو قومیں تسخیرِ فطرت تو کرتی ہیں لیکن قرآن کی مستقل اقدار کا اتباع نہیں کرتیں، وہ صرف مقامِ آدمیت تک پہنچتی ہیں، مومن و متقی کے مقام تک نہیں پہنچتیں۔ وہ اس دنیا کی زندگی میں قوت و شوکت حاصل کر لیتی ہیں لیکن مستقبل ان کا تاریک ہوتا ہے۔

(۳) اور جو قومیں سرے سے تسخیرِ فطرت کرتی ہی نہیں، وہ مومن و متقی ہونا تو کجا، مقامِ آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ (۱۰/۸) ان کے لئے اس دنیا میں ذلت و خواری ہے اور آخرت میں بھی تباہی و بربادی۔ اس لئے کہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (۱۷/۷۲) جو یہاں کا اندھا ہے، وہ وہاں کا بھی اندھا ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا　　جو آج خود افروز جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا　　جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

اِسلام ہی کیوں سچّا دین ہے؟

(تقریر)

اپریل ۱۹۶۱ء

برادرانِ عزیز!

ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں اُبھرتا اور دلوں کو پریشان کرتا ہے، یہ ہے کہ عام اخلاقی اقدار تمام مذاہب (بالخصوص بڑے بڑے مذاہب) میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ سب مذاہب یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، دیانت دار بنو، کسی پر ظلم نہ کرو وغیرہ وغیرہ اور اسلام بھی یہی کہتا ہے، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی خصوصیّت ہے، جس کی بناء پر ہم یہ کہتے ہیں کہ دینِ برحق صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا خدا کے ہاں کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں۔ نوعِ انسان کی نجات وسعادت اسی سے وابستہ ہے۔ اس لئے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔

اہم سوال

اگر وہ خصوصیّت، جس کی بناء پر اسلام کو یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے، یہی اخلاقی اقدار ہیں، تو پھر یہ حق ہر ایک مذہب کو پہنچنا چاہیئے۔ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ جن خصوصیّات کی بنا پر ہم اسلام کو دینِ الحق قرار دیں، انہی کے مطابق جب دوسرے مذاہب اپنے متعلق اس قسم کا دعویٰ کریں تو ہم ان کے دعویٰ کو باطل قرار دے دیں اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کریں۔

یہ سوال واقعی اہم ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا اور قلوب کو پریشان کرتا ہے۔ یہی وہ سوال ہے جو اس سے پہلے علمی دنیا میں اس وقت سامنے آیا، جب مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھا کہ "عالمگیر سچّائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔" اس لئے کسی مذہب

برہمو سماجی مذہب کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ اعلان درحقیقت صدائے بازگشت تھی برہمو سماجی تحریک کی جو اس سے پہلے بنگال میں اٹھی تھی۔ انہوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب کی (مبینہ) آسمانی کتابوں سے (بزعمِ خویش) اچھی اچھی باتوں کو یکجا کرکے ایک مجموعۂ تعلیم مرتب کیا اور اسے دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس تعلیم میں تمام مذاہب کی مشترکہ سچائیاں موجود ہیں۔ اس لئے مذہبی اختلافات مٹانے اور سچائی پر عمل پیرا ہونے کا یہی طریق ہے کہ تمام اہلِ مذاہب اس تعلیم پر ایمان لے آئیں اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں۔ یہ مشترکہ تعلیم انہی اخلاقی اقدار پر مشتمل تھی۔ برہمو سماجی تحریک سے بہت پہلے اکبر کے "دینِ الٰہی" کی بنیاد بھی اسی تصور پر تھی۔ اسی کا مبلغ داراشکوہ تھا، جس کے تصوف کی رُو سے "رام اور رحیم" میں کوئی فرق نہیں اور حقیقت کا جلوہ دیر وحرم میں یکساں موجود ہے۔ اسی کی صدائے بازگشت بھگت کبیر اور سورداس کے بھجنوں اور شاہ فرید اور سلطان باہو کی کافیوں میں ہر گلی کوچے میں سنائی دیتی ہے۔

اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر صداقت انہی اخلاقی اقدار کا نام ہے اور انہی پر عمل پیرا **مذہب کی بھی ضرورت نہیں!** ہونا انسانی زندگی کا منتہا ہے تو اس کے لئے مذہب کی بھی کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں، جو خدا کی ہستی تک کے بھی منکر ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بہت بُرا ہے۔ سچ بولنا چاہیئے۔ دیانت دار بن کر جینا چاہیئے۔ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے مذہب کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی وہ تصور تھا جس کی بنیادوں پر یورپ میں (HUMANISM) کی تحریک اُٹھی اور اس نے (RELIGION WITHOUT REVELATION)[1] "مذہب بلا وحی" کے دعوے کے ساتھ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر مذہب کا مقصود ومنتہی یہی اخلاقی اقدار ہیں اور انسانی زندگی ان اقدار کو مان لینے سے اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہے تو پھر (HUMANISM) کے دعویٰ کو کس طرح ٹھکرایا جاسکتا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہے اور اس کے اطمینان بخش جواب کا سامنے آنا کس قدر ضروری ہے۔ اس اہمیت اور ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق سنجیدگی سے (SERIOUSLY) سوچا جائے اور اسے انتہائی غور وفکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ وَمَا توفیقی اِلا باللہ العلی العظیم۔

---

[1] یہ ہکسلے کی ایک کتاب ہے، جس میں اس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔

اس باب میں بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کو صرف ایک اخلاقی ضابطہ (ETHICAL CODE) سمجھ لیا جاتا ہے اور بس۔ دین چند اخلاقی اقدار کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی (SYSTEM OF LIFE) ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اخلاقی اقدار اس نظام کے اندر بروئے کار آتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ یہ نظام، انسان کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے، جن پر اخلاقی اقدار کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

دین کیا ہے؟

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے، بددیانتی سخت معیوب ہے، فریب دہی بڑی مذموم حرکت ہے لیکن اس کے باوجود ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے۔ بددیانتی عام ہو رہی ہے۔ فریب دہی کی گرم بازاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ انسان ان تمام باتوں کو بُرا کہنے کے باوجود، انھیں کیوں نہیں چھوڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان اخلاقی اقدار کا محض رسمًا اور تقلیداً اقرار کرتے ہیں اور یا ان کی بنیاد محض جذبات پر ہوتی ہے۔ انھیں اس کا کچھ علم نہیں کہ ان اقدار کو کیوں اختیار کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کیوں نہ کی جائے۔ آپ کسی شخص سے کہیئے کہ وہ آپ کو مطمئن کرے کہ آپ جھوٹ کیوں نہ بولیں۔ سطحی گفتگو سے ذرا نیچے اترنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ وہ دلیل و برہان سے آپ کی "کیوں" کا کچھ جواب نہیں دے سکے گا۔ وہ آپ کو علیٰ وجہ البصیرت (RATIONALLY) نہیں سمجھا سکے گا کہ جھوٹ بولنے سے آپ کا کیا نقصان ہوگا اور سچ بولنے سے آپ کا کیا فائدہ ہوگا اور چونکہ انسان اسی بات کو اختیار کرتا ہے، جس میں اس کا فائدہ ہو اور اسی چیز کو چھوڑتا ہے، جس میں اس کا نقصان ہو، اس لئے اس کا یہ اقرار یا تو محض رسمی اور تقلیدی ہوتا ہے اور یا جذباتی عواطف کا پیدا کردہ۔ وہ نہ ان اقدار کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھتا ہے اور اس لئے نہ انھیں اپنی زندگی کا مسلک بناتا ہے۔

دین وہ بنیادی تصورات عطا کرتا ہے، جن کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصد اور منتہیٰ نمایاں طور پر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مقصدِ زندگی، دنیا کی ہر شے کی صحیح صحیح قدر (VALUE) متعین کرتا ہے اور جب اقدار متعین ہو جائیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس بات میں میرا نفع ہے اور کس میں نقصان۔ کون سی قدر زیادہ قیمتی ہے اور کون سی کم۔

ان بنیادی تصورات کے ساتھ، دین وہ عملی نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ نظری اقدار حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں اور ان کے محسوس نتائج سے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کس قدر فائدہ ہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر نقصان۔ اس سے اس کے جذبات و احساسات متاثر ہو کر اپنی کارفرمائی کے لئے صحیح

راستہ (CHANNEL) اختیار کرلیتے ہیں اور چونکہ عمل کے لئے قوّتِ متحرکہ انسانی جذبات ہیں، اس لئے اس کی زندگی ان بلند اقدار سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔ اسی کا نام کیریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ یاد رکھئے! انسانی سعی و

خواہش سے عمل تک

عمل تین مراحل میں سے گزرتی ہے۔ آپ کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش (DESIRE) غیر شعوری طور پر دل میں بیدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ کے پاس کوئی دلیل یا برہان یا وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق خالص جذبات سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ اسے عقل کے سامنے لاتے ہیں۔ اگر آپ کے جذبات شدید ہیں، تو آپ کی عقل اس خواہش کے بروئے کار لانے کے سامان سوچتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ انہیں (JUSTIFICATORY REASONS) کہتے ہیں لیکن اگر آپ کی عقل جذبات پر غالب ہوتی ہے تو وہ پھر نفع اور نقصان کا موازنہ کرتی ہے اور اگر دیکھتی ہے کہ نفع کا پہلو زیادہ وزنی ہے تو اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب آپ کی خواہش (DESIRE) آپ کی مرضی (WISH) میں بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کی قوّتِ ارادی آگے بڑھتی ہے اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے عملی قدم اُٹھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں آپ کی (DESIRE) ارادہ (WILL) کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔

لیکن عقلِ انسانی، اگر وہ جذبات کے تابع نہ بھی ہو، تو بھی زیادہ سے زیادہ اس شخص کے ذاتی نفع یا نقصان کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ اس خواہش کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتی۔ بالفاظِ دیگر انسانی عقل فردِ متعلقہ کو یہ بتا سکتی ہے کہ کون سی بات میں اس کا فائدہ ہے اور کون سی بات میں نقصان۔ وہ حق اور باطل (GOOD AND EVIL) میں تمیز نہیں کرسکتی۔ یہ تمیز صرف اقدار کے سامنے ہونے سے ہوسکتی ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اقدار کا تعین تصوّرِ حیات کی رُو سے ہوتا ہے۔

تصوّرِ حیات (صحیح یا غلط) کس طرح انسانی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے اور اس کی سعی و عمل (ACTIVITIES)

تصوّرِ حیات کا اثر

کا رُخ متعیّن کردیتا ہے، اسے سمجھنے کے لئے ہمیں کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ آج ہر شخص کو شکایت ہے کہ دنیا میں جھوٹ، فریب، مکّاری، دغابازی، بددیانتی، رشوت ستانی، بے انصافی، ظلم و استبداد، سلب و نہب (EXPLOITATION) عام ہورہے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے گویا ان خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں، جن سے نہ کوئی خطۂ زمین محفوظ رہا ہے اور نہ اس خطہ میں بسنے والا کوئی فرد ان سے مامون۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بالآخر وجہ کیا ہے؟ برائیاں تو دنیا میں پہلے بھی تھیں لیکن وہ اس طرح عام اور ہمہ گیر نہیں تھیں۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت

سامنے آجائیگی کہ اس کی وجہ وہ تصوّرِ حیات (CONCEPT OF LIFE) ہے جو انیسویں صدی میں سرزمینِ مغرب میں نمودار ہوا اور وسائلِ رسل و رسائل کے عام اور عالمگیر ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیل گیا. یہ تمام خرابیاں اس ایک تصوّرِ حیات کے برگ و بار ہیں. یہ تصوّرِ حیات یہ تھا کہ انسانی زندگی صرف اس کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے اور اس کی زندگی پر انہی قوانین و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے، جن کے مطابق باقی حیوانات جیتے اور مرتے ہیں. بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) فطرت کا اٹل قانون ہے. اس قانون کی رُو سے زندہ رہنے کا اسی کو حق ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرے. یہ قوّت کس طریق سے فراہم کی جائے، اس کا کوئی سوال ہی نہیں. ضعیف اور کمزور، صرف طاقتوروں کی خوراک بننے کے لئے زندہ رکھے جاسکتے ہیں. ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے. کیڑے مکوڑے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ چڑیوں کی غذا کا کام دیں اور چڑیاں اس لئے جیتی ہیں کہ وہ عقاب کا شکار بنیں. یہی قانونِ فطرت ہے، یہی آئینِ حیات ہے. اسی سے افراد اور اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں. جس کی لاٹھی، اس کی بھینس، تقاضائے عدل ہے. جنگل کا بادشاہ شیر ہے، بکری نہیں. اگر شیر بکری کو کھا جاتا ہے تو اس سے بکری یہ شکایت نہیں کرسکتی کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے.

حیوانات کی زندگی اجبلّی تقاضوں (INSTINCTS) کے زور پر بسر ہوتی ہے. یوں تو یہ تقاضے بہت سے ہیں، لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے. جذبۂ تحفظِ خویش (SELF PRESERVATION) جذبۂ تغلّب (SELF ASSERTION) اور جذبۂ افزائشِ نسل (SELF REPRODUCTION) جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر فرد، انہی جذبات کے تابع مصروفِ عمل رہے گا. اس میں اخلاقی اقدار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی.

اس تصوّر کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کی رُو سے بلند ترین کیریکٹر، نیشنل کیریکٹر قرار پائے گا. غور سے دیکھئے تو

نیشنلزم

نیشنل کیریکٹر بھی حیوانی جذبہ (ANIMAL INSTINCT) ہی کا پیدا کردہ ہے (HERD INSTINCT) حیوانات کی جبلّت میں ہے. ہر حیوان اپنی حفاظت اسی میں دیکھتا ہے کہ وہ گلّہ کے ساتھ رہے. یہی وہ جذبہ ہے جس سے آجکل نیشن وجود میں آتی ہے اور قائم رہتی ہے. اپنی قوم کی بہبودی اور خوش حالی، افراد کے نزدیک بلند ترین قدر قرار پاتی ہے. سب سے بڑا محبِ وطن وہ ہے جو دوسری اقوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر اس کی رنگینی سے اپنی قوم کے قصرِ بلند کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائے. اس کے لئے دیانت اور بد دیانتی، جھوٹ اور سچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. جو شخص ان امور کا خیال کرنے بیٹھ جائے، وہ امورِ مملکت

کو سرانجام ہی نہیں دے سکتا۔ (WALPOLE) کے الفاظ میں۔

نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک نہیں جا سکتے۔

اس ضمن میں ان محبانِ وطن (PATRIOTS) کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اس کے متعلق اٹلی کے مشہور مدبّر (CAVOUR) کے یہ چند الفاظ دہرا دینے کافی ہیں، جس میں اس نے کہا ہے کہ:-

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں، جو کچھ ہم مملکت کے لئے کرتے ہیں تو کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک تصورِ حیات کے بدل جانے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کس طرح بدل جاتی ہے اور اس تصورِ حیات کا اثر کس طرح اس کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ جو ابھی تک اخلاقی اقدار کی زبانی تعریف ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تحت الشعور کو اتنی جلدی ماضی کے اثرات سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ اگر یہ تصورِ حیات دو چار نسلوں تک اور آگے بڑھا تو اس کے ذہن سے ان اقدار کا تصور تک مٹ جائے گا اور پھر ان کا زبانی اعتراف بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہماری اُبھرنے والی نسل ان اقدار کو دقیانوسیت قرار دے کر ان کا مذاق اڑاتی ہے۔

اسلام وہ تصوّرات دیتا ہے، جن پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور اس کا ہر گوشہ بلند انسانی اقدار کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ تصورات، لا مذہبیّت میں تو ایک طرف، دنیا کے کسی مذہب میں بھی نہیں ملتے۔ یہی اسلام کی وہ خصوصیات ہیں، جن کی بنا پر وہی اور صرف وہی دین الحق قرار پاتا اور انسانی فوز و فلاح کا ضامن بنتا ہے۔ اصولی طور پر یہ تصوّرات، حسبِ ذیل عنوانات سے متعلق ہیں۔

(۱) خدا کا تصوّر۔

(۲) خدا اور انسان کا تعلق۔

(۳) انسان اور کائنات کا تعلق۔

(۴) انسان اور انسان کا باہمی تعلق۔

(۵) اعمال اور ان کے نتائج کا تعلق۔

(۶) زندگی کے منتہیٰ و مقصود کا تصور۔

آئندہ صفحات میں انہی تصورات کے متعلق مختصر الفاظ میں بحث کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ دیگر بڑے بڑے مذاہب (ہندومت، یہودیت، عیسائیت) میں یہ تصورات کس قسم کے ہیں اور قرآن کس قسم کے تصورات پیش کرتا ہے اور ان تصورات کی رُو سے انسانی زندگی کا نقشہ کس قسم کا مرتب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت میرے پیشِ نظر، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDY OF RELIGIONS) نہیں۔ ان مذاہب میں، ان تصورات کے متعلق، جو بنیادی عقائد ملتے ہیں، میں صرف انہی پر اکتفا کروں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیا کرام کو خدا کی طرف سے اپنے اپنے وقت میں صحیح اور سچی تعلیم ملتی رہی تھی لیکن اہلِ مذاہب کی مروجہ آسمانی کتابوں میں وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی۔ اس لئے ان تصورات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا، وہ ان مذاہب کی موجودہ تعلیم پر مبنی ہو گا۔ ان کی اس اصلی اور حقیقی تعلیم پر نہیں جو اس وقت ان میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں[1]" میں ملے گی جس میں خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیقات کے مطابق بتایا گیا ہے کہ ان مذاہب کی اصلی تعلیم ان کے ہاں کہیں باقی نہیں رہی لیکن چونکہ یہ حضرات اپنی موجودہ تعلیم کو اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں، اس لئے ان تصورات کے متعلق ان کی اسی تعلیم کو سامنے لایا جائے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی۔

---

(۱) خدا کا تصور

ان ہر سہ مذاہب (ہندومت، یہودیت، اور عیسائیت) میں ہندو دھرم کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ اس کی قدامت کا ثبوت ان کی مروجہ مذہبی کتابیں بہم پہنچا رہی ہیں، جن کا ایک ایک ورق اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہیں، جب ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا۔ بچپن کا ذہن، کسی مجرد حقیقت (ABSTRACT REALITY) کا تصور، محسوس پیکروں سے الگ ہٹ کر، کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے اس زمانے کا انسانی ذہن، خدا کی ذات کے متعلق منزّہ تصور کیسے قائم کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کو اپنی شکل پر ڈھالا اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے (مثلاً) دو ہاتھ ہیں تو خدا کے آٹھ ہاتھ سمجھ لئے۔ انسان کا ایک سر ہے، خدا کے دس سر تصور کر لئے۔ انسان پیالہ بھر پانی پی سکتا ہے، خدا پورا سمندر اپنے اندر انڈیل سکتا ہے۔

ہندومت میں خدا کا تصور

ہندوؤں کے ہاں تین بنیادی خدا مانے جاتے ہیں، برہما، شیوجی اور وشنو۔ ان کی بیویاں بھی ہیں اور بچے بھی۔ شیوجی کی بیوی پاربتی اور ان کا بیٹا گنیش، جس کا جسم انسان کا اور سر ہاتھی کا ہے۔ برہما کی بیٹی سرسوتی۔ پہلے ان

[1] اب الگ کتاب ہے "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں"۔

تین خداؤں کی پرستش ہوتی تھی لیکن اب برہما کی پرستش نہیں ہوتی ۔ پرانوں میں ہے کہ ایک دفعہ شیوجی نے دیکھا کہ برہما اپنی لڑکی سرسوتی سے فعلِ شنیع کا مرتکب ہونا چاہتا ہے ۔ اس لئے اس نے اس کی پرستش بند کردی۔
(ہندو ازم صفحہ ۱۸۴ ، مصنفہ گووند داس)

تخلیقِ کائنات کے متعلق ، شو پران میں حسبِ ذیل بیان ملتا ہے ۔
" شیوجی نے سوچا کہ میں دنیا کو پیدا کروں ۔ اس نے برہما کو پیدا کیا ۔ برہما نے ایک چلّو پانی اٹھا کر پانی میں پھینک دیا ۔ اس سے ایک بُلبلا اٹھا ۔ بُلبلے میں سے ایک آدمی پیدا ہوُا ۔ اس نے برہما سے کہا کہ " اے بیٹے دنیا کو بنا " برہما نے کہا میں تیرا بیٹا نہیں ، تو میرا بیٹا ہے ۔ دونوں میں جھگڑا برپا ہوُا ۔ مہادیو (شیوجی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا ، وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں ۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوُا ۔ وہ فوراً آسمان میں چلا گیا ۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران ہو گئے ۔"
اس کے بعد سنیئے کیا ہوُا ؟
" دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہیئے ۔ جو پہلے آئے وہ باپ ، جو پیچھے آئے ، وہ بیٹا کہلائے ۔ وشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا ۔ برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اُڑا ۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی ۔ برہما نے سوچا ، اگر وشنو پتہ لے آیا ہوگا ، تو مجھے اس کا بیٹا بننا پڑے گا ۔ وہ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اس وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اوپر سے اُترا ۔ برہما نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلتے آئے ہیں ۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں ۔ انھوں نے کہا نہیں "
" برہما نے کہا ، میرے ساتھ چل کر اس کی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا ۔ انھوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے ۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ گواہی نہیں دو گے تو میں تمھیں ابھی خاکستر کر دوں گا ۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہو ، ویسی ہی گواہی دے دیں گے ۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے ۔"
" برہما نے وشنو سے پوچھا کہ تم نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں ۔ اس نے جواب دیا کہ

نہیں۔ برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیتکی کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھاوے گا، اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گائے کو بد دعا دی کہ جس مُنہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے، اس مُنہ سے تو پاخانہ کھایا کرے گی۔ تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن دُم کی کریں گے۔ برہما کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہو گی۔ وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے، اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہو گی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی۔"

" اس حمد و ثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہادیو نے بالوں میں سے راکھ کا ایک گولا نکالا اور کہا، جا کر اس سے خلقت پیدا کرو۔[1]"

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش، سوامی دیانند، صفحہ ۲۷۳-۲۷۲۔)

خدا کا تصور وہ بلند ترین آئیڈیل ہوتا ہے جسے کوئی قوم اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے خدا کا یہ تصور ہو، اس کے اعمالِ حیات کس قسم کے ہو سکتے ہیں! نہ اس قوم کا ذہن توہم پرستی سے نجات حاصل کر سکتا ہے، نہ ان کے اعمال کا مدار علم و بصیرت قرار پا سکتا ہے۔ وہ جس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، وہ بھی انسانی پیکر سے بلند نہیں ہوتا۔ چنانچہ اتھروید میں ہے کہ خدا کی پوجا پاٹ کے وقت یہ کہنا چاہیئے کہ

" اے جیتوں کے سوامی پرماتما! تیرے مُکھ (مُنہ) کو نمسکار (سجدہ) ہے۔ تیری آنکھوں کو نمسکار ہے۔ تیری چمڑی کو نمسکار ہے۔ تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے پیٹ کو نمسکار ہے۔ تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے تیرے دانتوں کی گندھ (بو) کو نمسکار ہے۔

---

[1] کہہ دیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں بھی بہت سی توہم پرستانہ خرافات مل سکتی ہیں لیکن سوال عام مذہبی لٹریچر کا نہیں بلکہ ان کتابوں کا ہے جنہیں اہلِ مذاہب بطور سند پیش کریں۔ ہمارے ہاں دین میں سند صرف قرآنِ کریم ہے جو ان چیزوں سے بہت بلند اور منزّہ ہے۔

یہودیوں کے ہاں خدا کا تصور

ہندومت کے بعد، اب یہودیت کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ وہاں خدا کا تصور کس قسم کا ملتا ہے، غالباً لاک (LOCKE) نے کہا تھا کہ تم مجھے بتادو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کیا تھا اور میں یہ بتادوں گا کہ اس قوم کی تہذیب اور اس کا تمدن کس قسم کا تھا۔ مروجہ تورات کے مطالعہ سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے، اس کے متعلق ایک مغربی محقق کا پیش کردہ جائزہ سامنے لے آنا کافی ہوگا۔ (JOSEPH WHEBS) اپنی کتاب (IS IT GOD'S WORDS) میں لکھتا ہے۔

"تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت، گنہگار اور بے گناہ، دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا، نہایت مہیب اور خوفناک، ظلم اور تعصب کا مجسمہ، متکبر، شیخی باز، وعدہ خلاف، غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔

(بحوالہ مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں، صہ ۱۳۱)(اڈیشن ۱۹۷۷ء)

تورات میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا کی اس قسم کی شکل ہو، اس کی پیدا کردہ قوم کی شکل بھی ایسی ہی ہوگی۔ یہ خدا کی شکل نہیں بلکہ اس قوم کی اپنی سیرت کا بیان ہے۔ خدا کے اس قسم تصور کے بعد، اخلاقی اقدار کا جو حشر ہو سکتا ہے، اس کے لئے کسی صراحت اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔

عیسائیت میں خدا کا تصور

یہودیت سے آگے بڑھ کر عیسائیت کی طرف آئیے تو وہاں خدا کے تصور کی چیستاں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کونسل آف ٹرنٹ نے عیسائیت کے بنیادی عقیدہ کے لئے جو نظریہ تجویز کیا تھا اور جس کے اقرار سے ایک شخص عیسائی بنتا ہے، حسب ذیل ہے،

ہم ایمان لائے۔ (۱) خدا، قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور ہم ایمان لائے (۲) رب یسوع ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ یعنی خدا کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ عین خدا ہے۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔ اس کی وساطت سے تخلیق اشیاء ظہور میں آئی۔ ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا۔ وہ انسان بن کر آیا، مبتلائے مصیبت ہوا اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان پر چڑھا

اور اب زندوں اور مُردوں کا انصاف کرنے کے لئے پھر دنیا میں آئے گا۔"

یہ تو رہا حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ۔ ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے متعلق مقدس کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ

> وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالکہ ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمۂ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے ناس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کرسکتا اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے، اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کرسکتی .... ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں، وہ مستجاب ہوتی ہیں۔
>
> (CATHOLIC SCHOOL BOOK, P-158)

(بحوالہ شعلۂ مستور صفحہ ۱۳۸)

چنانچہ اب حال ہی میں، پوپ کی مجلس نے فیصلہ کیا ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے ساتھ حضرت مریمؑ کی بھی پرستش کی جایا کرے گی۔

قرآن کا دیا ہؤا تصوّر

خدا کے ان تصورات کے بعد اب قرآنِ کریم کی طرف آیئے۔ اس نے سب سے پہلے ان تمام تصورات کی یہ کہہ کر تردید کردی کہ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ (۲۳/۹۱) لوگ خدا کے متعلق جو تصورات اپنے ذہن سے پیش کرتے ہیں، وہ ان سے بلند اور پاک ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے، تم اس کا ادراک نہیں کرسکتے۔ اس لئے کہ تم انہی چیزوں کا ادراک کرسکتے ہو، جو محسوسات کے دائرہ میں آسکیں اور خدا کی ذات اس سے ماوراء ہے۔ لہٰذا، لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۶/۱۰۴) "انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔ وہ بہت لطیف و خبیر ہے۔" اس کی ذات کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جاسکتا۔ اس لئے کہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲/۱۱) اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ (۱۱۲/۳) نہ وہ خود کسی کا بیٹا، نہ کوئی اس کا بیٹا۔ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲/۴) نہ کوئی اس کا ہمسر، وہ یکسر یگانہ اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

اس کی ذات کے متعلق تو تم کچھ نہیں جان سکتے۔ البتہ اس نے جو اپنی صفات بیان کی ہیں، ان سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے، اس سے بلند، پاکیزہ، باعظمت اور حسین تصور ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ خدا اور انسان کا تعلق

سوال یہ ہے کہ خدا کی ان صفات پر ایمان لانے سے فائدہ کیا ہے۔ ایک شخص تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی یہ صفات ہیں۔ دوسرا اس سے انکار کرتا ہے۔ اُس اقرار اور اِس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی پیکر "رُوحِ خداوندی" کا حامل ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات میں اس کا امکان رکھ دیا گیا ہے کہ وہ (علیٰ حدِّ بشریت) ان خدائی صفات کو اپنے اندر اجاگر کرتی جائے۔ یہی وہ خدا کا رنگ ہے، جس سے حسین تر رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (۲/۱۳۸)) اس اعتبار سے، خدا کی یہ صفات، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ یہ وہ (IDEAL) ہے جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس پر وہ پورا اُترنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس خارجی معیار پر ہر آن اپنے آپ کو ناپتا جاتا ہے اور اس طرح علیٰ وجہ البصیرت پرکھتا جاتا ہے کہ اس کی ذات کی کس حد تک نشوونما (DEVELOPMENT) ہوئی ہے اور اس میں ہنوز کیا کمی ہے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ کس موقع پر خدا کی کون سی صفت کا ظہور ہوتا ہے تاکہ ایسے موقع پر انسان کی طرف سے بھی اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ اس سے یہ متعیّن ہوتا ہے کہ خارجی واقعات و حوادث پر انسان کا ردِّ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ یاد رکھئے! جس طرح انسان کے لئے صفاتِ حسنہ کا حامل ہونا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی واقعہ پر انسان کی طرف سے اسی صفت کا ظہور ہو، جو اس کے لئے مناسب اور موزوں (APPROPRIATE) ہو۔ شقی القلب ظالم پر، جس کے دل میں نہ احساسِ ندامت ہو نہ آرزوئے اصلاح، ترس کھا کر اسے کھُلا چھوڑ دینا، مظلوم انسانوں پر بے انتہا ظلم ہے لیکن جہاں عفو اور درگذری سے خوشگوار نتائج متوقّع ہوں، وہاں بدلہ لینا ظلم کے مترادف ہو جاتا ہے۔ عضلات (MUSCLES) کی چوٹ آہستہ آہستہ مالش سے ٹھیک ہو جاتی ہے لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو سخت لکڑی کی تختیوں (SPLINTS) سے کس کر باندھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے جباریت کہتے ہیں۔ (جرّاح کی ان لکڑیوں کو جبائر کہتے ہیں) قرآنِ کریم ان صفاتِ خداوندی اور ان کے مواقعِ ظہور و اطلاق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ جہاں ایک فردکی ذات کی نشوونما کا معیار بنیں، وہاں یہ بھی بتائیں کہ انسان کی طرف سے کس موقع پر کس قسم کا ردِّ عمل ہونا چاہیئے۔

اسی سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک مستبد بادشاہ (AUTOCRAT KING)

اور مطلق العنان آمر (DICTATOR) کا ہوتا ہے، جس کے تمام فیصلے اس کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں اور ان میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہوگیا تو مجرم کو خلعت بخش دی۔ ناراض ہوگیا تو بے گناہ کو حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ جس طرح ہو سکے، اس "خدا" کو خوش رکھے۔ وہ اس کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اس کے حضور نذرانے گزارتا ہے۔ اس کے مقربین کے وسیلے حاصل کرتا ہے۔ اس تک سفارشیں پہنچاتا ہے۔ اس کی ناراضگی سے ہر وقت ڈرتا ہے اور اس ڈر سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ ان احکام کی فرمانبرداری سے انسان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود صرف "خدا" کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف، عیسائیت ہے جہاں خدا کا تصور ایک رقیق القلب باپ کا ہے۔ وہاں بھی قاعدے اور قانون کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نجات کا مدار خدا کے رحم پر ہے یا مسیحؑ کے کفارہ کے ایمان پر۔

قانون کا خدا

قرآن نے آکر اس تصور کی بھی تردید کی اور کہا کہ خدا نے، اپنی لامحدود قوتوں اور بے انتہا اختیارات کے باوجود، ہر کام کے لئے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور وہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق کرتا ہے۔ یہ قوانین اس قدر اٹل ہیں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبۡدِیۡلًا وَ لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحۡوِیۡلًا (۴۳/۳۵) قانون کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر بات (CAUSE AND EFFECT) علت اور معلول کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے یعنی اگر فلاں کام کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا انجام یہ ہوگا۔ اس نے انسان کو یہ تمام قوانین بتا دیئے، اچھی طرح سمجھا دیئے۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس قانون پر عمل کرنے سے اس کا یہ فائدہ ہوگا اور اس کی خلاف ورزی سے اس کا یہ نقصان ہوگا۔ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اس سے کہہ دیا کہ اب تمہارا جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کر لو اور جی چاہے تو اس کے خلاف چلے جاؤ۔ اِنَّا ھَدَیۡنٰہُ السَّبِیۡلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوۡرًا (۷۶/۳) "ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ اب وہ چاہے، اسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے"۔ وہ صحیح راستہ اختیار کر لے گا تو اس سے اسی کا فائدہ ہوگا، ہمارا کچھ نہیں سنورے گا۔ غلط راستے پر چلے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، ہمارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَ عَلَیۡہَا مَا اکۡتَسَبَتۡ (۲/۲۸۶) یہی وجہ ہے کہ خدا کسی بات کو حکماً اور جبراً نہیں منواتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے مشورۃً کہتا ہے۔ اس نے قرآن نازل کرنے کے بعد کہہ دیا کہ

وَ قُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۟ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّ مَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ (۱۸/۲۹)

ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف آ گیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے جس کا
جی چاہے اس سے انکار کر دے۔

ظاہر ہے کہ جس بات کے ماننے، نہ ماننے کا فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہو، اگر وہ صاحبِ عقل و ہوش ہے تو وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے ایمان، اندھے یقین (BLIND FAITH) کا نام نہیں۔ یہ اس ذہنی اور قلبی اطمینان (CONVICTIDN) کا نام ہے جو انسان کو علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

اَلَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا (۲۵/۷۳)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب (اور تو اور) خود ان کے ربّ کی آیات بھی ان کے سامنے لائی جاتی ہیں، تو
وہ ان پر بہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے، انہیں عقل و بصیرت سے قبول کرتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اعمال کے نتائج، قاعدے اور قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہوں، تو اس میں کسی کے فدیہ دے کر چھوٹ جانے یا سفارش سے رہا ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی انگلی آگ میں ڈال دیں اور اس کے بعد ہزار روپیہ دے کر بھی چاہیں کہ جلنے کا درد آپ کی جگہ کسی اور کو ہو جائے تو یہ ناممکن ہو گا۔ اگر آپ سنکھیا کھا لیں، تو چاہے آپ گورنر جنرل کی سفارش بھی کیوں نہ لے آئیں، آپ اس کے مُضر اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خدا کے اس قانون کی طرف رجوع کریں جس کے مطابق، جلنے کے درد کو آرام، اور سنکھیا کے مہلک اثرات سے حفاظت مل سکتی ہے۔ انسان کو تکلیف اور راحت، اس کے اعمال کے نتائج میں، خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَیِّنَةٍ وَّیَحْیٰى مَنْ حَیَّ عَنْۢ بَیِّنَةٍ (۸/۴۲)
تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے، وہ بھی دلیل اور برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ نہ کوئی بے گناہ، مستبد حاکم کے غصّے اور جذبۂ انتقام سے سزا پاتا ہے اور نہ ہی مجرم، فدیہ، کفّارہ یا سفارش سے چھوٹ سکتا ہے۔ اسی لئے انسانوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ
مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہیں آ سکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی
جائے گی۔ نہ ہی کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔

آپ نے غور کیا کہ "قانون والے خدا" کا تصور دے کر، قرآنِ کریم نے کس طرح مذہب کو سائنس بنا دیا۔ سائنس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس میں

(۱) ہر سبب (CAUSE) اپنا ایک مقررہ نتیجہ (EFFECT) پیدا کرتا ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اور

(۲) سائنس، انکشافِ حقیقت اس طرح کرتی ہے کہ اس پر کسی شخص کی خواہش، آرزو، مقصد، مفاد، جذبات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ ان باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔

خدا کا جو تصور، قرآن پیش کرتا ہے، اس کی رو سے اعمال اپنے نتائج بھی اسی طریق سے مرتب کرتے ہیں اور حقائق کا اظہار بھی اسی طرح کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہمارا یہ پیغام "شاعری" نہیں۔ کالرج (COLERIDGE) نے ایک جگہ کہا ہے کہ شاعری کی ضد، نثر نہیں، سائنس ہے (THE ANTI-THESIS OF REALITY IS NOT PROSE BUT SCIENCE) قرآن، شاعری نہیں، سائنس ہے۔

خدا اور انسان کے تعلق کے سلسلے میں، قرآنِ کریم ایک اور عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود جاری و ساری ہیں۔ ان کے مطابق، ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ اور کائنات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی خدا کے قوانین اسی طرح نافذ العمل ہیں لیکن ان کی کائناتی رفتار بڑی سست ہے اور انسانی عمر کا تقاضا ہے کہ اعمال کے نتائج جلد سامنے آجائیں۔ اگر انسانی دست و بازو قوانینِ خداوندی کو سہارا دیں اور ان کے بروئے کار آنے میں مدد کا موجب بنیں، تو ان کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے انسان، مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں، خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ خدا اور انسان کا یہ وہ تعلق ہے، جس کے متعلق "مذاہب کی دنیا" میں کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔ (چونکہ اس نکتہ کے متعلق، میں اس سے بہت پہلے لکھ چکا ہوں، اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔)

۳۔ انسان اور کائنات کا تعلق

خدا اور انسان کے تعلق کے بعد، انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کا سوال سامنے آتا ہے۔ جب ذہنِ انسانی اپنے

عہدِ طفولیّت میں تھا تو فطرت کی قوّتوں کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا تھا اور ان کے غضب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ اس کے ذہن میں آ سکتا تھا یعنی ان کے سامنے گڑگڑایا جائے اور ان سے رحم کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ اس دَور کے انسان کی حالت یہ تھی کہ بادل گرجا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بجلی کڑکی اور یہ سجدے میں گر گیا۔ سورج چمکا اور اس نے نمسکار کر دیا۔ زلزلہ آیا اور یہ ڈنڈوت بجا لایا۔ بپھرا ہوُا دریا سامنے آیا اور اس نے اسے ماتا کہہ دیا۔ شیر دھاڑا اور اس نے اسے دیوتا بنا لیا۔ ہندومت انہی دیوی دیوتاؤں کا مجموعہ ہے اور انہی کی پرستش سکھاتا ہے۔ یجر وید میں ہے۔

ہندو دھرم میں

زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ قبول ہو۔ جو سانپ ہوا میں یا آسمان پر ہیں ان کو ہمارا سجدہ ہو۔ جو سانپ دھانوں کے تیروں کے ساتھ آتے ہیں انھیں بھی سجدہ ہو۔ جو سانپ ابھی اپنے بلوں میں ہیں، انھیں بھی ہمارا سجدہ قبول ہو۔

یہ تو پھر بھی زندہ قوتیں تھیں، وہ ان غیر ذی حیات کو بھی سجدے کرتے تھے جن سے انھیں کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا۔ چنانچہ یجر وید ہی میں دوسری جگہ ہے کہ حجامت بنواتے وقت یہ اشلوک پڑھنا چاہیئے۔

> ہے اُسترے تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوُا ہے۔ تجھے ہمارا سجدہ قبول ہو تو اس بالک کو تکلیف نہ پہنچائیو۔

اتھر وید میں ہے۔

> سردی والے بخار کو ہمارا سجدہ ہو۔ گرمی والے بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں، روزانہ، دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو۔

ظاہر ہے کہ جس مذہب میں انسان اپنا مقام یہ سمجھے، اس میں شرفِ انسانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں اس نے اگر، جھوٹ نہ بولو، سچ بولو، کہہ بھی دیا تو کیا اس سے کائنات کی گتھیاں سُلجھ جائیں گی اور انسانی معاملات (HUMAN PROBLEMS) کا حل مل جائے گا؟

یہاں سے اُتر کر دوسری طرف آیئے تو وہاں مادی کائنات اور اس کی آرائش و آسائش کی چیزوں کو یکسر قابلِ نفرت قرار دیا جاتا ہے اور انسانی نجات کا راز ترکِ دنیا، ترکِ آرزو اور ترکِ لذّات میں بتایا جاتا ہے۔ جتنا کوئی دنیا سے دُور بھاگے، اتنا ہی وہ خدا کا مقرّب ہو جاتا ہے۔ رہبانیّت اور خانقاہیّت کی تعلیم، عیسائیّت کی اصل و بنیاد ہے۔ (SAINT BENDICT) نے اسے ایک منظّم ادارہ کی شکل دے کر تارک الدّنیا راہبوں (MONKS) اور راہبات

عیسائیت میں

(NUNS) کے غول کے غول پیدا کر دیئے۔ چنانچہ (BUCKS) اپنی (THEOLOGICAL DICTIONARY) میں مصر میں تحریکِ خانقاہیت کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ

تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرق سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا، جنھوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے کرب واذیّت اور مصائب و نوائب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعہ خدا اور عالمِ ملکوت سے قرب حاصل کیا جا سکے۔

اس قسم کی زندگی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا، وہی ہوا۔ چنانچہ (BUCKS) اس سلسلے میں لکھتا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ بعد ان لوگوں کی شہوت پرستی ضرب المثل ہو گئی۔ نیز انھوں نے مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرنا شروع کر دیں۔

ان تارک الدّنیا زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آ رہی تھی۔

لپٹ لپٹ کر مانگنے والے بھکاری، راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچے میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بدمعاشی اور فریب دہی ان کا شعار تھا۔۔۔ یہ لوگ مذہبی جوشِ عقیدت کے نقاب میں بدترین لوٹ کھسوٹ کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے تھے[1]۔

(PROCESS OF RELIGIOUS IDEAS VOL 3, P-240)

جو لوگ اس قسم کی مذموم حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، ان کی زندگی بھی عجیب وغریب انداز کی ہوتی تھی عیسائیوں کے ہاں جو بڑے بڑے اولیاء (SAINTS) کا نام ملتا ہے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی قسم کھا لیتا کہ میں عمر بھر غسل نہیں کروں۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں روحانی ترقی کا راز سمجھتا۔ کوئی ساری عمر اندھیری کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ یہ تھا عیسائیت کی ترکِ دنیا کی تعلیم کا نتیجہ۔

قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ تیرا مقام، فطرت کی قوتوں سے بہت بلند ہے۔ ان سب کو ہم نے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاکہ تو ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ (اَللّٰہُ الَّذِیْ) سَخَّرَ لَکُمْ مَّا

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کی خانقاہوں اور تجرّد گاہوں کے حالات بھی ایسے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائیت یا ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ میں ترکِ دنیا کی تعلیم ان کا عین مذہب ہے اور مسلمانوں میں یہ کچھ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم اس وقت ان مذاہب کی تعلیم کے نتائج کے متعلق بات کر رہے ہیں۔

قرآن کریم کی رُو سے — فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۲) اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے تابع تسخیر کردیا ہے۔ اس نے کہا کہ مقامِ آدم یہ ہے کہ تمام ملائکہ (فطرت کی قوتیں) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مقامِ مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کرکے انھیں نوعِ انسان کی نفع رسانیوں کے لئے صرف کرے۔ محسوس کائنات میں انسان سے اوپر صرف مقامِ خداوندی ہے، جس کے قانون کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ انسان سے برتر کوئی شے نہیں۔ دنیا کی زیبائش و آرائش کی چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انہیں کوئی قابلِ نفرت اور حرام قرار نہیں دے سکتا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (۷/۳۲)

ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنھیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار رزق کو حرام قرار دے سکتا ہے؟

آدمی کا یہ مقام اور انسان اور کائنات کا یہ تعلق "دنیائے مذاہب" میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔ وہاں یا تو مظاہرِ فطرت کے سامنے جُھک جانا ہوگا یا ان سے دُور بھاگ جانا۔ انھیں مسخر کرکے تعمیرِ انسانیّت کے کاموں میں صرف کرنا، صرف قرآن میں ملے گا۔

یاد رکھئے کہ قرآنِ کریم جب قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ان میں فطرت کے طبیعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں اور اخلاقی قوانین بھی۔ طبیعی قوانین کی اطاعت سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرلیں

(WE OBEY NATURE TO COMMAND IT)

اور اخلاقی قوانین کی اطاعت سے ہماری ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قوانین کی اطاعت، ہماری قوتوں میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔

می شود از جبر پیدا اختیار

۴۔ انسان اور انسان کا باہمی تعلق

انسان اور کائنات کے تعلق کے بعد، ہمارے سامنے انسان اور انسان کے باہمی تعلق کا سوال آتا ہے۔ ہندومت

نے اس کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ براہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں، کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویش اس کی ٹانگوں سے اور شودر اس کے پاؤں سے۔ یہ وہ ازلی تقسیم ہے، جسے نہ دنیا کا کوئی نظام الٹ سکتا ہے اور نہ ہی انسانوں کی ذاتی کوششیں اس میں تغیر و تبدّل کر سکتی ہیں۔ شودر کو ساری عمر اچھوت رہنا ہوگا۔ اس کا فریضہ، اونچی ذات کے ہندوؤں کی خدمت گزاری ہے۔ براہمن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ، پیدائش کے دن سے مرتے وقت تک، بلند ترین مدارج اور حقوق کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے حقوق کی کیفیت یہ ہے کہ (رگ وید اور اتھروید کے حکم کے مطابق)

ہندو دھرم میں

> اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں لیکن اگر براہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جاتا ہے کیونکہ براہمن ہی عورتوں کا مالک اور خاوند ہے نہ کہ کھشتری یا ویش۔
>
> (مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں ص۱۴۱) (ایڈیشن ۱۹۷۷ء)

یہ تقسیم تھی بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کی۔ باقی رہے اس کے باہر کے انسان، سو وہ انسان نہیں ملیکش سمجھے جاتے تھے۔ آپ سوچئے کہ جس مذہب میں، خود اپنے اہلِ مذہب کو اس طرح ورنوں کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں جکڑ دیا جاتے اور اس سے باہر کے انسانوں کو اس درجہ قابلِ نفرت و حقارت سمجھا جاتے، اس میں جھوٹ نہ بولو اور چوری نہ کرو کا پرچار کیا اخلاقی اصلاح پیدا کر سکتا ہے؟

یہودیّت میں

یہودیوں کے ہاں مذہب، بنی اسرائیل کی نسل کے اندر محدود تھا۔ کوئی شخص جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہ ہو، دینِ خداوندی کے اندر داخل کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جنّت صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص تھی۔ غیر بنی اسرائیل سب جہنّم کا ایندھن تھے۔ اپنی نسل سے باہر کے انسانوں کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات بھڑکتے رہتے تھے اور یہ سب (مروجہ) تورات کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ان کے ہاں یہودیوں کے لئے قانون اور تھا اور غیر بنی اسرائیل کے لئے اور۔

عیسائیت میں

عیسائیت کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لئے عالمگیر مذہب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا لیکن یہ چیز، عیسائیت کی تعلیم نہیں بلکہ بعد میں سیاسی مصلحتوں کا پیدا کردہ تصوّر ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل میں (جو اگرچہ وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے) ابھی تک یہ لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت یسوعؑ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو انھیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے

کے پاس جانا۔ (متی، باب صفحہ ۱۰۔ آیات ۶-۵)

یہاں تک کہہ دیا کہ

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ (متی باب ۷ آیت ۶)

یہ جو آپ یورپ میں نیشنلزم کی لعنت کو اس درجہ شدید دیکھتے ہیں' یہ غیر شعوری طور پر اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ مذہب کو تو انھوں نے گرجا کی چار دیواری کے اندر محبوس کر دیا۔ لیکن اس کی نسل پرستی کی تعلیم کے اثرات ان کے تحت الشعور میں اسی طرح موجود ہیں۔ ان کے سامنے عالمگیر انسانیت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں اپنی قوم کے لئے اخلاقی اصول اور ہیں اور دوسری قوموں کے لئے اور۔ جس طرح رومنز کے ہاں یہ قانون تھا کہ کسی رومی کے ہاں چوری کرنا جرم ہے اور غیر رومی کے ہاں چوری کرنا کوئی جرم نہیں۔

قرآن کی رو سے

قرآن نے آ کر انسانوں کی ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑا اور اعلان کر دیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ انسان اور انسان میں پیدائش کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱) خدا نے تم سب کو ایک جرثومۂ حیات (LIFE CELL) سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۰/۱۹) پوری کی پوری انسانیت (MANKIND) ایک قوم ہے اور ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)

ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔

کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ یہاں نہ کوئی براہمن ہے نہ شودر، نہ کوئی جاتی اُتر ہے نہ نیچ۔ سب انسان یکساں ہیں۔ باقی رہے معاشرہ میں ان کے مدارج، سو اس کا معیار ان کے جوہرِ ذاتی اور سیرت و کردار پر ہے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۱۹/۴۶) ہر ایک کے درجات ان کے اعمال کی رو سے متعین ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہوگا، جس کی سیرت سب سے پاکیزہ اور کردار سب سے بلند ہوگا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۴۹/۱۳) قرآن کا خدا، تمام نوعِ انسان کا یکساں ربّ، مالک اور الٰہ ہے۔

(قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ۔ (۱۱۴/۱-۳)

اس خدا کی کتاب بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) تمام نوعِ انسان کے لئے مجموعہ بصائر و حکم۔ اس کا رسول، تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں رسول۔

قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (۷/۱۵۸)

ان سے کہہ دو کہ اے تمام دنیا کے انسانو! تم سب کی طرف میں خدا کا رسول ہوں۔

اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اسی نظریہ یا عمل کو حاصل ہو سکتا ہے جو بلا تفریقِ رنگ، نسل، زبان، وطن، مذہب، قومیت، تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

زمین میں باقی وہی رہتا ہے جو انسانیّت کے لئے نفع بخش ہو۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، مغربی تصوّرِحیات نے بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا اصول دیا، یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ قرآن نے اس کی بجائے "بقائے الفع" کا اصول دیا، یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک تصوّرِحیات کے بدل جانے سے انسانی زندگی کے تمام گوشے کس طرح بدل جاتے ہیں اور اس سے دنیائے انسانیّت میں کس قدر حیات افروز اور حسن افزا تبدیلی آجاتی ہے؟ یہی وہ تصوّرِحیات ہے جس سے انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ میں دوسروں کی بہتری کے لئے کیوں کوشش کروں؟ حیاتِ دوام حاصل کرنا ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے کام کرو جو عالمِ انسانیّت کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہوں۔ دوسرے کی ضرورت شدید ہو تو اسے اپنے آپ پر ترجیح دو۔

(يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) (مومن وہ ہیں جو خود تنگی میں رہتے ہیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)

اور یہ سب کچھ بغیر ذاتی غرض کے کرو ——— وہ کہتا ہے کہ مومن جب دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُورًا (۷۶/۹) ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ حتّٰی کہ تم سے شکریہ تک بھی نہیں چاہتے۔

سوچئے کہ اس تصوّرِحیات کی رُو سے اخلاقی اقدار کس طرح زندگی کا معمول بن جاتی ہیں۔

انسانی مساوات کے تصوّر کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے، جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کا غلام ہونا تو ایک طرف، کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کا محتاج۔ اس سے ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے، جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸)) یہ نظام ہر فرد کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دیتا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) کہ ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔" کہیئے ! اس نظام میں کسی کو جھوٹ بولنے یا چوری اور بددیانتی کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے ؟ اس میں اخلاقی اقدار خود بخود بروئے کار آتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظام میں نہ کسی کو خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) حاصل ہوتے ہیں، نہ مذہبی پیشواؤں کا وجود باقی رہتا ہے۔ نہ ملوکیت نظر آسکتی ہے نہ سرمایہ داری۔ "دنیائے مذاہب" میں اس قسم کا نظام تو ایک طرف، سرے سے نظام کا تصوّر ہی نہیں ملتا۔

قرآنی نظام

نظام کے تصوّر سے، قرآنِ کریم نے ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے جو "دنیائے مذاہب" میں بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نوعِ انسانی کی راہ نمائی کے لئے جن غیر متبدل اصولوں کی ضرورت تھی، وہ قرآن میں دے دیئے گئے۔ اور ان کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں، ہر آنے والی نسل، اپنے معاملات، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود حل کرے گی۔

ختمِ نبوّت

اس لئے اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا اب نبوّت کو بند کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ ختمِ نبوّت، دنیائے مذاہب میں کتنے عظیم انقلاب کا اعلان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اب ذہنِ انسانی، اپنے عہدِ طفولیّت سے نکل کر سنِ شعور میں پہنچ گیا ہے۔ انسان اب بچہ نہیں رہا، بالغ ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اسے "کسی آکر اٹھانے والے" کی احتیاج نہیں رہی۔ اسے اب خود اُٹھنا اور آگے چلنا ہوگا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سے انسان میں کس قدر خود اعتمادی (SELF CONFIDENCE) پیدا ہوتی ہے اور وہ کس طرح دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے!

دنیا کا ہر مذہب، کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہے جو آکر اس مذہب کو دوسرے مذاہب پر غلبہ عطا کرے گا۔ قرآن نے اس تصوّر کی تردید کر کے کہہ دیا کہ ہم نے جو نظامِ زندگی تمہیں دیا ہے، اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ دنیا کے تمام نظامہائے زندگی پر غالب آجائے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)

تم اس نظام کو عملاً متشکل کرو۔ یہ انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آجائے گا۔ اس کے سامنے کوئی دوسرا نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔

قرآن، اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظامِ زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے، جس میں اخلاقی اقدار خود بخود غالب آجاتی ہیں۔

۵۔ انسانی زندگی کا منتہیٰ (نجات)

اس کے بعد، آپ اس سوال کی طرف آیئے جو اس بحث میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے اور اس سے بہت سے متعلقہ گوشے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں، انسانی زندگی کی تمام سعی و کاوش کے منتہیٰ کو ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے اور وہ لفظ ہے "نجات" ــــ مکتی (SALVATION) ۔ نجات سے مفہوم کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور اسے اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے تو اسے نجات کہتے ہیں، یعنی نجات کے لئے ضروری کہ وہ شخص پہلے کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ مذہب کی دنیا میں انسان کے متعلق یہی بنیادی تصور ہے۔

ہندو دھرم میں

ہندو مت (دھرم، یعنی شریعت) میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات (جاندار خواہ وہ کیڑے مکوڑے ہوں یا حیوانات اور انسان) اپنے سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص موجودہ جنم میں انسان ہے۔ اس نے بُرے کام کئے تو وہ اگلے جنم میں چوہا بن جائے گا۔ چوہے کو قطعاً معلوم نہیں کہ وہ کس جرم کی پاداش میں چوہا بنا دیا گیا ہے۔ اب اگر وہ چوہا نیک کام کرے گا ــــ چوہا نیک کام کرے گا؟ گویا جانور بھی نیک کام اور بُرے کام کرتے ہیں!! ــــ تو وہ آئندہ جنم میں (شاید) پھر انسان بن جائے۔ ہر انسان اس آواگون (TRANSMIGRATION) کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔ اس چکر سے چھٹکارا مل جانے کا نام نجات ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ عقیدہ یا تو توہم پرستی

کی پیداوار ہے اور ان لوگوں کے ذہنِ رسا کی تخلیق جنہوں نے کسی نہ کسی طرح معاشرہ میں اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے بعد چاہا کہ وہ اقتدار انہی کے گھرانوں میں مخصوص رہے۔ دوسرے لوگ اس اقتدار کے حصول کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ برہمن اور کھشتری حکمران طبقے تھے اور ویش اور شودر ان کے خدمت گزار۔ ہو سکتا تھا کہ کبھی ویش یا شودروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتے کہ براہمنوں اور کھشتریوں کے بچوں کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ یہ پیدائش کے ساتھ ہی حکمران بن جائیں اور ہم ان کی غلامی کرتے رہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ براہمن کے گھر میں پیدا ہی وہ ہوتا ہے، جس نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے ہوں اور ویش اور شودر کے ہاں وہی پیدا ہوتا ہے، جس نے سابقہ جنم میں بُرے کام کئے ہوں۔ لہٰذا یہ تقسیم اعمال کے نتائج کے اعتبار سے عمل میں آتی ہے۔ یوں ہی دھاندلی سے پیدا نہیں کر دی گئی۔ انہیں اس زندگی میں بہرحال ویش اور شودر رہنا ہو گا۔ البتہ اگر وہ اچھے کام کریں گے (یعنی اُمّم جاتی کے لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے) تو اگلے جنم میں براہمن اور کھشتری بن جائیں گے۔ اس عقیدے کی رُو سے محکوم طبقات کو مطمئن کر دیا گیا کہ یہ سب ان کے اپنے کئے کا پھل ہے۔ ان پر ظلم نہیں ہو رہا، نہ ہی وہ اس جنم میں اس تقسیم کو بدل سکتے ہیں۔

اس عقیدے کا جذبۂ محرکہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کا نتیجہ جس قدر انسانیت سوز ہے، وہ ظاہر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس سے انسان مجبورِ محض ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ جو کچھ جی میں آئے کر لے، اپنی موجودہ پوزیشن میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا اور معاشرہ ایسے مستقل طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے، جنہیں مٹایا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر یہ کہ اس تمام تگ و تاز سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ کہ انسان آواگون کے اس چکّر سے نجات حاصل کر لے۔ انسانی تخلیق اور نظامِ کائنات کا یہ مقصد کس قدر بے معنی ہے؟

ویدانت کی رُو سے

ہندو ویدانت (طریقت یا تصوّف) کی رُو سے، انسان کی روح (آتما) خُدا (پرماتما) کی رُوح کا حصّہ ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر، مادی دلدل میں پھنس چکی ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ مولانا روم کے الفاظ میں، جو اسی ویدانتی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے۔

بشنو از نَے چو حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ روح، مادی دلدل سے نجات حاصل کر کے، اپنی اصل سے جا ملے یعنی غالب

کے الفاظ میں ـــــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ـــــ ترکِ دنیا، سنیاس اس کا طریقہ ہے. آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رُو سے، انسانی تگ و تاز کا ما حصل کیا ہے؟ فنا، مکمّل فنا (COMPLETE ANNIHILATION) یعنی خدا نے انسانی روح کو اپنے سے الگ کر کے، اسے مادی دلدل میں پھنسا دیا اور اس سے کہہ دیا کہ اب تم مشقتیں اٹھاؤ اور مصیبتیں جھیلو تاکہ تم اس دلدل سے نجات حاصل کر سکو. آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار کی پابندی کے لئے جذبۂ محرّکہ کیا بنتا ہے؟

یہودیت میں

یہودیت میں بھی انسانی زندگی کا منتہیٰ "نجات" ہے لیکن وہاں نجات کا تصور کچھ مختلف ہے. جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہودیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اولاد ہیں، اس لئے وہی جنّت کے واحد وارث ہیں جو انسان بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہؤا، وہ جنّت میں نہیں جا سکتا. اس زمانے میں بنی اسرائیل ہی میں ختنے کا رواج تھا. اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ مختون سب جنّت میں جائیں گے اور غیر مختون جہنّم میں. چنانچہ تالمود میں ہے،

> آخرت میں حضرت ابراہیمؑ جہنّم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہیں ہونے دیں گے. اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے، سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے. وہ ان بچوں کی ختنہ کی کھال اُتار کر جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے ختنے کے مقام پر چپکا دیں گے اور اس طرح انھیں نا مختون بنا کر (چند دنوں کے لئے) جہنّم میں بھیج دیں گے.

(تالمود ص۴۰۴، بحوالہ برق طور صفحہ ۱۵۰) ایڈیشن ۸۵ء

لیکن ان کا جہنّم میں داخلہ محض رسم (FORMALITY) پوری کرنے کے لئے ہوگا. جہنّم کی آگ ان پر کچھ اثر نہیں کرے گی. (ایضاً ص۴۰۵) اس کی وجہ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں یہ لکھی ہے کہ

> اسرائیلی گناہگاروں کو جہنّم کی آگ چھو نہیں سکے گی. اس لئے کہ وہ جہنّم کے دروازے پر گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے. (جلد پنجم صفحہ ۵۸۳)

اُخروی نجات ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں عزّت و سرفرازی کے لئے بھی یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ

> بعض کو عزّت ان کے آباؤ اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں کے اعمال کے صدقے میں. (جیوئش انسائیکلوپیڈیا، جلد ششم، صفحہ ۶۰)

انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں ہے کہ

یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آباؤ اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیمؑ ہمارے جدِ امجد ہیں۔

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں مذکور ہے کہ

یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصے میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد ۱۱۔ صفحہ ۱۴۴)

آپ نے غور فرمایا کہ ان عقائد کی موجودگی میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا کوئی سوال بھی پیدا ہوتا ہے؟

عیسائیوں میں

عیسائیت میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنے اوّلیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان سے ان گناہوں کی آلائش کا دُور ہو جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے لئے خدا نے انسانوں پر رحم کھایا اور اپنے اکلوتے بیٹے (یسوع مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ صلیب پر جان دے کر ان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کر دے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے اس کفارہ پر ایمان لائیں گے، ان کی نجات ہو جائے گی۔ جو ایمان نہیں لائیں گے، وہ جہنم میں جائیں گے۔ نجات کے لئے اعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چنانچہ سینٹ پال، افسیون کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے۔

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں، خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیون ۹۔۸/۲)

اور رومیوں کے نام خط میں ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کے بغیر، ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ (۳/۲۸)

گلیتون کے نام ایک خط میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی گئی ہے کہ

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں، وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں، وہ لعنتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا

کیونکہ لکھا ہے کہ راست باز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں۔ مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا (معاذ اللہ) اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا دیا۔

(گلیتون ۱۴-۱۰/۳)

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کے بعد اخلاقی اعمال کی کہیں گنجائش بھی رہتی ہے بلکہ اس کی رُو سے جو شخص اعمال پر بھروسہ کرتا ہے، وہ لعنتی قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے اس عقیدہ کی رُو سے، انسان جس مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، وہ اس کے اپنے کسی جرم کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے اوّلین ماں باپ کے گناہوں کی پاداش ہے، جس میں یہ بے چارہ مفت میں ماخوذ کر دیا گیا ہے اور پھر اس مصیبت سے چھٹکارا، کسی حسنِ عمل کے نتیجہ میں نہیں ملتا بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان سے ملتا ہے۔ باقی رہا "ازلی گناہ" کے عقیدہ کا باطل ہونا، سو اس کے متعلق اب خود عیسائی دنیا کے اربابِ فکر و تحقیق، اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل ہے۔ مثلاً (R.F.JOHNSON) اپنی کتاب (CONUCIANISM - AND MODERN CHINA) میں لکھتا ہے کہ

ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی خرابی" ہے، جس کی وجہ سے ہم ہر قسم خیر سے بیزار اور ہر قسم شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

مسٹر (A.E. TAYLOR) لکھتا ہے۔

یہ عقیدہ ایک بطلان ہے۔ میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرتِ انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی ضرورت سے بچا لے۔

(MIND - JULY 1912)

قرآن کی رُو سے

یہ سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والا مذہب "اسلام" ہے، جس نے اعلان کر دیا کہ کوئی انسان نہ اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور نہ اپنے اوّلین ماں باپ کی لغزشوں کی آلائش سے ملوّث ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر انسانی بچہ "سادہ لوح - (CLEAN - SLATE) لے کر آتا ہے اور واجب التکریم پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر حیوانی سطح کی طبیعی زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بطور امکانات (REALISABLE POSSIBILITIES) رکھ دی گئی ہیں۔ ان صلاحیتوں (POTENTIALITIES) کی نشوونما (DEVELOPMENT) انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اگر انسان صرف اپنی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے تو اسے طبیعی دنیا میں آسائشیں اور قوتیں

حاصل ہوجاتی ہیں لیکن اسے انسانی سطح کی وہ بلند زندگی نصیب نہیں ہوتی، جسے قرآن جنّتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔

مَن كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَن نُّرِيدُ. ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَّدْحُورًا (۱۷/۱۸) جو صرف دنیاوی زندگی کا مفادِ عاجلہ چاہتا ہے اسے ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق 'جسے ہم نے اپنے ارادے سے بنایا ہے' بہ عجلت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس کی (انسانی) زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے، جسے وہ ذلّت وخواری میں بسر کرتا ہے لیکن جو شخص طبیعی زندگی کے ساتھ اپنی انسانی زندگی کی بھی نشوونما کرتا ہے، اسے طبیعی مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی ذات میں بھی بالیدگی اور ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا (۱۷/۱۹) اور جو مستقبل کی خوشگواریاں چاہتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش کرتا ہے جیسی کرنی چاہیئے اور وہ خدا کی متعین کردہ بلند اقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھتا ہے' تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہوجاتی ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) ہم اس گروہ کو بھی اپنے قانونِ مشیت کے مطابق بڑھاتے رہتے ہیں اور اُس گروہ کو بھی اور ان کی سعی وعمل کے حساب سے انھیں اپنی بخشائشوں سے نوازتے ہیں۔ یاد رکھو! ہم نے اپنی ان نعمتوں پر بند نہیں لگا رکھے کہ کسی قوم کو اس سے آگے نہ بڑھنے دیں اور کسی سے رعایت برت کر اس کے لئے یوں ہی دروازے کھول دیں۔[1]

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

---

[1] قرآنِ کریم میں اس مضمون کی بے شمار آیات ہیں کہ ایمان و اعمالِ صالح کا فطری نتیجہ' اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اور حیاتِ آخرت کی سربلندیاں اور شادابیاں ہیں۔ جو لوگ زندگی کو اسی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں، انہیں اس دنیا میں آسائشیں حاصل ہوسکتی ہیں لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ یہ آیات میری کتاب "نظامِ ربوبیت" میں بہ تفصیل ملیں گی۔ اس مقام پر انہیں درج نہیں کیا جاتا۔

انسانی ذات کی یہ نشوونما اس نظام کے اندر ہو سکتی ہے جو مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ یہ نشوونما، اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے۔ نیک اعمال وہ جس سے انسانی ذات کو استحکام و بالیدگی ملتی ہے، بُرے وہ جن سے اسے ضعف پہنچتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ، ساتھ کے ساتھ انسانی ذات پر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ یہی اس کا اعمال نامہ ہے جو قرآن کے الفاظ میں اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور جو ظہورِ نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ جو انسانی ذات ایک خاص معیار کے مطابق نشوونما پالے گی، وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے گی ـــ اسے جنتِ اخروی کی زندگی کہتے ہیں جو اس معیار پر پوری نہیں اترے گی، اس کی نشوونما رک جائے گی۔ یہ جہنم کی زندگی ہے۔ اسی کو قرآن نے پلڑے کے بھاری اور ہلکا ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۔ (۱۰۱/۶-۹)

سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ مسرتوں کا جھولا جھولے گا اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہی کے گڑھے میں جاگرے گا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رُو سے مقصدِ زندگی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی مناسب نشوونما سے، ایک بلند مقام حاصل کرنا اور موجودہ زندگی سے اعلیٰ و ارفع سطحِ زندگی پر پہنچ جانا ہے۔ اسے قرآن نے فوز اور فلاح کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے، یعنی (ACHIEVEMENT) اور (SUCCESS) نہ کہ نجات (SALVATION)۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اس تصور کے ماتحت اس سوال کا جواب کس حسن و خوبی سے مل جاتا ہے کہ میں اخلاقی اقدار کی پابندی کیوں کروں۔ اس سے میرا کیا فائدہ اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان۔ یہی وہ طریق ہے، جس سے انسان ان اقدار کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت (RATIONALLY) کرتا اور قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند رہتا ہے۔

الدّین تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم چند اخلاقی اقدار ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام عطا کرتا ہے جو خدا، انسان، کائنات، قانونِ مکافات اور مقصود و مآلِ زندگی کے بنیادی تصورات پر استوار ہوتا ہے۔ اس پورے نظام کا نام الدّین ہے اور اس کی عملی شکل کو الاسلام

کہا گیا ہے۔ اخلاقی اقدار اسی نظام کے اندر نتیجہ خیز ہوتی ہیں اور علیٰ وجہ البصیرت ممکن العمل بھی۔ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں، جس میں یہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۸)

یہ حقیقت ہے کہ الدین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

اس لئے

مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۳/۸۴)

جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے اس نظام کو قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ دیکھ لے گا کہ آخر الامر وہ کسقدر نقصان میں رہتا ہے۔

اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا۔ نظام کے تصور سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس کے مختلف اجزاء کے نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں، جب اس نظام کو بالکلیہ اختیار کیا جائے۔ نظام کی مثال، طبیب کے نسخے کی سی ہوتی ہے۔ نسخے کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب آپ اسے پورے کا پورا، متعلقہ ہدایات کے مطابق استعمال کریں۔ اگر آپ اس نسخہ میں سے ایک دو دوائیاں لے کر انہیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو وہ آپ کو کچھ فائدہ نہیں دیں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ نقصان ہی دے دیں۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)

"کیا تم اس ضابطۂ قوانین کے ایک حصّہ کو ماننا چاہتے ہو اور ایک حصّے سے انکار کرنا چاہتے ہو۔ جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا، اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اس کے لئے اس دنیا کی زندگی میں ذلّت و رسوائی ہو اور وہ قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں۔"

اس نسخہ کے اجزائے ترکیبی، وہ تمام صفاتِ خداوندی ہیں، جنہیں قرآن الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارتا ہے۔ ان میں سے بعض اجزاء کو لے لینا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دینا کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے حقیقت (REALITY)

ایک ناقابلِ تقسیم وحدت (INVISIBLE WHOLE) ہے، جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ خدا کے اسماء الحسنیٰ حقیقتِ مطلق کے مختلف پہلو، (FACETS) ہیں۔ حقیقت ان تمام کے مجموعے کا نام ہے۔ ان میں سے بعض کو الگ کر لیا جائے تو وہ اس حقیقت کے اجزاء نہیں قرار پا سکتے۔ مثلاً اگر حقیقت کے سو گوشے ہیں اور ان سے آپ دس گوشے الگ کر لیتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے حقیقت کے ۱۰/۱ حصہ کو اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے آپ کو اسی تناسب سے وہ فائدہ ہو جائے گا جو پوری حقیقت کے اختیار کرنے سے ہوتا۔ آپ نسخے کی دس دوائیوں میں سے ایک دوائی کھا کر دسواں حصہ شفا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۔ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰)

"اور اللہ کے لئے الاسماء الحسنیٰ ہیں (وہ اس حقیقتِ کلّی کے مختلف گوشے ہیں) سو اسے ان تمام گوشوں کے ساتھ پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ان اسماء (صفات) میں سے (بعض کو لے کر) ایک طرف نکل جاتے ہیں۔" آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلامی نظامِ زندگی سے الگ رہتے ہیں، ان کے ہاں جن اخلاقی اقدار پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے، وہ وہی ہوتی ہیں، جن کا تعلق انسان کے نرم و نازک جذبات سے ہوتا ہے۔ ہمدردی، رحم، عفو، درگذری، منکسر المزاجی، نرم خوئی، کوئی دس گالیاں بھی دے جائے تو خاموش رہو۔ جو ایک گال پر طمانچہ مارے، اس کے سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو تمہارا کوٹ اتار لے، اسے صدری اتار کر خود دے دو۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ یا ذرا آگے بڑھو تو چڑیوں، کوّوں کو دانہ ڈالو۔ مویشیوں کے لئے پیاؤ بنا دو وغیرہ وغیرہ۔ عدل، ظلم کی روک تھام، سلب و نہب (EXPLOITATION) کا انسداد، عالمگیر انسانیت کے حقوق کا تحفظ، ایسا سیاسی نظام جس میں کوئی کسی کا محکوم نہ ہو، ایسا معاشرتی نظم و نسق جس کی بنیاد احترامِ آدمیت پر ہو، ایسا معاشی دستور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی بلامشقت و ذلّت پوری ہوتی رہیں۔ ایسا عمرانی آئین جس کی رُو سے ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرتا چلا جائے، ان باتوں کی ان کے ہاں کوئی اخلاقی اہمیت نہیں ہو گی۔

عیسائیت کی تعلیم کا نتیجہ

عیسائیت جو مذکورہ بالا قسم کی اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی علمبردار ہے، اس کے متعلق ہسپانیہ کے نامور پروفیسر، (DR. FALTA DECRACIA) کے الفاظ میں سنئے، جنہیں برفو (BRIFAULT) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں نقل کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے، جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے

تصورِ اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوتے ہوں، جنھیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے اور انھیں آئینِ محبّت کی تعلیم دی ہے۔ انھیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انھیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلائی ہے لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراجِ کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدّس جور و استبداد کے ستاتے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان آسمان سے اُترتا ہؤا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو ان کی طرف فارقلیط کا پیغامِ رحمت و شفقت پہنچاتا ہے لیکن اس جور و استبداد کی علّت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصوّر اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے، نظامِ عالم کا خاصہ ہے، اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بناء پر قائم ہے۔ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنّم ہے۔ وہ وہاں محبّت کا پیامِ عام کرتا ہے اور گناہ گاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنّم کا قیام ہے، اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں۔ انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں بند ھے رہیں۔ ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں، وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں، عیسائیت کی روح انھیں جا کر تسلّی دے گی لیکن یہ اس کے حیطۂ تصوّر میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمّہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصوّر اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے، جیسا صداقت کا تصوّر۔ وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد تک نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام ذمّہ داریوں کا ترک — مدینۂ آرزو، عدمِ مدافعت

خاموش اطاعت، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا، غرضیکہ اس قسم کے متشدد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن ظلم و استبداد اور جور و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ (THE MAKING OF HUMANITY) (P.P 332-333)

لامذہبوں کی حالت

یہ تو رہی مذہب پرست طبقہ کی اخلاقی اقدار کی کیفیت۔ اب ان لوگوں کو لیجئے جو نہ خدا کو مانتے ہیں، نہ انسانی ذات کی بقاء کو۔ نہ وحی کے قائل ہیں نہ حیاتِ آخرت کے اور اس کے باوجود اخلاقی اقدار کی تلقین کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی سے پوچھئے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ (مثلاً) غریب کی مدد کرنی چاہیئے تو مجھے سمجھایئے کہ میں غریب کی مدد کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے اس کے عجیب و غریب قسم کے جوابات ملیں گے۔ کوئی کہے گا کہ یہ انسانی فریضہ ہے کہ ہم غریب کی مدد کریں۔ ان سے پوچھئے کہ صاحب! انسانی فریضہ کا مطلب کیا ہے؟ اور وہ کون ہے جس نے مجھ پر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ کوئی کہے گا کہ ہمیں غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہیئے کہ اگر ہم کل کو غریب ہو گئے، تو دوسرا ہماری بھی مدد کرے۔ اوّل تو یہ معاوضہ (RECIPROCITY) کا جذبہ اس قدر پست ہے کہ اسے آپ کبھی بھی بلندیٔ کردار سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ جو لوگ اس کا انتظام کر لیں کہ انھیں کسی کی مدد کی کبھی ضرورت نہ پڑے، انھیں آپ غریبوں کی مدد کے لئے کس طرح آمادہ کر سکیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی اپیل یکسر جذبات سے ہوگی۔ دلیل و برہان کی رُو سے وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکیں گے اور یا ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو ان کے تحت الشعور میں یہ جذبات کروٹیں لے رہے ہوں گے کہ ان باتوں کو معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لئے معاشرہ میں عزت حاصل کرنے کے لئے یہ کچھ کرنا چاہیئے اور یا اس کے پیچھے سیاسی محرکات کارفرما ہوں گے جیسے مشنریوں کے ہسپتال، اسکول اور کالج، یا مہاتما گاندھی (آنجہانی) کی اہسا۔ یا یہ نتیجہ ہوگا روایتی اور وراثتی عقائد کا اور یا انسان کے کمزور اعصاب کا، جن کا نام نیک جذبات رکھ لیا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی انسانی کردار کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ باقی رہا نیشنل کیریکٹر، سو اس کے متعلق شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔ جذبات کے زور پر آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کوئی اچھا کام کرا سکتے ہیں لیکن اس اچھے کام کو اس کی زندگی کا معمول نہیں بنا سکتے۔ اس میں ثبات و دوام نہیں پیدا کر سکتے اور کیریکٹر کہتے ہی اس نہج زندگی اور اسلوبِ حیات کو ہیں، جس میں ثبات و دوام ہو۔ اس ثبات و دوام کا ضامن، صحیح تصورِ حیات پر ایمان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی مذہب کے پَیرو ہیں اور انھیں بھی جو کسی مذہب کو

نہیں مانتے، زندگی کے ان تصورات پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جو اس کے نظام کی اصل و بنیاد ہیں۔ وہ ان کے متعلق کہتا ہے کہ

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ ان تصورات پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ ایسا نہ کریں تو پھر سمجھ لو کہ یہ صداقت و حقیقت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس شاہراہ پر چل نہیں رہے۔

یہ ہیں برادرانِ عزیز اسلام کی وہ خصوصیات جو نہ عالمِ مذاہب میں کہیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی دنیائے فکر میں۔ اس لئے دین الحق اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

مسلمانوں کو انتباہ

اس مقام پر میں ایک انتباہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم یہ کہہ کر کہ ہمارا دین تمام مذاہب سے افضل ہے، خوش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ہم بھی دنیا میں سب سے افضل قرار پا جاتے ہیں اور (اگر دنیا میں ہماری حالت اچھی نہیں تو اس کی چنداں پروا نہیں، اس لئے کہ دنیا چند روزہ ہے اس کے بعد) آخرت میں جنت کے وارث ہمیں ہوں گے باقی سب جہنم میں جائیں گے۔

یہ بہت بڑی خود فریبی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ (قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی کچھ یہودی بھی کہا کرتے تھے۔ اس سے ان کی جو حالت ہوئی، وہ دنیا پر روشن ہے) اسلام کا افضل ہونا ہمیں اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کر کے خود افضل بن کر دکھائیں۔ خود ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا اور اسلام کی افضلیت پر ناز کرتے رہنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دنیا بھر میں ڈھول پیٹتا پھرے کہ ہمارے ہاں ایک خاندانی نسخہ ہے جو اکسیرِ حیات ہے اور تمام بیماریوں کا مجرّب علاج، اور خود اپنے سر درد کے لئے بھی دوسروں سے دوا تک مانگتا پھرے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے

کہئے کہ ایسے شخص کو وہ نسخہ کیا فائدہ دے سکتا ہے اور اس کا اس پر فخر کرنا اس کے کس کام آ سکتا ہے؟ اس سے تو اس کی الٹی جگ ہنسائی ہوگی اور کوئی شخص اس کے دعوے کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا۔ نسخے کے مجرّب ہونے کا اوّلیں اور بنیادی ثبوت خود اس خاندان کی اپنی صحت ہوگی۔ اسلام نے اپنی صداقت اور فوقیت کا یہی ثبوت

پیش کیا تھا جب نبی اکرمؐ نے اس دین کے مخالفین سے کہا تھا کہ

یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ (۶/۱۳۶)

تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ، میں اپنے نظام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اس گھر کی کامیابی آخرالامر کس کے حصہ میں آتی ہے۔ اس طرح میرا یہ دعویٰ سچ بن کر سامنے آجائے گا کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور ایسا کہنے والے نے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنے دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر دیا۔ جب حضورؐ کے مخالفین نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں، تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ (۱۰/۱۶)

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

یاد رکھئے! عزیزانِ من! دنیا میں اسلام کو بطور ایک سچے دین کے وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ دشمنوں کے بھرے مجمع میں اپنی زندگی کو اپنی صداقت کی شہادت میں پیش کر سکے اور پھر اس کے خلاف کسی کو انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ یہی اسلام کی تبلیغ کا صحیح طریقہ ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

اب آخر میں، میں دو ایک ایسے شکوک کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں جو اس ضمن میں اکثر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآنِ کریم دیگر اہلِ مذاہب سے کہتا ہے کہ میں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ہوں یعنی جو تعلیم تمہارے پاس ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ سو جب قرآنِ کریم خود ان مذاہب کی تعلیم کو سچا تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے سچی تعلیم صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے، دیگر اہلِ مذاہب کے پاس نہیں۔

اعتراض واقعی وزنی ہے اور اس کا جواب نہایت ضروری۔ سب سے پہلے آپ یہ دیکھئے کہ کیا یہ مطالبہ کہ دیگر اہلِ مذاہب اس پر ایمان لائیں، قرآنِ کریم کا مطالبہ ہے یا یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے؟ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ والے ٹکڑے کی پوری آیت یوں ہے۔ یہود سے کہا جاتا ہے کہ

وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ ۔ (۲/۴۱)

تم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) جو مصدق ہے اس کا جو تمہارے پاس ہے اور سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن خود اہلِ مذاہب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں۔

دوسرے یہ کہ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر یہ تصریح موجود ہے کہ ان اہلِ مذاہب نے اپنی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی تھی۔ لفظی تحریف بھی (۴/۴۶) اور معنوی بھی (۵/۷۸)۔ اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیئے تھے (۲/۷۹) اور حق کو باطل کے ساتھ مخلوط بھی کر دیا تھا (۳/۷۰) اس طرح ان کتابوں میں بے شمار اختلافات پیدا ہو چکے تھے (۱۱/۱۱۰) قرآن کے ان دعاوی کی شہادت خود یہ اہلِ مذاہب دیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی غیر مسلم بھی آج اس کا بہ دلائل دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں، وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کو میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں ملے گی، جس میں تمام مذاہبِ عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی تاریخ خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیق کے مطابق بیان کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو خود ان کے متبعین بھی حقیقی اور غیر محرّف نہیں کہتے، قرآنِ کریم ان کی صداقت کی شہادت کس طرح دے سکتا ہے۔

ان کتابوں میں اس قدر تحریف و الحاق کے باوجود کچھ اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ قرآنِ کریم انہی اقدار کی تصدیق کرتا ہے، نہ کہ پوری کی پوری کتابوں کی۔ اصل یہ ہے کہ یہاں مصدق کے معنی تصدیق کرنے والا نہیں۔ اس کے معنی ہیں سچ کر دکھانے والا۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ تمہارے پاس جو اخلاقی اقدار ہیں، وہ محض نظری حیثیت سے ہیں۔ میں وہ نظام دیتا ہوں جس میں یہ اقدار، سچی حقیقتیں بن کر سامنے آجاتی ہیں اور یہی میری خصوصیت ہے۔ مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ بھوکے کو روٹی کھلانی چاہیئے اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ تم اسے محض وعظ و نصیحت کے طور پر کہتے ہو اور لوگوں کو خیرات دینے کی تلقین کرتے ہو۔ اس سے جس طرح لوگوں کی بھوک کا علاج ہوتا ہے، اسے ہر شخص جانتا ہے؟ میں ایک ایسا عملی نظامِ معیشت عطا کرتا ہوں، جس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس طرح میں اس اخلاقی قدر کو سچ کر کے دکھا دیتا ہوں۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عملی نظام کی رُو سے، یہ تمام اخلاقی قدریں سچ بن کر سامنے آجاتی ہیں۔

یہ چیز دین میں ممکن ہے، مذہب میں نہیں۔ اس لئے اسلام کو الدّین کہا گیا ہے، مذہب نہیں کہا گیا۔ اس کا مقابلہ بھی دنیا کے دوسرے نظامہائے زندگی سے کرنا چاہیئے، مذاہب سے نہیں۔

دوسرا شبہ

دوسرا سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ایسے ہیں، جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں یا (مثلاً) ایک شخص ہندوؤں کے گھر پیدا ہوتا ہے اور نہایت دیانت داری سے اپنے دھرم کو سچا سمجھ کر اس اس پر کاربند رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ ان پر فلاح و فوز کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ یہ سوال بھی بہت سے قلوب کو طلسمِ پیچ و تاب بناتے رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

اگر نجات و سعادت یا جزا و سزا کا معاملہ محض جذباتی ہوتا تو واقعی یہ بات قابلِ تسلیم ہوتی کہ جن لوگوں کا کچھ قصور نہیں، انہیں سزا کیوں دی جائے لیکن جب جزا و سزا کا تعلق قانون سے ہو اور فوز و فلاح اعمال کے فطری نتائج کا نام تو اس میں جذبات کا دخل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس گاؤں میں مدرسہ نہیں، اس کے بچے ان پڑھ رہ جائیں گے اور جو فوائد پڑھے لکھے لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں، وہ ان سب سے محروم رہیں گے۔ یہ بہت بڑی سزا ہے جو ان بچوں کو مل رہی ہے، حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ آپ ان سے کتنی ہمدردی کیوں نہ کریں، علم سے بے بہرہ رہنے سے جو کمی ان میں آگئی ہے، آپ کی ہمدردیاں اور رقیق جذبات اس کمی کو دور نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ جو بچہ بیماری کی وجہ سے سال بھر سکول نہ جا سکے، آپ اسے اس بناء پر اگلی جماعت میں نہیں چڑھا دیتے کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے! اگلی جماعت میں اسے اسی ہی چڑھایا جائے گا، جس میں اس جماعت میں چلنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہو گی۔ قرآن کی رُو سے زندگی کے اگلے مراحل میں وہی پہنچ سکے گا، جس میں ان مراحل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہو گی۔

اسی اصول کا ان لوگوں پر بھی اطلاق ہو گا جو نہایت نیک نیتی سے غلط کو صحیح سمجھ کر اس پر کاربند رہتے ہیں۔ جو شخص نہایت نیک نیتی سے سنکھیا کو دوائی سمجھ کر کھا لیتا ہے، سنکھیا یہ کہہ کر اپنا مضر اثر نہیں روک لے گا کہ کھانے والے نے اسے نہایت نیک نیتی سے دوائی سمجھ کر کھایا تھا۔ سنکھیا اپنا اثر یکساں کرے گا، خواہ کسی نے اسے دیدہ دانستہ کھایا ہو یا غلطی سے۔ جو قوم آگ اور پانی (اگنی اور اندر) کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرتی رہے، وہ بھاپ کو اپنے کنٹرول میں لا کر انجن نہیں چلا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم ان تمام فوائد سے محروم رہے گی جو بھاپ (STEAM) کی قوت (POWER) سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی یہ محرومی کسی کی طرف سے ملی ہوئی انتقامی سزا نہیں، ان

کی جہالت کا فطری نتیجہ ہے جسے ہمدردی کے کوئی جذبات دُور نہیں کر سکتے۔ یہ اسی صورت میں دُور ہو سکتی ہے کہ وہ قوم قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرے اور فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کر کے ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ قرآن کی رُو سے فلاح و فوز کے لئے یہی قانون مقرر ہے۔ اس میں نہ کسی کی آرزوؤں کا دخل ہے نہ جذبات کا تعلق۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۔ مَنْ يَعْمَلْ سُوٓءًا يُجْزَ بِهٖ (۴/۱۲۳)

فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق (فیصلہ ہمارے قانون کے مطابق ہوگا اور وہ قانون یہ ہے کہ) جو بھی غلط کام کرے گا، وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا۔

اور قانون کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ اگر قانون لوگوں کے جذبات کے تابع چلنے لگے تو سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو جاتے۔

لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (۲۳/۷۱)

اگر حق لوگوں کے خواہشات کے تابع چلنے لگے تو ارض و سموات اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب تہس نہس ہو جائے۔ خدا ہو ہی وہ سکتا ہے جو جذبات سے بلند ہو۔ اسی لئے جو قومیں اپنے جرائم کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہوتی ہیں، ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا ۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا (۹۱/۱۴-۱۵) ان کے رب نے ان پر (قانونِ مکافات کا) (ROAD ROLLER) بھیج دیا، جس نے انھیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا اور ان کے انجام کے خیال سے خدا کے دل میں کوئی خوف اور ڈر پیدا نہ ہوا۔ وہ اس پر قطعاً لرزاں و ترساں نہ ہوا۔ حتیٰ کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ (۴۴/۲۹) نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس کے قانون میں توبہ اور بازآفرینی کی گنجائش ہی نہیں۔ جس سے کوئی ایک جرم سرزد ہو گیا، وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ نہیں۔ اس کے ہاں احساسِ ندامت کے بعد، اصلاح کا ہر وقت موقع ہوتا ہے

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۔ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۔ (۳۹/۵۳)

ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو وہ تمہاری لغزشوں کے مُضر اثرات سے تمہاری حفاظت کر دے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایسے اچھے کام کرو جن

سے اس نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے جو غلط روی سے تمہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) ناہمواریوں کے مضر اثرات کو حسن کارانہ زندگی کے اعمال ہی مٹا سکتے ہیں۔

اب رہی آخری بات کہ جن لوگوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچ سکا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ظاہر ہے

ہماری ذمہ داری

کہ اس کی ذمہ داری ہم پر ہے جو اس کتاب کی وراثت کے مدعی ہیں۔ ہم اگر اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہتے ہیں تو ان لوگوں کی غلط روی کا بار، جن تک ہم نے اسلام نہیں پہنچایا، ہماری گردن پر ہے۔ اسی کے لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ

وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (۲۹/۱۳)

وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ بھی۔

اس وقت اقوامِ عالم، حق و صداقت کا نظام سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، جس قدر انسانیت سوز جرائم کی مرتکب ہو رہی ہیں، ان کے عذاب کا حصہ خود ہماری گردن پر ہے اور یہ چیز ہماری حالت سے عیاں ہے۔ خدا نے ہمیں "شھداء علی الناس" بنایا تھا۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کی نگرانی کا فریضہ ہمیں سونپا تھا۔ ہم دوسروں کی نگرانی تو کجا، خود اپنی نگرانی کے بھی قابل نہ رہے۔ سو اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ جب کہیں چوری ہو تو سو جانے والا چوکیدار سب سے پہلے دھر لیا جاتا ہے۔ سو ہم اس غفلت کی سزا بھگت رہے ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ کہ اسلام تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے، ہمیں اس عذاب سے قطعاً نہیں بچا رہا، نہ ہی بچائے گا، جب تک ہم اس پر عمل کر کے خود اپنے آپ کو اس فوقیت کا مستحق نہ بنا لیں۔

آخر میں، میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس تقریر میں کہا ہے، اس سے نہ کسی اہلِ مذہب کی دل آزاری مقصود ہے اور نہ ہی ان کے بانیانِ مذاہب میں سے کسی کی (معاذ اللہ) تحقیر مطلوب۔ جہاں تک غیر مذاہب کے بانیوں کا تعلق ہے، قرآن کی رُو سے ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا کی تمام اقوام کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے۔ (۱۰/۴۷) ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کی صراحت قرآن نے کر دی ہے اور باقیوں کا نام لے کر ان کا ذکر نہیں کیا (۴/۱۶۴) لیکن کسی کا نام قرآن میں آیا ہے یا نہیں، ہم ان تمام فرستادگانِ خداوندی کا دلی ادب و احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی رسالت کا اقرار، ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ (۲/۲۸۵) قرآن کہتا یہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے تو خدا کی سچی تعلیم پیش ہوئی تھی لیکن بعد میں اس تعلیم میں کمی بیشی ہو گئی اور اب وہ اصلی اور حقیقی تعلیم قرآنِ کریم کے اندر ہے

جب ہم اس حقیقت کو پیش کریں گے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے، تو اس کی تعلیم کے سامنے لامحالہ دوسرے مذاہب کی وہ تعلیم لانی پڑے گی جو قرآن کے خلاف ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک سچی نہیں ہو سکتی۔
میں نے غیر مذاہب کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ صرف اس مقصد کے پیشِ نظر کہا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے کہ اسلام کسی کو بُرا کہہ کر اپنے آپ کو اچھا ثابت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ اپنی اچھائی کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا اور دلائل و براہین سے منواتا ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے کہ تم مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو۔ (۶/۱۰۹) وہ تمام دنیا کی واجب الاحترام ہستیوں کا احترام سکھاتا ہے۔ البتہ ان کی، یا ان کی طرف منسوب کردہ غلط تعلیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہی شعار ہمارا بھی ہونا چاہیئے۔

والسّلام

اِنسان

نومبر ۱۹۶۱ء

زمیں خاکِ درِ مے خانۂ ما — فلک یک گردشِ پیمانۂ ما
حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

خدا کی تمام مخلوق میں جس کا علم اس وقت تک انسان کو ہو سکا ہے، انسان کی تخلیق، ایک بنیادی لحاظ سے، دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) دیکھئے تو انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے لیکن جہاں باقی حیوانات کی یہ کیفیت ہے کہ ان کی زندگی، شروع سے آخر تک ایک ہی سطح پر رہتی ہے، انسانی زندگی کی دو الگ الگ سطحیں ہیں۔ مثلاً گھوڑے کا بچہ جن خصوصیات کو لے کر پیدا ہوگا، اس کی زندگی میں ان خصوصیات کی نشو و نما ہوتی جائے گی لیکن رہے گا وہ شروع سے آخر تک گھوڑا ہی، یعنی اس کی زندگی ایک ہی سطح پر رہے گی۔ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوگی لیکن انسان کی کیفیت یہ نہیں۔ اس کی ایک سطح حیوانی زندگی کی ہے اور دوسری سطح اس سے یکسر مختلف ہے۔

جہاں تک اس کی حیوانی سطح کی زندگی کا تعلق ہے، انسانی بچہ کی پیدائش بھی دیگر حیوانات کی طرح ہوتی ہے۔ اور یہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے، جن میں سے دیگر حیوانات گزرتے ہیں۔ قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ابتداءً صفحۂ ارض پر غیر ذی حیات مادہ (INORGANIC MATTER) تھا۔ پھر اس میں خدا نے زندگی کی نمود کی۔ وہ انسانی تخلیق کی داستان کی ابتداء اس مقام سے کرتا ہے جہاں کہتا ہے کہ

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔

زندگی کا سرچشمہ پانی ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۳۰/۲۱)

اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے بنایا۔

اس لئے انسانی تخلیق کا اگلا مرحلہ طینِ لازب (چپچپی مٹی) تھا، یعنی غیر ذی حیات مادہ (مٹی) اور سرچشمۂ زندگی (پانی) کے امتزاج سے زندگی (LIFE) کی ابتداء ہوئی۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ (۱۱/۳۷)

یقیناً ہم نے انھیں چپچپی مٹی سے پیدا کیا۔

اس سے زندگی کا جرثومۂ اوّلیں (FIRST LIFE CELL) وجود میں آیا جسے قرآن نے نفس واحدہ کہہ کر پکارا ہے (۱۸۹/۷) یعنی وہ خلیّہ (CELL) جس کے اندر نر اور مادہ، دونوں کے امکانی اجزاء موجود ہوتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۱۸۹/۷)

وہی ہے جس نے تمھیں نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔

یہاں سے کاروانِ حیات مختلف مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا گیا تا آنکہ وہ اس منزل میں جا پہنچا، جہاں پیدائش بذریعہ تولید و تناسل ہوتی ہے، یعنی نر کے مادۂ تولید کا، مادہ کے رحم میں استقرار۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ (۱۱/۳۵)

اور اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔

اس منزل میں ہر قسم کے حیوانات شامل ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ج وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ج وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ط يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (۴۵/۲۴)

اور اللہ نے ہر ایک ذی حیات کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر ان میں وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل رینگتے ہیں اور وہ ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور وہ بھی جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ یہ سب

خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق پیدا ہوتے ہیں۔ اس نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں، جن پر اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔

اس منزل میں رحمِ مادر میں انسانی بچہ بھی انہی مراحل میں سے گزرتا ہے، جن میں سے دیگر حیوانات کے بچے گزرتے ہیں۔ سورۃ المومنون میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ۔ پھر ہم نے اُسے ایک نطفہ بنایا جو (رحمِ مادر) میں ٹھہر جاتا اور اپنی جگہ قائم کر لیتا ہے۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔ پھر ہم نے اس نطفہ کو جونک جیسی شکل کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر اس لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا سا کر دیا۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ پیدا کیا۔ فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ منڈھ دی۔ (۱۴-۱۲/۲۳) یہ وہ مراحل ہیں، جن میں سے ہر حیوانی بچہ گزرتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ پیدائش کے بعد بھی زندگی کے جتنے طبعی مراحل (PHYSICAL STAGES) ہیں، ان میں بھی یہ سب برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ حج میں ان تمام مراحل کا ذکر کرنے کے بعد جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، فرمایا۔ ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ پھر ہم تمہیں طفولیت کی حالت (ایک بچّہ کی شکل میں) رحم سے باہر لے آتے ہیں۔ ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ۔ پھر تم اپنی جوانی کی حالت تک پہنچ جاتے ہو۔ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ (۲۲/۵) پھر تم میں سے کوئی ایسا ہوتا ہے، جو (بڑھاپے سے پہلے ہی) مر جاتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو بڑھاپے تک پہنچتا ہے ــــ ان مراحل سے بھی تمام حیوانات یکساں طور پر گزرتے ہیں۔

یہ انسان کی طبیعی زندگی ہے جو انہی طبیعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کے تابع گزرتی ہے، جن کے مطابق دیگر حیوانات جیتے اور مرتے ہیں۔ کھانا، پینا، سونا، جاگنا، افزائش نسل کرنا، بیمار ہونا اور مر جانا، حتیٰ کہ جس چیز کو حیوانات کی جبلّت (INSTINCT) کہا جاتا ہے، اس سطح پر انسان کے بھی کم و بیش وہی جذبات ہوتے ہیں۔ حیوانات کے جبلّی تقاضوں کی بنیادی طور پر تبویب کی جائے، تو وہ تین شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

(i) جذبۂ تحفّظِ خویش (SELF PRESERVATION)

(ii) جذبۂ تغلّب۔ (SELF AGGRESSION)

اور (iii) جذبۂ افزائشِ نسل۔ (SELF REPRODUCTION)

حیوانی سطحِ زندگی پر، انسان کے تمام کاروبار کے محرّکات بھی یہی جذبات ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ دیگر حیوانات ان حدود کو نہیں توڑتے جو ان کے لئے فطرت نے مقرر کر دیے ہیں لیکن انسان حدود شکنی بھی کرتا ہے اور اسی لئے اس کی طبیعی زندگی بھی بے حد تلخ اور سکون فراموش ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسان کے ان حیوانی جذبات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ حٰم سجدہ میں ہے کہ انسان کی مستقل خواہش یہ ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مال و دولت ملتا چلا جائے۔ اس میں وہ کسی حد پر رکتا ہی نہیں۔ (لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ـــــ ۴۱/۴۹) اس کا یہ جذبہ بڑا ہی شدید ہے۔ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰/۸) یقیناً وہ مال و دولت کو اپنی طرف کھینچنے میں بڑا ہی شدت پسند واقع ہے۔ وہ دولت کی محبت کو اپنی ضروریات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں دیوانہ ہو جاتا ہے اور چونکہ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوئی حد مقرر نہیں، اس لئے وہ مرتے دم تک اس دیوانگی میں مبتلا رہتا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲) ایک دوسرے سے بڑھ جانے کے جذبہ میں دنیا و مافیہا اور زندگی کے حقیقی مقصود سب سے غافل ہو جاتا ہے اور اس میں برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کسی مقام پر رکتا ہی نہیں۔ حتیٰ کہ یہ قبر تک جا پہنچتا ہے۔ اسی جذبہ کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اسے ذرا سی مصیبت یا تنگی پیش آئے تو سخت مایوس ہو جاتا ہے۔ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ۔ (۴۱/۴۹) اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ناامید اور مایوس ہو جاتا ہے۔ جہاں اس کے جذبۂ حصولِ مال و دولت کی کوئی انتہا نہیں، وہاں اس کی مایوسی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اس میں یہ خودکشی بھی کر لیتا ہے (حیوانات نہ اپنی ضروریات سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتے ہیں نہ ہی خودکشی کرتے ہیں) یہ بے حد بے صبرا واقع ہوا ہے اور اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹) اس کی حالت یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا۔ جب اُسے تکلیف پہنچتی ہے تو واویلا مچا دیتا ہے ـــ وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا (۷۰/۲۰-۲۱) اور جب اسے مال و دولت حاصل ہوتا ہے تو اسے روک کر بیٹھ جاتا ہے کسی کو نہیں دیتا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔ (۱۰۰/۶) یہ تنہا خور ہے اور اپنے نشو و نما دینے والے کے سامانِ رزق میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ بے حد تنگ دل ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ

وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۔ (۱۷/۱۰۰)

ان سے کہو کہ تمہاری حالت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس میرے رب کی رحمت کے خزانے بھی ہوتے، تو اس ڈر سے کہ وہ کہیں ختم نہ ہو جائیں تو تم انہیں روکے رکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی تنگ دل واقع ہوا ہے۔

تنگ دل بھی اور ناشکر گزار بھی۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) اس کے ساتھ ہی اتنا جلد باز کہ جذبات کی شدت میں بعض اوقات اپنے نفع و نقصان میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا۔ (۱۷/۱۱)

اور انسان بھلائی کو بلانے کی جگہ، بُرائی کو آوازیں دے کر بُلا لیتا ہے۔ یہ ہے ہی بڑا جلد باز اس شدتِ جذبات کا نتیجہ ہے کہ یہ بڑا کمزور واقع ہوا ہے۔ تھوڑی سی (TEMPTATION) کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جھٹ پھسل جاتا ہے۔ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ (۴/۲۸) انسان بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے، بہت جلد جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے ــــ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) اور انسان اکثر جھگڑا کرتا رہتا ہے۔ اپنے طبیعی تقاضوں کی تشکیل میں اس کی یہی حدود فراموشیاں ہیں، جس کی وجہ سے یہ "ظالم اور جاہل" قرار پاتا ہے ــ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ (۳۳/۷۲)

یہ تمام خصوصیات انسان کی حیوانی سطحِ زندگی کی ہیں۔ ذہنِ انسانی کی یہ بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے ان جذبات کو انسانی فطرت (HUMAN NATURE) قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ انسانی سطحِ زندگی (HUMAN LEVEL) اس سے یکسر الگ اور ممتاز ہے۔ یاد رکھئے! یہ انسان کے حیوانی جذبات ہیں۔ (جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ انسان کی نہ کوئی "فطرت" ہو سکتی ہے نہ "فطرت" ہے) ان حیوانی جذبات کو بے باک چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے کہ ــــ انسان، نوعِ انسان کا شکاری ہے۔ ایک فرد، دوسرے فرد کا دشمن اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲/۳۶) اور اس کا نتیجہ

يُفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰)

خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں۔

حیوانی سطحِ زندگی پر اس کے سوا کوئی اور نتیجہ ہو نہیں سکتا۔ زندگی "جنگل کے قانون" کے تابع رہتی ہے۔

جس میں ہر طاقتور اپنے سے کمزور کا خون پیتا ہے اور ہر تیز پنجے والا ضعیف کا گوشت نوچتا ہے۔ اس سطح پر انسان، انسان نہیں، بلکہ حیوان ہوتا ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر ان سے بھی گیا گزرا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ (۷/۱۷۹)

اگر انسان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کی زندگی بس یہی حیوانی سطح کی زندگی ہے، تو قرآنِ کریم اس تصورِ حیات کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا نتیجہ جہنم بتاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)

اور جو لوگ کافر ہیں، وہ سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھا پی کر (مر جاتے ہیں) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

جہنم اس لئے کہ اس نظریۂ زندگی کے ماتحت، ہر فرد (اور ہر قوم) اپنے طبعی جذبات کی تسکین اور حیوانی مطالبوں کے حصول کو منتہائے حیات سمجھتا ہے اور ان کے باہمی مفاد کے تصادم سے یہ دنیا جہنم میں بدل جاتی ہے۔ ان کے سامنے، اس سے بلند کوئی مقصدِ حیات نہیں ہوتا — اور حقیقت یہ ہے کہ جب انسانی زندگی کو بس یہی طبعی زندگی سمجھ لیا جائے تو اس سے بلند مقصدِ حیات کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہی ہیں وہ جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ — اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا، جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود و مقصود بنا لیا؟ جذبات کو معبود بنا لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم و عقل کے باوجود، علم و عقل سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اس کے جذبات اس کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اس کی عقل و خرد پر پردے ڈال دیتے ہیں۔

وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و عقل کے باوجود وہ صحیح راستے پر نہیں آ سکتا۔ اس کی سننے، سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ جب جذبات غالب آ جائیں، تو عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ سو جب وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو صحیح راستے پر کیسے چل سکتے ہیں۔ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (۴۵/۲۳) — سو قانونِ خداوندی کے علاوہ کون سی چیز صحیح راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے۔ کیا یہ اتنی سی بات پر بھی غور

نہیں کر سکتے؟

یہ کون لوگ ہیں؟ وہ لوگ وَقَالُوْا مَاهِيَ اِلَّاحَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی، بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں ہم زندہ رہتے ہیں، اسی میں مرجائیں گے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، انسانی قویٰ مضمحل ہوتے جاتے ہیں اور اس طرح انسان رفتہ رفتہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اس کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ سوجب زندگی انسانی جسم کی طبیعی مشینری کے چلتے رہنے تک ہے، تو پھر انسان کے طبیعی تقاضوں کی تسکین کے علاوہ مقصودِ حیات کیا ہوسکتا ہے؟

لیکن قرآن کہتا ہے کہ وَمَالَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ـ (۴۵/۲۴) ان کا یہ خیال علم وحقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لیتے ہیں۔

آیئے اب دیکھیں کہ علم وحقیقت کی رُو سے بات کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے، قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ انسانی بچہ (جنین) بھی رحمِ مادر میں انہی طبیعی مراحل سے گزرتا ہے، جس سے تمام حیوانی بچے گزرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے بعد قرآن نے ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا ہے، جو صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس میں دوسرے حیوان شریک نہیں۔ سورۃ سجدہ میں ان طبیعی مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ۔ پھر خدا نے اسے سنوارا۔ اسے ٹھیک اعتدال پر لایا اور اس میں اپنی "روح" پھونک دی۔ "روح" کے معنی توانائی (ENERGY) کے ہیں۔ اس کی ماہیت کیا ہے، اسے ہم نہیں جان سکتے۔ البتہ اس کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق قرآنِ کریم نے بتایا کہ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۳۲/۹) اس نے تمھارے لئے "سمع وبصر وفواد" بنائے۔ "سمع وبصر" سے عام مفہوم "ذرائع علم" ہے اور فؤاد کا تعلق احساسات وجذبات سے ہے لیکن قرآنِ کریم نے "سمع وبصر" کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس سے اس کی مراد انسان کا اختیار وارادہ ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ـ ہم نے انسان کو ایسے نطفہ سے پیدا کیا جو مخلوط ممکنات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان ممکنات کی رفتہ رفتہ نمود ہوتی جاتی ہے، تاآنکہ وہ "سننے دیکھنے والا" بن جاتا ہے۔ اس کے بعد ہے اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا

كَفُوْرًا۔ (۷۶/۲-۳) ہم اسے راستہ دکھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ چیز اس کے اختیار میں ہے کہ اسے قبول کرے یا اس سے انکار کردے۔ اس سے ظاہر ہے کہ "روحِ خداوندی" (DIVINE ENERGY) جو بالخصوص انسان کو عطا ہوئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہوگیا ہے۔ یہ خصوصیّت نہ حیوانات کو حاصل ہے نہ کائناتی قوّتوں کو۔ اسی خصوصیّت کی بناء پر یہ مسجودِ ملائکہ قرار پایا ہے۔ سورۂ ص میں ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۔ (۳۸/۷۱ - ۷۲)

جب تیرے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی (غیر ذی حیات عنصر) سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، سو جب میں اسے سنوار کر تکمیل تک پہنچا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے سامنے اطاعت پذیری کے طور پر جھک جانا۔

آپ داستانِ آدم میں دیکھئے۔ ملائکہ کے متعلق تو کہا کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ انھیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (۱۶/۴۹ - ۵۰) وہ اس سے کبھی سرتابی نہیں اختیار کرتے۔ (یہ چیز صرف ملائکہ ہی کے متعلق نہیں کہی۔ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ سب کے متعلق کہا ہے۔ یعنی تمام کائناتی اشیاء اور ذی حیات کے متعلق) لیکن جب "آدم" سے کہا گیا کہ "تم اس شجر کے قریب نہ جانا" تو اس نے اس حکم کی نافرمانی کی، یعنی آدم فرماں پذیری پر مجبور نہیں۔ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی برتے۔

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ (۱۸/۲۹) ان سے کہہ دو کہ حق تمھارے پروردگار کی طرف سے آگیا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اس پر ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کردے۔ دیگر مخلوق مشیّت کے پروگرام پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے لیکن انسان سے کہا گیا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) تم جو چاہو کرو۔ تمھیں اس کی آزادی حاصل ہے۔ جیسا تم کروگے، اس کے مطابق تمہیں نتیجہ مل جائے گا۔

حیوانات کی مجبوری کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کچھ کسی حیوان کو بننا ہوتا ہے، وہ پہلے دن سے بن چکا ہوتا ہے۔ (اس کی تشریح پہلے کی جاچکی ہے) لیکن انسان کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ یہ بنا بنایا پیدا نہیں کیا جاتا۔ یہ

اس پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اسے جو کچھ بننا ہے، خود بنے۔ خالقِ فطرت نے اس کی لوحِ تقدیر کو خالی رکھا ہے اور قلم اس کے اپنے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ یہ اس لوح پر جو کچھ لکھنا چاہے خود لکھ لے۔ یہ وہی کچھ بن جائے گا جو کچھ یہ کرے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حیوانی سطحِ زندگی پر انسان کے جبلّی تقاضے تو ہیں لیکن انسانی سطح پر اس کی کوئی فطرت (NATURE) نہیں۔ فطرت ان بنیادی خصوصیات (CHARACTERISTICS) کو کہتے ہیں جو نہ کسی کی اپنی بنائی ہوئی ہوں اور نہ وہ ان کے بدلنے پر قادر ہو۔ فطرت، اشیائے کائنات کی ہوتی ہے، حیوانات کی ہوتی ہے۔ انسان چونکہ مجبور نہیں، اس لئے اس کی فطرت کوئی نہیں۔ اس کے اندر کچھ صلاحیتیں ہیں، کچھ ممکنات (POSSIBILITIES) ہیں۔ یہ ان صلاحیتوں کو جس انداز سے استعمال کرے گا، وہی کچھ بن جائے گا۔ بلندی کی طرف جانا چاہے تو یہ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ (۹۵/۴) کا مظہر ہوگا، پستی کی طرف جائے گا تو اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ؀ (۹۵/۵) کی سطح تک پہنچ جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ یہ "بلندی" اور "پستی" کیا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ زندگی جب حیوانی سطح سے اوپر اُبھرتی ہے تو اس میں اختیار و ارادہ کی خصوصیت نمودار ہو جاتی ہے لیکن اختیار و ارادہ نہ اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے، نہ بجائے خویش مقصود بالذّات ہے۔ جسے قرآن نے رُوحِ خداوندی کہہ کر پکارا ہے، اسے نفسِ انسانی (HUMAN PERSONALITY) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اختیار و ارادہ درحقیقت نفسِ انسانی کی بنیادی خصوصیت ہے اور مقصودِ حیات، نفسِ انسانی (انسانی ذات) کی نشوونما ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ۔ (۹۱/۹-۱۰) جس نے اُسے نشوونما دے لی، وہ کامیاب ہوگیا۔ جس نے اسے دبا دیا، وہ تباہ ہوگیا۔ جس طرح حیوانی زندگی کے تقاضے ہیں، جن کے پورا کرنے سے انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما ہوتی ہے، اسی طرح اس کی انسانی زندگی کے بھی تقاضے ہیں، جن کی تسکین سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس کی ذات کے تقاضے وہ ہیں، جن میں حیوان شریک ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً تحفّظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) کے سلسلے میں جسم کی پرورش، حیوانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے۔ اس میں حیوان اور انسان (کی حیوانی سطحِ زندگی) دونوں برابر کے شریک ہیں۔ حتیٰ کہ بچوں کی پرورش کا جذبہ بھی دونوں میں مشترک ہوتا ہے لیکن دوسروں کی پرورش کا تقاضا حیوانات میں نہیں ہوتا۔ یہ انسانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہے۔ ایک بیل مزے سے

؀ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ ۔

چارہ کھا رہا ہے۔ اگر اس کے پاس دوسرا بیل بندھا ہے جو چار روز کا بھوکا ہے، تو اُس بیل کو اِس کی بھوک کا خیال تک نہیں آئے گا۔ وہ اگر اس کے چارہ کی طرف مُنہ کر لے گا تو یہ اسے مارنے کے لئے آگے بڑھے گا۔ اگر ایک انسان بھی دوسرے انسان کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے تو وہ حیوانی سطح کی زندگی پر ہے بلکہ اس باب میں انسان حیوان سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ بیل کا جب پیٹ بھر جائے تو اسے اس کی فکر نہیں ہوتی کہ اس کا باقیماندہ چارہ کون کھا جاتا ہے لیکن انسان ہے کہ اپنی ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی فاضلہ سامانِ زیست کے پاس تک کسی کو پھٹکنے نہیں دیتا ـــــ لیکن اس کی انسانی سطح کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی پرورش کا نہ صرف خیال کرے بلکہ اس کا انتظام کرے۔ اس تقاضے کے پورا کرنے سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور انسانی ذات کا خاتمہ جسم کی موت کے ساتھ نہیں ہو جاتا۔ یہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ اسی کو بلندی کی طرف جانا کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ـــــ (۸۴/۱۹) انسان منزل بہ منزل اوپر کو چڑھتا جاتے گا تو اس سے یہی مقصود ہے۔ اس کی حیوانی سطحِ زندگی کی انتہا تو یہ ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) یعنی اس طبیعی کائنات میں جو کچھ ہے اسے اس کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اشیائے فطرت اور کائناتی قوتوں کی تسخیر انسان کی حیوانی سطحِ زندگی کا منتہا ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کے متعلق کہا کہ یہ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے بھی آگے جا سکتا ہے۔ (۵۵/۳۳) یہی وہ مقام ہے جسے جنّتِ اُخروی کہا جاتا ہے لیکن جنّت بھی اس کے ارتقائی سفر کا آخری مقام نہیں۔ وہ بھی اس کی رہ گذر ہی ہے۔ اسے اس سے بھی آگے جانا ہے، اس لئے کہ اہلِ جنّت کے متعلق کہا گیا ہے کہ

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا (۶۶/۸)

ان کا نُور ان کے آگے آگے اور دائیں چلتا ہوگا اور ان کی دُعا یہ ہوگی کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے تو ہمارے نُور کو تکمیل تک پہنچا دے اور ہر قسم کے خطرات سے ہماری حفاظت کر۔

وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۲۲/۲۴) ان کی راہ نمائی قابلِ تعریف راستے کی طرف کی جائے گی۔

جس معاشرہ میں حیوانی سطحِ زندگی کے تقاضوں کو مقصودِ حیات سمجھ لیا جائے اور انسانیت کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے، وہ معاشرہ جہنمی ہوتا ہے لیکن جس معاشرہ میں حیوانی سطح کے تقاضوں کی تسکین کے ساتھ ساتھ انسانیت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جاتے اور جب ان دونوں کا تصادم ہو تو انسانی تقاضوں کو ترجیح

دی جاتے اسے "اسلامی معاشرہ" کہا جاتا ہے اور وہ نوعِ انسان کے لئے جنّتی زندگی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ انسانی ذات کی نشو و نما اسی قسم کے معاشرہ میں ہو سکتی ہے۔

اس معاشرہ میں ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) اس لئے کہ تکریمِ انسانیت اس "روحِ خداوندی" کی وجہ سے ہے جو انسان کی بنیادی خصوصیت ہے اور جو، ہر انسانی بچّے کو یکساں طور پر عطا ہوتی ہے۔ اس میں انسانی زندگی ــــ خواہ وہ (عام معیاروں کے مطابق) ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کی بھی کیوں نہ ہو ــــ بڑی گراں بہا تسلیم کی جاتی ہے اور ایک جان کی قیمت پوری نوعِ انسان کے برابر قرار دی جاتی ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵/۳۲)

جو کوئی کسی انسانی جان کو بغیر جان کے بدلے کے یا فساد فی الارض کے، ناحق مار دے تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کو مار دیا اور جس نے کسی ایک جان کو زندہ رکھا، تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو زندگی عطا کر دی۔

اس معاشرہ کے پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان تفریقات کو مٹا کر جنھوں نے انسانوں کو الگ الگ گروہوں، پارٹیوں اور قوموں میں تقسیم کر کے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں، تمام نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا دیا جاتے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اسی نظریۂ زندگی، اسی نظامِ حیات، اسی معاشرہ، اسی جماعت کو بقا اور حیاتِ جاوید مل سکتی ہے، جس کے پیشِ نظر، کسی خاص جماعت، گروہ، پارٹی، ملک یا قوم کا مفاد نہیں، بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

جو چیز تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو، اسے ہی زمین میں بقا نصیب ہوتی ہے۔

وہ انسانوں کے بعض طبقوں کو پست اور کمزور رکھ کر دوسرے طبقوں کو بلند اور طاقتور نہیں بنانا چاہتا۔ وہ پوری کی پوری انسانیت کو جسدِ واحد (ایک جسم یا ایک فرد) تصوّر کرتا ہے کہ اگر کمزور رہے تو پورے کا پورا فرد کمزور رہے اور اگر طاقتور رہے تو پورے کا پورا فرد طاقتور رہے۔

—— مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱/۲۸) تمہارا پیدا کرنا اور اٹھانا نفسِ واحدہ کی طرح ہے۔ اس کا مقصود و منتہٰی ارتقائے انسانیت ہے نہ کہ کسی خاص گروہ یا طبقہ کی ترقی اور باقیوں کی پستی۔ بَعْثٌ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو موانع کسی کے راستے میں حائل ہوں، انہیں دور کر دینا تاکہ وہ اپنی نقل و حرکت کے لئے آزاد ہو جائے۔ اس کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ قرآنِ کریم ان تمام موانع کو دُور کر دینا چاہتا ہے، جو نوعِ انسان کی ترقی کے راستے میں حائل ہوں — کسی ایک قوم یا ملک کی ترقی کے راستے میں نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ترقی کے راستے میں نبیٔ اکرمؐ کا مقدس مشن ہی یہ بتایا گیا ہے کہ "وہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا، جس میں نوعِ انسان جکڑے ہوتے چلی آ رہی تھی اور ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا، جن کے نیچے انسانیت دب رہی تھی۔" وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷)

یہ ہے وہ انسان جسے اکثر مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی ہے۔

وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (۱۷/۷۰)

اور ہم نے انسانوں کو بہت سی مخلوق پر فضیلت دی ہے۔

"بہت سی مخلوق" (اکثر مخلوق) اس لئے کہ، مخلوق صرف اسی کرۂ ارضی پر نہیں۔ کائنات میں نہ معلوم کہاں کہاں اور مخلوق ہے اور وہ کس قسم کی ہے۔ ارض کے علاوہ "سمٰوات" میں ذی حیات مخلوق کی شہادت تو خود قرآن کریم میں موجود ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِن دَابَّةٍ۔ (۴۲/۲۹)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین اور سمٰوات میں ذی حیات مخلوق پھیلا رکھی ہے۔

اس مخلوق کا تو علم نہیں، لیکن اس ارض پر مسجودِ ملائکہ "آدم" ہی ہے۔ یہاں انسان سے افضل کوئی مخلوق نہیں لیکن اسی انسان سے جو انسانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہو، حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والوں کے متعلق تو کہا گیا ہے، کہ وہ حیوانات سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ (۷/۱۷۹)

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ زندگی کو محض حیوانی یا طبیعی زندگی سمجھنا قرآنِ کریم کی رُو سے کفر ہے۔ اس لئے ایمان

کا تقاضا یہ ہے کہ انسانی زندگی کو، حیوانی سطح سے بلند، انسانی سطح پر سمجھا جائے، یعنی انسان کو محض آب و گل کا طبیعی پیکر نہ سمجھا جائے جو جسم کے مادی عناصر کے انتشار (DISINTEGRATION) سے ختم ہو جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان رکھا جائے کہ انسان طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی رکھتا ہے، جسے انسانی ذات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے یہ اپنے تمام اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے اور ان کے نتائج کا حامل اور اسی سے انسانی حیات کا سلسلہ موت کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔ اس تصورِ زندگی سے انکار، قرآن کی رُو سے کفر ہے، یعنی انسان کا خود اپنی ذات سے انکار کفر ہے۔

دینِ خداوندی کے دُشمن

جنوری سنہ ۱۹۶۲ء

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی!

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے کھلے الفاظ میں کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ (۶۰/۱) اے جماعتِ مومنین! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو کبھی اپنا دوست نہ بنانا. اپنے دشمن کو ہر شخص جانتا ہے (یا جان سکتا ہے) اور کوئی صاحبِ ہوش، دشمن کو دوست نہیں رکھتا لیکن یہاں خدا نے ایسے دشمن کا ذکر کیا ہے جو خدا اور جماعتِ مومنین کا مشترکہ دشمن ہے. سوال یہ ہے کہ خدا اور جماعتِ مومنین کا مشترکہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ جو دینِ خداوندی کا مخالف ہے وہی خدا اور جماعتِ مومنین کا دشمن ہے. اس لئے کہ مومن کی ہستی ہی دین کے ساتھ ہے. اس کے دین کو فروغ اور اقتدار حاصل ہے تو مومن بھی صاحبِ عزّت و توقیر ہے. اگر اس کے دین کا غلبہ نہیں، تو مومن کی بھی دنیا میں کوئی عزّت نہیں. دینِ خداوندی کے مخالفین کی فہرست تو لمبی چوڑی ہو سکتی ہے لیکن اصل کے اعتبار سے قرآن نے انہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا تذکرہ ایسی شرح و بسط سے کیا ہے کہ ان کے پہچاننے میں کسی کو دشواری نہ ہو. یہ دینِ خداوندی کے وہ مخالف ہیں جن کا تعلق نہ کسی خاص مقام سے ہے نہ زمان سے. دنیا میں جب اور جہاں بھی خدا کے دین کی آواز بلند ہوتی، یہ گروہ فوراً مخالفت کے لئے میدان میں اُتر آتے. اس سے یہ

بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کی فروعات کتنی ہی کیوں نہ بدلتی رہی ہوں، اصل کے اعتبار سے دین شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا ہے اور اس کی زد ان دونوں گروہوں پر ہمیشہ پڑتی رہی ہے جبھی تو ان گروہوں کی طرف سے ہر جگہ اور ہر زمانے میں اس کی مخالفت ہوتی رہی ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ یہ گروہ کون سے ہیں۔

گروہِ اوّل

قرآنِ کریم نے دین کے تذکرہ کی ابتداء حضرت نوحؑ سے کی ہے۔ سورۃ اعراف میں ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ (۷/۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف (حق کا پیغام دے کر) بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ (تمہاری موجودہ روش سے) ایک بڑا ہی ہولناک عذاب تم پر مسلط نہ ہو جائے

دعوتِ حضرت نوحؑ

یہ تھی حضرت نوحؑ کی دعوت، یعنی حکومت و اقتدار صرف خدا کا ہے۔ اس کے سوا تم کسی اور کی محکومی اختیار نہ کرو۔ یہ دعوت صاف اور واضح ہے۔ اب دیکھئے کہ اس دعوت کی مخالفت کس گروہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے۔ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۷/۶۰) اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ اس کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم کھلی ہوئی گمراہی میں پڑ گئے ہو۔" قرآن کریم نے اس کے لئے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ اَلْمَلَاُ ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں وہ لوگ جن کے گھر بھرے ہوں، جن کی کوٹھیاں اناج سے بھری ہوں، جن کے خزانے دولت سے بھرے ہوں، جن کے برتن سامانِ خورد و نوش سے لبریز ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو قوم کے سردار کہلاتے ہیں۔ یہی ان کے اکابر اور سربراہ ہوتے ہیں۔ انہی کی رائے رائے کہلاتی ہے اور ان کی عقل عقل۔ جس کے گھر کھانے کو نہ ہو، جس کے برتن خالی ہوں، وہ لاکھ سمجھ کی بات کرے، کوئی اُسے درخورِ اعتنا

سرمایہ داروں کا طبقہ

نہیں سمجھتا۔ پنجابی زبان میں ایک مثل ہے کہ " جس دی کوٹھی وچ دانے اُس دے کملے وی سیانے" جس کے گھر کھانے کو ہو، اس کے پاگل بھی عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا قرآن نے کہا یہ ہے کہ حضرت نوحؑ کی دعوت کی مخالفت، قوم کے دولت مند طبقے

کی طرف سے ہوئی جن کے ہاتھوں میں اقتدار تھا۔ دوسری جگہ ان کے متعلق یہ کہہ کر بات واضح کر دی ــــ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۲۳/۳۳) یعنی یہ وہ طبقہ تھا جسے دنیا میں آسودگی اور خوشحالی حاصل تھی جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے تھے۔ یہ تھا وہ گروہ جس نے سب سے پہلے مخالفت کی آواز بلند کی۔ ظاہر ہے کہ یہ آسمانی دعوت ایسی تھی، جس کی زد براہِ راست سرمایہ دار طبقہ پر پڑتی تھی۔ یہ محض "پوجا پاٹ" کا سوال نہیں تھا۔ یہ دعوت ایک ایسے انقلاب کی پیغامبر تھی جس سے دولت مند طبقہ کو اپنے مفاد خطرے میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ اسی لئے اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے کیونکہ اس کی کامیابی میں انہیں اپنی موت دکھائی دیتی تھی۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ دولت مند طبقہ ہمیشہ اس زعم میں رہتا ہے کہ دنیا بھر کی عقل و فکر کے واحد مالک اور سمجھ بوجھ کے اجارہ دار وہی ہیں۔ غریب کو نہ عقل ہوتی ہے نہ تمیز۔ نہ اس کی کوئی بات ایسی ہوتی ہے جس پر کان دھرا جائے اور نہ کوئی فیصلہ ایسا جسے توجہ کے قابل سمجھا جائے۔ اس کی مفلسی اسے بے وقوف اور بے سمجھ، اور اس کی غریبی اسے پست اور ذلیل بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ یہی تھی وہ ذہنیت جس کا مظاہرہ قومِ نوحؑ کے سربراہوں کی طرف

غریبوں کی طرف سے لبیک

سے ہوا۔ جب انہوں نے کہا کہ مَانَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَانَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ج انھوں نے حضرت نوحؑ سے کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ تم ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں ان کی تو شکلیں دیکھ کر بتا دیا جا سکتا ہے کہ وہ ہم میں کمینے ہیں۔ وہ داجبی عقل کے مالک ہیں۔ یوں ہی بلا سمجھے بوجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ذلیل اور سطحی سمجھ بوجھ کے لوگوں کی ایک جماعت ہے جو تمہارے ساتھ ہو گئی ہے۔ وَمَانَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ (۱۱/۲۷) ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے، نہ تم میں کوئی صاحبِ دولت و ثروت، نہ عقل و فکر کا مالک، نہ معاشرہ میں اس کی اونچی پوزیشن۔ تمہارا دعویٰ کس طرح سچا ہو سکتا ہے؟ دعوے اس کا سچا ہو سکتا ہے جس کی تائید سوسائٹی کا اوپر کا طبقہ کرے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو۔

آپ نے غور کیا کہ ان لوگوں کے نزدیک، حق و باطل، صدق و کذب اور عزت و ذلّت کا معیار کیا ہوتا ہے؟ فقط دولت اور اس کے زور پر حاصل کردہ اقتدار۔ آسمانی دعوت اس معیار کو بدلنے کے لئے آتی ہے اور اسی لئے اس طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا (۱۱/۸۲) جو طبقہ اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق بلندیوں پر ہوتا ہے، وہ پستیوں میں آ گرتا ہے۔ یہی خطرہ اس

کی مخالفت کا محرک ہوتا ہے۔

حضرت ہودؑ کی دعوت

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ تشریف لائے اور انہوں نے اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت نوحؑ نے دی تھی، یعنی (یٰقَوْمِ) اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۲۳/۲۲) "اے میری قوم تم اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے سوا تمھارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا ردِّ عمل؟ وہی جو پہلے ہوا تھا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ۙ (۲۳/۳۳)

اسکی قوم کے سرداروں نے، جنھوں نے سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی اور آخرت کے پیش آنے کے منکر تھے اور جنھیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی اور خوشحالی عطا کر رکھی تھی، (لوگوں سے) کہا کہ " اس شخص کی اس سے زیادہ کیا حیثیت ہے کہ تمھارے جیسا عام آدمی ہے جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے۔ جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے۔

اس کے بعد ان سے کہا کہ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت قبول کرلی تو بس سمجھ لو کہ تم تباہ ہوتے (۲۳/۳۴) دوسری جگہ ہے کہ ان سردارانِ قوم نے کہا کہ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ (۷/۶۶) ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو۔

سوال یہ ہے کہ اس قوم کی وہ کون سی غلط روش تھی جس سے باز رہنے کی انہیں دعوت دی جارہی تھی؟ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ انھیں بڑی وسعت اور توانائی حاصل تھی۔ (وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً (۷/۶۹)

قوم کی حالت

ان کا قبیلہ بہت بڑا تھا اور مال مویشی بھی بکثرت ملے تھے۔ نیز سرسبز شاداب باغ اور جاری چشمے۔ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ (۲۶/۱۳۳-۱۳۴) وہ ایسے رفیع الشان محلات اور محکم قلعے تعمیر کرتے تھے گویا انہیں یہاں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ (وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶/۱۲۹) انھیں اس قدر قوت وسطوت حاصل تھی جو کسی اور کو حاصل نہیں تھی (وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ (۴۶/۲۶) انہیں اس قدر قوت حاصل تھی لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس قوت کو حق وانصاف اور انسانیت کی فلاح وبہبود

کے کاموں میں صرف کرتے، وہ بے حد سرکش اور متکبّر ہو گئے۔ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۔ (۴۱/۱۵) قوّت کے نشہ میں ان کی بدمستی کی حالت یہ تھی کہ جس کمزور پر ہاتھ ڈالتے، اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتے۔ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۚ (۲۶/۱۳۰) یہ تھی وہ قوم جو دعوتِ خداوندی کی دشمن تھی اور جس کے اکابرین نے اس دعوت کی مخالفت کی۔ اس کا انجام کیا ہوا، اس کے متعلق قرآنِ کریم نے چار لفظوں میں پوری داستان بیان کر دی۔ جب کہا کہ وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ (۷/۷۲) اور جنھوں نے ہمارے قوانین کی تکذیب کی تھی، ہم نے ان کی جڑ بنیاد تک اکھیڑ دی۔ وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے۔

دعوتِ حضرت صالحؑ

قومِ عادؑ کے بعد، قومِ ثمودؑ کا تذکرہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ قوم بھی بڑی سطوت و ثروت کی مالک تھی۔ پُر فضا باغات، شیریں چشمے، لہلہاتی کھیتیاں، پھل دار درخت (فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۙ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۚ (۲۶/۱۴۷، ۱۴۸) وہ میدانوں میں محلّات اور پہاڑوں میں قلعے بناتے (تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا (۷/۷۴) جب انسان کو اس قدر فراواں قوّت اور دولت میسّر ہو اور اسے استعمال وہ اپنی مرضی کے مطابق کرے تو اس کا نتیجہ فساد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس قوم کے نمائندگان کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ کریم کہتا ہے۔

> وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸)
>
> اور شہر میں نو (سربرآوردہ اکابرین) تھے جو ہمیشہ ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور اصلاح کی طرف توجّہ ہی نہیں دیتے تھے۔

اس قوم کی طرف حضرت صالحؑ مبعوث ہوئے جنھوں نے آ کر وہی پیغام دیا جو اس سے پہلے حضرات انبیاء کرامؑ دیتے چلے آرہے تھے۔ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۷/۷۳) اس نے کہا کہ اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمھارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس پیغام پر لبّیک کن لوگوں نے کہا اور اس کی مخالفت کن لوگوں کی طرف سے ہوئی، اسے قرآنِ کریم کے الفاظ میں سنئے۔

دولت مند طبقہ کی مخالفت

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ (۷/۷۵) قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو اپنی دولت اور قوّت کا گھمنڈ تھا، انھوں نے مومنوں سے کہا، یعنی ان لوگوں سے جنھیں ان

کی چیرہ دستیوں نے کمزور کر رکھا تھا۔" آپ نے غور کیا کہ اس دعوتِ خداوندی کو ماننے والا غریبوں اور کمزوروں کا طبقہ تھا اور اس کی مخالفت اربابِ دولت و اقتدار کی طرف سے ہوئی تھی۔ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۷/۷۶) ان سرکش اور متکبرین نے کہا کہ تم جس بات پر ایمان رکھتے ہو، ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

ان کی غلط روش

یہ دعوت کیا تھی اور اس کی مخالفت کس بنا پر تھی؟ اس زمانے میں مال مویشی سب سے بڑی دولت تھے۔ اس لئے چراگاہوں اور چشموں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ قوم کا دولت مند اور صاحبِ اقتدار طبقہ، ان ذرائع رزق پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا اور غریبوں اور کمزوروں پر ان کے راستے بند کر دیتا تھا۔ یہی کچھ قوم ثمود کے اکابرین نے کر رکھا تھا۔ وہ غریبوں کے جانوروں کو خدا کے عطا کردہ چشموں سے پانی تک نہیں پینے دیتے تھے۔ یہ تھی ان کی مفسدانہ روش جس کے خلاف حضرت صالحؑ نے آواز اٹھائی تھی۔ اس کے جواب میں پہلے تو ان سردارانِ قوم نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت صالحؑ اور ان کے متبعین کو ختم ہی کر دیا جائے۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (۲۷/۴۹)

"انھوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسم کھاؤ کہ ہم رات کو (حضرت صالحؑ) اور اس کے ساتھیوں پر یکبارگی حملہ کر کے (انہیں قتل کر دیں گے) اور پھر (جب پوچھ گچھ ہوگی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت موجود ہی نہیں تھے۔ اور ہم اپنے اس بیان میں بالکل سچے ہیں۔"

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور انہیں حضرت صالحؑ کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔ سمجھوتے کی شرط یہ تھی کہ وہ غریبوں کے جانوروں کو خدا کی زمین میں آزاد چرنے دیں اور چشموں سے ان کی باری پر انہیں پانی پینے دیں۔ (۷/۷۳، ۲۶/۱۵۵) حضرت صالحؑ نے ان سے کہا کہ تمہارے اس قول و اقرار کے عملی ثبوت کے لئے میں

نَاقَةُ اللّٰهِ

ایک اونٹنی چھوڑتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔ ان لوگوں نے کرنے کو تو یہ اقرار کر لیا لیکن سرمایہ دارانہ ذہنیت اسے کب گوارا کر سکتی تھی کہ جن رزق کے سرچشموں کو وہ اپنی واحد ملکیت سمجھتے تھے۔ ان میں غریب بھی برابر کے حصے دار

ہوجائیں اور اس طرح ان کی غلامی سے مکمل کر آزاد انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگ جائیں۔ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (۷/۷۷) انھوں نے اس اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ فَاَخَذَتْهُمْ صَاعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (۴۱/۱۷) ذلت اور رسوائی کے عذاب کی ایک کڑک نے انھیں آ پکڑا اور یہ سب کچھ ان کے ان جرائم کی وجہ سے ہوا، جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا (۲۷/۵۲) سو، دیکھو یہ ہیں ان کے محلات جو ان کے ظلم کی وجہ سے اس طرح ویران پڑے ہیں۔ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا (۱۱/۶۸) گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ (۲۷/۵۲) ہم نے یہ داستان محض ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نہیں دہرائی۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو حقیقت کا علم رکھتے ہیں عبرت و موعظت کی بڑی نشانی ہے۔

قومِ شعیبؑ

قومِ ثمودؓ کے بعد ہمارے سامنے قومِ (حضرت) شعیبؑ آتی ہے جو مدین کے علاقہ میں رہتی تھی۔ انھیں بھی حضرت شعیبؑ نے وہی دعوت دی جو اس سے پہلے انبیاء کرامؑ اپنی اپنی قوم کو دیتے چلے آرہے تھے۔ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۷/۸۵) اس نے کہا کہ اے میری قوم! تم خدا کی محکومی اختیار کرو، اس کے سوا تمھارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ قوم کیا کرتی تھی جس سے روکنے کے لئے انہیں خدا کی محکومیّت اختیار کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ قرآن کریم نے اسے خود واضح کر دیا ہے۔ جب کہا کہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا کہ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۷/۸۵) ناپ تول پورا رکھو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں پوری پوری دو۔ ملک میں ہمواریاں ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ آپ نے دیکھا کہ ان کی کون سی غلط روش ہے، جس سے انھیں باز رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ وہی روش جو نظامِ سرمایہ داری کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد اس (باطل) اصول پر ہے کہ جب دوسروں سے چیز لو تو جو کچھ واجب ہو، اس سے زیادہ لو اور جب انہیں دو تو جو کچھ واجب ہے اس سے کم دو۔ یعنی لیتے اور دیتے وقت، ماپ اور تول کے پیمانے مختلف رکھو۔ کسی کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہ دو۔ یہ تھی ان کی روش، جس کے متعلق حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا تھا کہ اَلَا تَتَّقُوْنَ (۲۶/۱۷۷) کیا تم اس روش کے تباہ کن نتائج سے نہیں ڈرتے۔؟

اس کے جواب میں انھوں نے حضرت شعیبؑ سے کہا کہ ہم نے مذہب کے متعلق اتنا ہی سُنا تھا کہ اس کا تعلق پوجا پاٹ اور بندگی اور پرستش سے ہے۔ کسی نے دیوتاؤں کی پوجا کرلی، کسی نے بتوں کی۔ کوئی آگے بڑھا تو اس نے خدا کی پرستش کی دعوت دے دی لیکن یہ تمھارا "مذہب" عجیب ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم اپنے مال و دولت میں بھی اپنا اختیار و ارادہ نہ برتیں، اسے قوانین خداوندی کے تابع رکھیں۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ (۱۱/۸۷) انھوں نے کہا کہ اے شعیبؑ کیا تیری صلوٰۃ تمہیں اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ جن کی عبادت ہمارے بڑے کرتے چلے آئے ہیں ہم انکی عبادت نہ کریں یا یہ کہ ہم اپنے مال و دولت میں بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرّف نہ کریں (اور اسے محتاجوں اور ضرورت مندوں کے لئے کھلا رکھیں) بس تم ہی ایک غریبوں کے ہمدرد، نرم دل اور راست باز انسان رہ گئے ہو؟

یہ عجیب صلوٰۃ ہے

لیکن جب حضرت شعیبؑ اپنی دعوت پر اصرار کرتے چلے گئے تو قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا۔ (۷/۸۸) قوم کے سرداروں نے جنھیں اپنے مال و دولت پر گھمنڈ تھا، کہا کہ اے شعیبؑ! (دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی) یا تو ہم تمھیں مجبور کردیں گے کہ ہمارے مسلک کی طرف لوٹ آؤ اور یا ہم تجھے اور تیرے ساتھیوں کو، جو تمھارے ساتھ اس دعوت پر ایمان لے آتے ہیں، اپنے شہر سے باہر نکال دیں گے۔

دھمکیاں

آپ نے دیکھا کہ اس دھمکی کے ایک ایک لفظ میں کس طرح دولت اور قوّت کی بدمستیاں کسوتِ مینا سے چھلک کر باہر آرہی ہیں؟ اور یہ چیز آج سے تین ہزار برس پہلے بسنے والی قومِ مدین ہی سے مختص نہیں۔ دولت اور قوت جب بھی حدود اللہ سے باہر نکلی ہے، اس سے اس قسم کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ چار ہزار سال پہلے بھی اور آج بھی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللّٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری

یہ کچھ تو حضرت شعیبؑ سے کہا اور جو غریب ان کے ساتھ ہو لیتے تھے انہیں یہ کہہ کر دھمکایا کہ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (۷/۹۰) "اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کی، تو سمجھ لو کہ تم برباد ہوئے۔"

لیکن حضرت شعیبؑ اپنی دعوت کو برابر پیش کرتے چلے گئے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی طرف سے اس کی مخالفت بھی بڑھتی چلی گئی۔ کبھی وہ کہتے کہ

یٰشُعَیْبُ مَانَفْقَهُ کَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ (۱۱/۹۱)

اے شعیبؑ! جو کچھ تم کہتے ہو، اس میں سے اکثر باتیں ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ ٹھیک ہے سرمایہ دار کی سمجھ میں یہ بات آیا ہی نہیں کرتی کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۳۹/۵۳) معاوضہ محنت کا ہوتا ہے روپے کا نہیں۔ روپے کا معاوضہ ربٰو ہے جسے نظامِ خداوندی حرام قرار دیتا ہے اور کبھی وہ حضرت شعیبؑ سے کہتے کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ۔ (۲۶/۱۸۵) تم جو ایسی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو تو یہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

لیکن ان کے ان طعنوں اور دھمکیوں سے، غلط نظام کے تباہ کن نتائج رُک تھوڑے سکتے تھے۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۚ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا شُعَیْبًا کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا (۷/۹۱-۹۲) سو ایک لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے مُنہ پڑے تھے۔ جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا تھا (وہ ایسے تباہ ہوتے) گویا وہ ان بستیوں میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ وہ تھے ہی برباد ہونے والے، اس لئے کہ

تدبّر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہو

کشمکشِ کلیمیؑ و فرعونی

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ سرزمین آتی ہے جو تاریخ کے اس دَور میں کشمکشِ حق و باطل کی سب سے بڑی رزم گاہ قرار پائی اور جس میں عصائے کلیمیؑ اور سحرِ فرعونی کا بھرپور ٹکراؤ ہوا۔ مشیّتِ ایزدی کے مطابق حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے محلات میں ہوئی تھی، جہاں انھیں اس بات کے مطالعہ کرنے کا نہایت عمدہ موقع مل گیا کہ سیاست کی دسیسہ کاریاں، اپنے اقتدار و اختیار کو قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرتی ہیں لیکن ابھی ان کے لئے یہ دیکھنا باقی تھا کہ اربابِ قوّت خدا کی طرف سے بلامعاوضہ عطا کردہ رزق کے سرچشموں کو کس طرح اپنے قبضے میں رکھتے ہیں۔ اس کا سب سے پہلا موقع اس وقت آیا جب وہ مصر سے بھاگ کر مدین کی طرف گئے ہیں۔ وہ راستے میں سستانے کے لئے ایک

پیاؤ کے قریب بیٹھ گئے۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ چرواہے آتے ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پلا کر لے جاتے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو اپنی بھیڑوں کو لئے پیاؤ سے ایک طرف کھڑی ہیں پیاسی بھیڑیں لپک کر پانی کی طرف جانا چاہتی ہیں لیکن وہ انھیں بار بار روکتی ہیں کہ وہ آگے نہ بڑھنے پائیں۔ حضرت موسیٰؑ کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ وہ اپنے جانوروں کو اس طرح روک کیوں رہی ہیں؟ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ ان کا ماجرا کیا ہے۔ وہ اپنے جانوروں کو پانی تک کیوں نہیں پہنچنے دیتیں؟

قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ وَ اَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ ○ (۲۸/۲۳) انہوں نے کہا کہ جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ ہمارے گھر میں کوئی زور آور نہیں ہے۔ ہم کمزور لڑکیاں ہیں اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اس لئے پیاؤ پر کمزوروں کے جانوروں کی باری اس وقت آسکتی ہے، جب طاقتوروں کے جانور سیر ہو کر چلے آئیں۔ آخر میں تلچھٹ ہمارے مویشیوں کے حصے میں آجائے گا۔

مدین کا پیاؤ

حضرت موسیٰؑ نے ایک سرد آہ بھری اور دل میں کہا کہ مصر کو چھوڑا تھا کہ وہاں حق وانصاف کے بجائے قوت واستبداد کا دور دورہ تھا۔ جی میں تھا کہ ایسی سرزمین میں جا بسوں، جہاں کمزوروں کو ستانے والا کوئی نہ ہو لیکن ـــــــ بہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست ـــــــ یہاں حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ آپ اٹھے۔

فَسَقٰی لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ○ (۲۸/۲۴)

ان لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلایا اور پھر سایہ میں آکر بیٹھ گئے اور اپنے خدا سے عرض کیا کہ (اس دنیا میں تو ہر جگہ دھاندلی ہی دھاندلی ہے) اب تیری طرف سے میری بہتری کے لئے جو کچھ بھی آئے، میں اس کا محتاج ہوں۔

اس کے بعد جب آپ فرعون کی طرف گئے تو اصل مسئلہ اُبھر کر سامنے آگیا۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۳/۴۶) اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنے واضح احکام دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ میں اس خدا کی طرف سے پیغامبر ہوں جو تمام اقوامِ عالم کا نشوونما دینے والا ہے۔ یوں دیکھنے میں تو یہ بات "معصوم" سی نظر آتی ہے لیکن فرعون کی نگہ دوررس نے فوراً بھانپ لیا کہ خدا کی ربوبیتِ عالمینی پر زور دینے سے حضرت موسیٰؑ کا مقصود کیا ہے؟ چنانچہ اس نے فوراً پوچھا کہ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ (۲۶/۲۳) ربّ العالمین کون ہے؟ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ۔ (۲۶/۲۴) موسیٰؑ نے کہا ربّ العالمین وہ ہے جو کائنات

کی پستیوں اور بلندیوں کا اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، اس سب کا پالنہار ہے۔ اگر تم یقین کرنے والے ہو تو اس کی ربوبیتِ عالمینی ہر جگہ نظر آ جائے گی۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے اس کے درباریوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ رَبُّکُمْ

دربارِ فرعون

وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ۔ (۲۶/۲۶) تمہارا نشوونما دینے والا بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کا نشوونما دینے والا بھی۔

اس اجمال کی تفصیل میں انھوں نے کہا کہ

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا وَّسَلَکَ لَکُمْ فِیْھَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ط فَاَخْرَجْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ۝ کُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَکُمْ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی ۝ (۲۰/۵۳-۵۴)

(میرا رب) وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونے کی طرح بچھا دیا۔ نقل و حرکت کے لئے اس میں راہیں نکال دیں۔ آسمان سے پانی برسایا۔ اس کی آبپاشی سے قسم قسم کی نباتات پیدا کی تاکہ تم اسے خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ سوچو کہ اس حقیقت میں عقل و فکر سے کام لینے والوں کے لئے کیسی کھلی نشانیاں ہیں۔

جب فرعون نے دیکھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ رزق کے سرچشمے، انسانوں کے ہاتھ سے چھین کر ان کے حقیقی مالک، خدا کی طرف لوٹا دیئے جائیں تاکہ ان سے نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت کا مقصدِ عظیم پورا ہو، تو اس نے اس کی روک تھام کی تدابیر سوچنی شروع کیں۔ فَحَشَرَ فَنَادٰی ۝ صلے فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ۝ صلے (۷۹/۲۳-۲۴) اس نے جگہ جگہ لوگوں کو اکٹھا کر کے منادی کرانی شروع کی کہ لوگو! میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنے والا ہوں۔ موسیٰؑ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ تمہارا نشوونما دینے والا کوئی اور ہے۔ وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِہٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ج اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ط اس نے اعلانات پر اعلانات شروع کر دیئے کہ لوگو اس شخص کے فریب میں نہ آجانا جو کہتا ہے کہ وسائلِ رزق خدا کی ملکیت ہیں۔ ان پر کسی انسان کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ تم بتاؤ کہ کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں۔ اور کیا یہ نہریں، جو میرے زیرِ اقتدار بہہ رہی ہیں، میری ملکیت نہیں؟ کیا تم سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ مَھِیْنٌ لا وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ ۝ (۴۳/۵۱-۵۲) کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں اس سے کہیں بہتر ہوں۔ یہ کمزور اور ذلیل سا انسان جسے کھل کر بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ فَلَوْلَآ

اُلْقِیَ عَلَیْہِ اَسْوِرَۃٌ مِّنْ ذَھَبٍ اَوْجَآءَ مَعَہُ الْمَلٰٓئِکَۃُ مُقْتَرِنِیْنَ ○ (۴۳/۵۳)۔
"اگر یہ خدا کا فرستادہ اور ایسا عظیم تھا تو اسے سرداری کے نشانات کیوں نہ دیتے گئے۔ اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہ اتارے گئے"؟ اس نے یہ پروپیگنڈہ اس زور شور سے کیا کہ قوم کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہ رہی۔ پروپیگنڈہ سے مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ عوام کو ایسا (HYPNOTIZED) کردیا جائے کہ وہ نہ اپنے کانوں سے سنیں نہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں، نہ اپنے دل و دماغ سے سمجھیں۔ قرآنِ کریم میں ہے فَاسْتَخَفَّ قَوْمَہٗ فَاَطَاعُوْہُ۔ (۴۳/۵۴) اس نے اس طرح قوم کو عقل و خرد سے بیگانہ کردیا اور وہ اس کی اطاعت کرنے لگ گئے۔

آپ نے غور کیا کہ یہاں بھی کشمکش وہی تھی جسے ہم اس سے پہلے داعیانِ انقلابِ خداوندی اور اربابِ دولت و اقتدار کے مابین دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے فرعون کے علاوہ، دینِ خداوندی کے ایک اور مخالف کا بھی ذکر کیا ہے جو دنیا میں آج تک نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے متعارف ہے، یعنی قارون۔

قارون

فرعون تو پھر بھی بنی اسرائیل پر ظلم ستم کرتا تھا جو غیر قوم کے افراد تھے لیکن قارون خود بنی اسرائیل میں سے تھا اور انہی کا خون چوستا تھا۔ سرمایہ پرستی میں "معبود" پیسہ ہوتا ہے جو اپنے اور بیگانے میں قطعاً تمیز نہیں کرتا۔ قارون نے بے حد و شمار دولت جمع کر رکھی تھی اور اس کا اسے گھمنڈ تھا (۲۸/۷۶) اس کی قوم نے اس سے کہا کہ وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ ــــــــــ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (۲۸/۷۷) جو کچھ تجھے خدا نے دے رکھا ہے اسے محض اپنی طبیعی زندگی تک ہی محدود نہ رکھ۔ اس سے مستقبل کی سرفرازی کی بھی جستجو کر۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم تارک الدنیا ہو جاؤ۔ دنیاوی زندگی میں بھی اپنے حصّہ کا خیال رکھو۔ لیکن اسے مقصود و منتہٰی نہ بنالو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ نے تمہیں اتنا کچھ دے کر تمہاری ہر طرح کی کمی پوری کر رکھی ہے، اسی طرح تم دوسرے انسانوں کی کمی پوری کرنے کی فکر کرو اور دولت کو ایک جگہ اکٹھا کر کے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کے درپے نہ ہو۔ یہ چیز قانونِ خداوندی کی رُو سے بڑی ہی ناپسندیدہ ہے۔

اس نے یہ سنا اور نہایت طنز آمیز لہجہ میں کہا کہ ' تم نے یہ کیا کہا کہ مجھے خُدا نے یہ کچھ دے رکھا ہے؟ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (۲۸/۷۸) یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنرمندی کی بدولت ملا ہے۔

اس میں خدا کا کیا ہے جو میں اسے اس کے قوانین کے مطابق صرف کروں۔

آپ نے غور کیا کہ قارون کا یہ جواب کس طرح اس ذہنیت کی آئینہ داری کر رہا ہے جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جس طرح اس کشمکش میں فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا، اسی طرح قارون اور اس کی دولت بھی زمین میں دھنس گئی۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ قف فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ (۲۸/۸۱)

سو ہم نے اسے اور اس کی محل سرا کو زمین میں دھنسا دیا۔ پھر نہ تو کوئی جماعت ایسی ہوئی جو قانونِ خداوندی کے خلاف اس کی مدد کر سکتی اور نہ ہی وہ اپنی تدابیر سے اپنی ہی کچھ مدد کر سکا۔

یہ ہے "دینِ خداوندی کے مخالفین" کا وہ پہلا گروہ، جس کا قرآن نے تفصیلی ذکر مختلف اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں متعدد مقامات میں کیا ہے اور جس کے متعلق اجمالی طور پر کہا ہے کہ

تمام انبیاء کی مخالفت

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ لا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا لا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ۔ (۳۴/۳۴-۳۵)

اور ہم نے کسی بستی میں بھی اپنا پیغامبر نہیں بھیجا، جس نے ان لوگوں کو ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا ہو اور وہاں کے دولت مند طبقہ نے اس سے یہ نہ کہا ہو کہ جو دعوت تم لے کر آتے ہو، ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کے اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس اس قدر دولت ہے اور ہمارے خاندان کے افراد بھی اتنے زیادہ ہیں۔ پھر کون ہے جو ہم پر گرفت کر کے کوئی آفت لا سکے۔

یعنی قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا کی دعوت جب اور جہاں بھی آئی، سرمایہ دار طبقہ نے سب سے پہلے اس کی مخالفت کی اور مخالفت دلائل و براہین کی بنا پر نہیں، بلکہ محض اپنی دولت اور قوت کے گھمنڈ پر کی۔ یہی کچھ انبیائے سابقہ کے ساتھ ہوا اور یہی کچھ خدا کے آخری نبیؐ اور کائنات کے عظیم القدر داعیٔ انقلابؐ، حضور رسالت

نبیٔ اکرمؐ | مآبؐ کے ساتھ۔ یہاں بھی مخالفت اسی گروہ کی طرف سے شروع ہوئی، جس کے گھر دولت سے بھرے ہوتے تھے۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۚ (۳۸/۶) ان میں سے اکابرِ قوم کہنے لگے کہ چلو اپنے معبودوں کی پرستش پر ثابت قدمی سے جمے رہو۔ یقیناً یہ کوئی سوچی سمجھی اسکیم ہے (جس کی رُو سے یہاں کوئی عظیم انقلاب لانے کی کوشش کی جا رہی ہے)۔ چنانچہ اسی طبقے کا وہ نمائندہ تھا، جس کی شدید مخالفت کے کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا کہ تم اس کی چیرہ دستیوں اور وسیسہ کاریوں سے مت گھبراؤ۔ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۙ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۙ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۙ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۙ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۙ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۭ (۷۴/۱۱-۱۶) یہ وہ شخص ہے کہ جب یہ پیدا ہوا تو ساتھ کچھ نہیں لے کر آیا تھا۔ پھر ہم نے اسے بڑی کثرت سے مال و دولت دیا اور وہ بیٹے دیئے جو (امیرزادوں کی طرح) ہر وقت گھر میں بیٹھے گٹھ جوڑ کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ ہم نے اس کے لئے زندگی کی آسائشوں کے راستے ہموار کر دیئے لیکن اس کی ہوس کی تسکین نہ ہوئی اور یہ چاہتا ہے کہ ہم اسے اور زیادہ دولت اور قوت دیتے چلے جائیں لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے کہ یہ اس دولت اور قوت کو ہمارے قوانین کے مطابق صرف کرنے کے بجائے، الٹا ان کی مخالفت پر اُتر آیا ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اسے ہمارے

قریش کو تنبیہہ | قانونِ مکافات کے حوالے کرو۔ وہ اس سے خود نپٹ لے گا۔ ان مترفینِ قریش کے متعلق، جو اپنی دولت کے نشے میں بدمست، اس انقلابی دعوت کی اس طرح مخالفت کرتے تھے، کہا کہ

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ

کیا ان لوگوں نے اِدھر اُدھر چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جن قوموں نے ان سے پہلے ایسی روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا؟

كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا ۔ وہ قومیں، قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں۔ ان کی زمینیں ان سے زیادہ پیداوار دیتی تھیں۔ ان کی آبادیاں ان سے زیادہ معمور تھیں۔ وَجَاۗءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ

ان کے پاس اس کے رسول واضح قوانینِ خداوندی لے کر پہنچے۔ (انھوں نے اس کی بات نہ مانی اور اپنے جرائم کی پاداش میں تباہ و برباد ہو گئے) یاد رکھو۔ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ؕ (۳۰/۹) خدا نے انھیں یونہی ناحق تباہ نہیں کر دیا۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں آپ اپنے آپ کو تباہ و برباد کیا۔

دوسری جگہ ہے۔ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ (۲۸/۵۸) ان سے کہو کہ ذرا تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ کتنی بستیاں ایسی تھیں جو اپنی معاشی فراوانیوں پر اس قدر نازاں تھیں۔ سو دیکھو! یہ ان کے مکانات ہیں جو معدودے چند کے علاوہ ان کے بعد آج تک آباد نہیں ہوئے اور ان سب کے وارث اور مالک ہم ہی ہو گئے۔ سو جو کچھ ان کے ساتھ ہوا، وہی کچھ ان کے ساتھ ہوگا۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۶/۲۱) اس کا قانون یہی ہے کہ دوسروں پر زیادتی کرنے والوں کی کھیتیاں کبھی پروان نہیں چڑھا کرتیں۔

اور دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ مترفین بھی بالآخر تباہ و برباد ہوئے۔ وَمَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔ (۱۱۱/۲) اس گروہ کا مال و دولت اور کسب و ہنر ان کے کسی کام نہ آسکا۔

دوسرا گروہ

دینِ خداوندی کے مخالفین کے گروہِ اوّل کے کوائف آپ کے سامنے آ گئے۔ یہ گروہ ان سرمایہ پرستوں کا ہے جن کے انسانیت سوز معاشی نظام کے خلاف، آسمانی دعوت ایک کھلے ہوئے چیلنج کا حکم رکھتی ہے۔

دینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتا اور دلائل و براھین کی تائید سے منواتا ہے۔ وہ عقل و فکر کو دعوت دیتا اور غور و تدبّر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ دعوت ان لوگوں کے مفاد کے خلاف جاتی ہے جو عوام کی جہالت اور توہم پرستیوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں بلکہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، آنکھیں بند کر کے اس پر چلتے جائیں۔ لہٰذا اس گروہ کی طرف سے بھی دینِ خداوندی کی سخت مخالفت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس گروہ کا ذکر

بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ حسبِ معمول اس کشمکش کی ابتداء حضرت نوحؑ کی دعوت سے کرتا ہے۔

قومِ نوحؑ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (۲۳/۲۳) اے میری قوم! تم اللہ کی محکومی اختیار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔ (۲۳/۲۴) ہم نے اپنے آباؤ اجداد میں سے کسی سے یہ بات نہیں سنی۔ اس لئے ہم اسے سننے کے لئے تیار نہیں یعنی انھوں نے یہ نہیں کہا کہ جو کچھ تم کہتے ہو، اس میں ہمیں فلاں غلطی یا سقم نظر آتا ہے۔ کہا یہ کہ جس راستے کی طرف تم بلاتے ہو، وہ راستہ ہمارے اسلاف کے راستے کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اسے اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ آپ سے یہ کہا اور عوام میں مشہور کر دیا کہ (معاذ اللہ) اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو یہ اس قسم کی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ (۲۳/۲۵) انھوں نے کہا کہ یہ شخص پاگل ہو گیا ہے۔ سو تم کچھ دنوں تک انتظار کر کے دیکھ لو کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ قَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۵۴/۹) لوگوں میں مشہور کر دیا کہ یہ پاگل ہے اور پھر اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے، اسے ڈانٹ کر نکال دیا۔

حضرت ہودؑ حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ہودؑ آتے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی قوم کو خدا کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں انھوں نے بھی یہی کہا کہ اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۷/۷۰) کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم اکیلے خدا کی عبودیت اختیار کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے؟ حضرت ہودؑ نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ علم و بصیرت اور عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ۔ ط (۷/۷۱) جن چیزوں کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑتے ہو، ان کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ چند نام ہیں جو تم نے یا تمہارے بزرگوں نے وضع کر رکھے ہیں۔ ان کے لئے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے؟ قرآن کہتا ہے اس طبقہ کے ہاں جس چیز کو روایتی عظمت اور موروثی تقدیس کہا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ فقط اس قدر کہ ابتداء میں جہالت اور توہم پرستی سے کوئی عقیدہ قائم ہو گیا اور اسے کسی

کی طرف منسوب کردیا۔ جب وہ دو چار نسلوں تک متوارث آگے بڑھا تو وہ نام اس قدر مقدس ہو گئے کہ ان کے خلاف ایک لفظ سننا بھی گوارا نہ رہا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ کسی عقیدہ یا روش کے صحیح ہونے کی یہ تو کوئی دلیل نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسے خدائی سند بھی حاصل ہے یا نہیں؟

حضرت صالحؑ

حضرت ہودؑ کے بعد قومِ ثمود کی طرف حضرت صالحؑ تشریف لاتے۔ انہوں نے بھی وہی دعوتِ خداوندی پیش کی۔ اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ۔ انہوں نے کہا اے صالحؑ! پہلے تو تُو ایسا آدمی نہیں تھا۔ تجھ سے ہماری بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن اب یہ ایک دم تجھے کیا ہوگیا کہ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا۔ کہ تو ہمیں ان کی محکومی و اطاعت، بھگتی اور پرستش سے روکتا ہے، جن کی پرستش و اطاعت ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں۔ وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ (۱۱/۶۲) جس بات کی طرف تم دعوت دیتے ہو، اس کی صداقت میں ہمیں بڑا شک ہے۔ وہ ہمارے دل میں اُترتی نہیں۔ ہم اس کے سوا اور کیا سمجھیں کہ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ (۲۶/۱۵۳) تجھ پر کسی نے جادو کردیا ہے جو تو اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

معمارِ حرمؑ

حضرت صالحؑ کے بعد ہمارے سامنے، معمارِ حرم حضرت ابراہیمؑ کا تذکرۂ جلیلہ آتا ہے۔ بُت پرستی ان کی قوم کا شعار تھا۔ انہوں نے اس کے خلاف دعوتِ توحید دی۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۲۱/۵۲) انہوں نے اپنے والد اور قوم سے کہا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم اس طرح جمے بیٹھے ہو؟ خدا کا نام تو ایک طرف، کیا تمہیں اپنے مقام کا بھی کچھ اندازہ نہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (۲۱/۵۳) انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ اس لئے ہم بھی انہی کی تقلید کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے کہا۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۲۱/۵۴) یقین جانو تم اور تمہارے آبا و اجداد، سب کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ (۲۶/۷۵-۷۶)

انہوں نے کہا کہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ جن چیزوں کی تم اور تمہارے آباؤ اجداد پرستش کرتے ہو، ان کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ مذہب کے معاملات ہیں۔ ان سے غور و فکر کا کیا واسطہ؟ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۲۶/۷۴) ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔ ہم بھی ویسے ہی کرنے لگ گئے۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے ان "مقدسین" کی دکھتی رگ کو چھیڑا اور کہا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے یہ مسلک کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ جو مسلک تمہارے اسلاف سے چلا آ رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور جن معبودوں کی تم، ان کے نام کی نسبت سے پرستش کراتے ہو ان کی حیثیت کیا لیکن اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (۲۹/۲۵) ان کی وجہ سے تمہارا جتھہ قائم رہتا ہے اور جتھہ کے قائم رہنے سے تمہیں دنیاوی مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ یہ ہے سارا راز اس تقدیس و تعظیم کا۔ آپ نے غور کیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو وا شگاف کیا ہے؟

جب ان مقدسین کے طائفہ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ان کی تقدیس کے پردے چاک ہو رہے ہیں تو انہوں نے قوم کے جذبات کو بھڑکایا۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ (۲۹/۲۴) انہوں نے عوام سے کہا کہ ابراہیمؑ کو مار ڈالو، اسے زندہ جلا دو۔ حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۔ (۲۱/۶۸) اگر تم میں کچھ بھی ہمت ہے تو اسے جلا دو اور اس طرح اپنے معبودوں کا بول بالا کر دو۔

کوئی دلیل نہیں، کوئی برہان نہیں۔ بس عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیا اور خوش ہو لیتے کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔

حضرت شعیبؑ

حضرت ابراہیمؑ کے بعد ہمارے سامنے حضرت شعیبؑ آتے ہیں۔ انہوں نے بھی وہی دعوتِ خداوندی پیش کی اور اس کے جواب میں ان کے سامنے بھی وہی مسلکِ اسلاف کی دلیل لائی گئی۔ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ (۱۱/۸۷) انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا بھی حکم دیتی ہے کہ تم ہم سے آکر کہو کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں، جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ (معاذ اللہ) تمہارا

دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ (۲۶/۱۸۵) تم پر کسی نے جادو ٹونہ کر دیا ہے جاؤ! اپنا علاج کراؤ۔

حضرت موسیٰؑ کشمکش کلیمی و فرعونی میں یہ چیز ایک اور ہی پہلو سے سامنے آتی ہے، جس سے نظر آتا ہے کہ ملوکیت کی دسیسہ کاریاں اپنی مطلب برآری کے لئے کیا کیا حربے اختیار کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

(اَنْ) اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۲۶/۱۷)

بنی اسرائیل کو اپنی محکومی کی زنجیروں سے آزاد کر کے ہم دونوں بھائیوں کے ساتھ بھیج دے۔

فرعون نے پہلے تو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ اور نہج سے گفتگو شروع کی لیکن، جب اس نے دیکھا کہ اس طرح وہ قابو میں نہیں آسکتے تو اس نے ایک تدبیر اور سوچی۔ فرعون کے ارد گرد اس کے امراء اور وزراء اور دیگر سرداران قوم جمع تھے۔ وہ قوم خود بھی مشرک تھی اور اس کے آباؤ اجداد بھی باطل پرست تھے۔ فرعون کو اس کا اچھی طرح علم و احساس تھا کہ ان کے متعلق حضرت موسیٰؑ کا خیال کیا ہوسکتا ہے۔ اس نے جھٹ سے پہلو بدلا اور حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ یہ باتیں تو بعد میں ہولیں گی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی (۲۰/۵۱) جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں وہ کس حال میں ہیں؛ یعنی ان لوگوں کے آباؤ اجداد جنت میں ہیں یا جہنم میں؟ سوال آپ نے دیکھ لیا اور یہ بھی بھانپ لیا کہ فرعون کا اس سے مطلب کیا تھا؛ لیکن اسے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اسے معاملہ کس شخص سے پڑ رہا ہے! وہ خدا کے پیغمبر تھے۔ انہوں نے کہا۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ ان کا علم میرے رب کے پاس نوشتہ کے اندر ہے۔ ان کا معاملہ میرے ساتھ نہیں' خدا کے ساتھ ہے اور خدا وہ ہے کہ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی۔ (۲۰/۵۲) نہ وہ غلطی کرسکتا ہے اور نہ ہی کچھ بھول سکتا ہے۔ اس لئے اس بات کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیجتے ہو یا نہیں؟

جب فرعون نے دیکھا کہ اس کا یہ تیر بھی خطا گیا تو اس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ آپ کی دعوت کا تعلق مذہب سے ہے، سیاست سے نہیں۔ اس لئے کہ آپ بار بار خدا کو بیچ میں لا رہے ہیں۔ لہٰذا آپ کا مقابلہ ہماری مملکت کے (HEAD-PRIEST)' ہامان کے ساتھ ہوگا۔ چنانچہ ہامان اپنے تمام لاؤ لشکر سمیت مقابلہ کے لئے آیا۔ اس نے قوم کے جذباتِ اسلاف پرستی کو مشتعل کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ

أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۔ (۱۰/۷۸) کیا تم اس لئے ہمارے پاس آتے ہو کہ جس راستے پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو ۔ انہوں نے یہ کچھ کہا اور ادھر فرعون نے اہلِ دربار میں یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ (۲۶/۲۷) یہ جو تمہاری طرف پیغامبر بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ (خاکم بدہن) پاگل ہے۔

اُسی سازِ کہن کی صدائے بازگشت

حضور خاتم النبیینؐ

اب آپ اس دَور کی طرف آیئے جس میں خدا کا آخری پیغام، ہر قسم کی غلامی کے لئے پیامِ مرگ بن کر آیا تھا جو دعوت حضرت نوحؑ سے لے کر مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی تھی، اسے اس کی مکمل شکل میں، نبی اکرمؐ نے پیش کیا اور اس گروہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔ اس کی مخالفت کی "دلیل" بھی وہی تھی۔ یعنی مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ (۳۸/۷) ہم نے اسے پچھلے مذہب و ملت میں کہیں نہیں سنا۔ یہ محض بناتی ہوئی بات ہے۔ یعنی سچی بات وہی ہوگی جو اس روش کی تائید کرے جو ان کے اسلاف سے متوارث چلی آ رہی تھی۔ جو بات اس روش کے خلاف ہوگی، وہ وضعی اور جھوٹی ہوگی۔ جب نبی اکرمؐ اپنی قوم کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتے تو یہ گروہ آگے بڑھتا اور لوگوں سے کہتا کہ مَا هَٰذَا إِلَّا رَجُلٌ يُرِيدُ أَنْ يَصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُكُمْ (۳۴/۴۳) اس شخص کا ارادہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ جن چیزوں کی پرستش تمہارے آباؤ اجداد کرتے چلے آ رہے ہیں، تمہیں ان سے روک دے۔ اس لئے تم اس کی کوئی بات نہ ماننا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی نے ایک مرتبہ اس پیغامِ خداوندی کو دل کے کانوں سے سُن لیا تو وہ اس کی صداقت کا قائل ہو جائے گا۔ اس لئے وہ اپنے متبعین کو تاکید کرتے تھے کہ

لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ ـــــ (۴۱/۲۶) تم اس قرآن کو ہرگز نہ سننا۔ یہ جہاں بھی پیش کیا جا رہا ہو، تم شور مچا دو۔ نہ خود سنو نہ کسی اور کو سننے دو۔ بس یہی ایک طریقہ ہے، جس سے اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ تم اس آواز کو دبا سکو۔ قرآنِ کریم بار بار اس حقیقت کو دہراتا ہے کہ وہ لوگ اس پیغامِ خداوندی کی مخالفت کسی دلیل و برہان کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ کہہ کر کرتے ہیں

کہ یہ ان کے اسلاف کے مسلک کے خلاف ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا۔

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس کی پیروی کرو جسے خدا نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اسی کی پیروی کرتے رہیں گے، جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔"

اور قرآن کہتا ہے کہ

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰)

خواہ ان کے اسلاف نہ کچھ عقل وفکر رکھتے ہوں اور نہ ہی صحیح راستے پر چل رہے ہوں، یہ پھر بھی انہی کا اتباع کرتے جائیں گے۔ یہ اس لئے کہ اسلاف پرستی کی ذہنیت اسے تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتی کہ ان کے آباؤ اجداد عقل وفکر نہیں رکھتے تھے یا غلط راستے پر چلتے تھے۔ غلط اور صحیح راستے پر چلنے کا امتیاز تو وہ کرے جو عقل وفکر سے کام لے۔ جب انہیں عقل وفکر سے کام لینے کے لئے کہا جاتا تو ان کا وہی ایک جواب ہوتا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲) ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔ ہم نے جس طریقے پر اپنے اسلاف کو پایا ہے، ہم اسی پر چلتے جائیں گے۔ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ـــــــ (۵/۱۰۴) ہمارے اسلاف کا طریقہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس پر پھر قرآن یہ کہتا کہ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ ○ (۵/۱۰۴) خواہ تمہارے اسلاف کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہی خدا کے تجویز کردہ راستے پر چلتے ہوں، پھر تم بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے جاؤ گے؟ ان کے پاس اس کا جواب (معاذ اللہ) گالیوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ ـــ (خالکم بہ دہن) "پاگل" ہے۔ (۶۸/۵۱) اس پر کسی نے جادو کردیا ہے۔ (۱۷/۴۷) بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ (۲۱/۵) یہ اس کے خواب وخیال کی باتیں ہیں۔ اس کے من گھڑت دعوے ہیں۔ محض شاعری ہے۔ یہ کذّاب ہے۔ (۳۸/۴) یہ جہاں کوئی بات کرے اس کا مذاق اڑاؤ (۴۱/۲۶) لوگوں سے کہو کہ ـــ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا۔ (۲۵/۴۱) ذرا دیکھنا! یہ ہے وہ جو کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟

یہ ہے وہ اندازِ مخالفت جو حق وصداقت کی آواز کے خلاف، اس گروہ کی طرف سے اختیار کیا جاتا رہا ہے۔

ـــــ ہر زمانے میں اور ہر مقام پر۔

مترفین کے دونوں گروہ

دینِ خداوندی کے مخالفین کے دونوں گروہ آپ کے سامنے آ گئے ایک گروہ سرمایہ داروں کا' جو دولت کی بنا پر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو عوام کو جہالت کی تاریکیوں سے نکلنے نہیں دیتے۔ قرآن کریم نے ان دونوں کو مترفین کہہ کر پکارا ہے، یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر خوش حالی اور تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں چنانچہ ان میں سے پہلے گروہ کے متعلق کہا کہ

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَـٰفِرُونَ ○ وَقَالُوا۟ نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَٰلًا وَأَوْلَـٰدًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ۔ (۳۴/۳۴-۳۵)

اور ہم نے کسی بستی میں بھی کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے یہ کہا کہ جو کچھ تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے، ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے کہ ہمارا اتنا بڑا قبیلہ اور جتھہ ہمارے پاس اس قدر مال و دولت۔ ہمیں کون سزا دے سکتا ہے۔

یہ سرمایہ داروں اور اربابِ اقتدار کا طبقہ ہے۔ دوسرے گروہ کے متعلق فرمایا۔

وَكَذَٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ لا إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم مُّقْتَدُونَ ○ (۴۳/۲۳)

اور اسی طرح (اے رسولؐ!) ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے مترفین نے کہا کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک طریقہ پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہیں کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔

اس مخالفت کا مطلب

واضح رہے کہ اسلام سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ یہ بھک منگوں، سادھوؤں، سنیاسیوں، تارک الدنیا راہبوں، مفلسوں، ناداروں، فاقہ کشوں کا مذہب ہے۔ اسلام کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرنے کی تعلیم دیتا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ ان قوتوں کے ماحصل کو قوانینِ خداوندی کے مطابق، نوعِ انسان کی منفعتِ عامہ کے لئے صرف کیا جائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن وہ دولت کی تقسیم اس طرح کرتا ہے کہ نہ افراد کے پاس ان کی ضروریات سے زیادہ دولت جمع رہتی ہے اور نہ ہی کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے۔

وہ ایسا نظام متشکّل کرتا ہے، جس میں وسائلِ رزق، نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیت (پرورش) کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ یہی وہ نظام ہے، جس کی مخالفت سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے۔

دوسری طرف جب وہ گروہِ ثانی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ جو کچھ چلا آرہا ہے، اس کی محض اس بنا پر مخالفت کرو کہ وہ پیچھے سے منتقل ہو کر کیوں آرہا ہے؟ وہ اس ضمن میں جو کچھ کہتا ہے، وہ اس کے ایک نکتہ میں پنہاں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۳۱/۲۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کا اتباع کرو جو خدا نے نازل کیا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اس کا اتباع کریں گے، جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ جو کچھ تمہارے آباؤ اجداد سے منتقل ہو کر آیا ہے، اسے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ جو اس پر پورا اُترے اسے قبول کر لو، جو اس کے خلاف جائے اسے مسترد کردو۔ قرآنِ کریم کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ہر فرد اور ہر نسل اپنے اعمال کی خود ذمہ دار ہے۔ اس لئے ہر وہ روش جس میں اس ذمہ داری کو دوسروں کی طرف منتقل کرنے کا رجحان پایا جائے، غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر دَور کے افراد سے ان کے آباؤ اجداد کے متعلق کہہ دیا کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۲/۱۴۱) یہ لوگ اس دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے، جو تم کروگے اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ تم سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا کیا تھا۔ یہ قطعاً نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے آباؤ اجداد نے کیا کیا اور کیا کہا تھا؟ لہٰذا تم یہ کہہ کر نہیں چھوٹ سکو گے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کرتے رہے، اس لئے ہم اپنے کئے کے ذمہ دار نہیں۔ جو کچھ تم کروگے اس کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی۔ اس لئے تمہیں خود سوچنا چاہیئے کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ کتاب اللہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ قرآنِ کریم کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر شخص پرکھ سکے کہ اس کا عمل اس کے مطابق ہے یا نہیں؟

اِسلام کیا ہے؟

(تقریر)

اپریل سنہ ۱۹۶۲ء

اسلام نام ہے قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کا، ان کی اطاعت کرنے کا، ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا۔ اس کے برعکس، ان قوانین سے انکار، انحراف اور سرکشی کا نام کفر ہے۔

کائنات کی سجدہ ریزی

۲۔ آپ اس عظیم القدر اور محیّر العقول کارگہ کائنات پر نگاہ ڈالئے۔ اس میں ہر شے لگے بندھے قانون کے مطابق مصروفِ عمل ہے۔ کسی کو ان قوانین سے یارائے انحراف نہیں، مجالِ سرکشی نہیں۔ کوئی اس راستے سے ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا جو اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ ....[1] (۲۲/۱۸)

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ ارض و سما میں جو کچھ ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جاندار ...... سب قوانینِ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

---

[1] اس مقام پر آیت کا باقی حصہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔

یہ سب اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہیں اور ان میں سے کسی کو ان سے مجالِ سرکشی نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ (۱۶/۴۹)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سمٰوات) میں جو کچھ ہے، خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا فطرت کی قوتیں، سب قوانینِ خداوندی کے سامنے سر بہ سجود ہیں اور اس سے کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

ان کا منصبِ زندگی اور نہجِ حیات یہ ہے کہ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کے مطابق کام کئے جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم نے اوپر کہا ہے کہ کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ارض و سمٰوات میں جو کچھ ہے سب قوانینِ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے؟ اس حقیقت پر غور کرنا تو بہت بڑی بات ہے کہ وہ کون سے قوانین ہیں جن کے مطابق کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے سرگرمِ عمل ہے اور وہ چیزیں ان قوانین کی اطاعت

سمٰوات کی تحیّر انگیزی

کس طرح کرتی ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہوں نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ جنہیں قرآنِ کریم "سمٰوات" (بلندیاں) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کس قدر تحیّر انگیز مظاہرِ فطرت کا گہوارہ ہیں۔ اس زمانہ میں وسائلِ رسل و رسائل کی کثرت اور ذرائع آمد و رفت کی فراوانی سے، اس حقیقت کو تو ہم سمجھ گئے ہیں، کہ ہماری زمین ایک عظیم الجثّہ کُرّہ ہے جو ہر وقت گردش میں مصروف ہے لیکن ہم میں سے بہت کم ہوں گے جنہیں اس کا علم ہوگا کہ کائنات کی ان حدود فراموش بلندیوں میں جس قدر اجرامِ فلکی تیر رہے ہیں، ان میں ہماری زمین کی حیثیت اتنی ہی ہے، جتنی صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرے کی۔

یہ مثال شاعری نہیں، حقیقت پر مبنی ہے۔ یہ سورج جو ہمیں ایک طشت سے زیادہ بڑا نظر نہیں آتا اور جو ہم سے زیادہ دُور بھی نہیں، صرف نَو کروڑ انتیس لاکھ (۹,۲۹,۰۰,۰۰۰) میل دُور ہے۔ اس کا قطر ہماری زمین سے ۱۰۹ گنا بڑا ہے، یعنی آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار میل (۸,۶۴,۰۰۰) میل۔ اس کی جسامت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس میں ہماری زمین جیسی ۱۳ لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔

لیکن یہ اس قدر عظیم کُرّہ، بایں ہمہ ضخامت و جسامت، دیگر اجرامِ سماوی کے مقابلہ میں اتنی ہی حیثیت رکھتا ہے جتنی سمندر میں ایک قطرہ۔

یہ ستارے جو شب کی تاریکیوں میں ٹمٹماتے چراغ دکھائی دیتے ہیں، ان میں سے جو ستارہ ہم سے قریب ترین ہے، وہ ہم سے کتنی دُور ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جتنی دُور ہم سے سورج ہے، اسے دو لاکھ ستر ہزار سے ضرب دیجئے تو اس کا ہم سے اتنے میلوں کا فاصلہ ہے۔ ہمارا قریب ترین ستارہ ہم سے اتنی دُور ہے۔

اجرامِ فلکی کے فاصلے ہماری سڑکوں کے میلوں سے نہیں ماپے جاتے۔ انہیں "روشنی کے سالوں" سے ماپتے ہیں۔ روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ اس سے آپ سمجھ لیجئے کہ وہ ایک سال میں کس قدر مسافت طے کرتی ہوگی۔ ایسے ستارے بھی ہیں جن کی روشنی ہم تک ۱۸۵،۰۰۰ سال میں پہنچتی ہے۔ پھر سمجھ لیجئے کہ روشنی، ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے اس ستارے سے ہم تک ایک لاکھ ۸۵ ہزار سال کے عرصے میں پہنچتی ہے۔ یہ تو خیر دُور کے ستاروں کی بات ہے۔ یہ کہکشاں جسے ہمارے شاعر گرد مرہ کہہ کر آگے گزر جاتے ہیں، لاتعداد "ستاروں کی دنیا" کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے قریب ترین ستارے کی روشنی ہم تک اٹھارہ ہزار چار سو روشنی کے سال میں پہنچتی ہے۔ آسمان میں ستارے کتنے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اگر ہم ڈیڑھ ہزار ستارہ فی منٹ کے حساب سے گننے لگیں تو سات سو سال میں اس کی گنتی پوری ہو۔

اور "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ اس دنیا کو ہیولیٰ کائنات (NEBULA) کہا جاتا ہے۔ ہماری دُوربین جس بعید ترین ہیولیٰ کو اس وقت تک پا سکی ہے، وہ ہم سے پچیس کروڑ روشنی کے سال (LIGHT-YEARS) کے فاصلے پر ہے، یعنی وہاں سے روشنی، ایک سیکنڈ میں، ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی مسافت طے کرتے ہوئے، ہم تک پچیس کروڑ سال میں پہنچ سکتی ہے۔

آپ نے سمٰوٰت کی وسعتوں اور بلندیوں کا اندازہ فرمایا؟ یہ ہیں وہ سمٰوٰت جن میں ہر شے، قوانینِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور کسی کو اس کی مجال نہیں کہ اپنے مقرّرہ راستے سے ایک انچ کا ہزارواں حصّہ بھی اِدھر اُدھر ہو جائے یا اس کی رفتار میں سیکنڈ کے کروڑویں حصّے کا بھی فرق پڑ جائے۔

یہ تمام اجرامِ فلکی، کائنات کی فضا میں معلّق ہیں — یعنی ایسے ستونوں سے جکڑے ہوئے جنہیں قرآنِ کریم "غیر مرئی" کہہ کر سمجھاتا ہے۔ جہاں کہتا ہے کہ اَللّٰہُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَھَا۔ (۱۳/۲)

کششِ ثقل

اللہ وہ ہے جس نے ان تمام عظیم القدر اجرامِ سماوی کو بلندیوں میں تھام رکھا ہے، بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو۔ یہ غیر مرئی ستون، وہ کششِ ثقل (GRAVITATIONAL PULL) ہے جو ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہے۔

آپ نے فضائے آسمانی کی وسعتوں اور اجرامِ سماوی کی تعداد کے متعلق کچھ سُن لیا ہے اور یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ ان مختلف اجرام میں فاصلہ کس قدر ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ان تمام اجرامِ فلکی کو ایک دوسرے کی کشش تھامے ہوتے ہے۔ اس کششِ ثقل سے متعلق قانون کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے لگایئے کہ سرجیمس جینز کے الفاظ میں اگر ہم اپنی ایک انگلی بھی ہلائیں تو اس کا اثر اجرامِ فلکی میں سے ہر ایک پر پڑتا ہے۔ اجرامِ فلکی کے وزن، جسامت، فاصلہ وغیرہ کے متعلق جس قدر معلومات حاصل کی جاتی ہیں، ان کی بیشتر بنیاد کششِ ثقل کا محیّرالعقول قانون ہے اور یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ اگر کسی ستارے یا کُرّے کی کشش کے تناسب میں غیر محسوس سا فرق بھی آجاتے تو کائنات کا سارا سلسلہ درہم برہم ہو جاتے۔

یہ تو اس بے پایاں فضا میں تیرنے والے عظیم الجثّہ اجرامِ فلکی کی محیّرالعقول عظمتوں اور وسعتوں کا ہلکا سا تصوّر ہے۔ دوسری طرف ذرّات کی طرف آیئے تو ایک قطرہ پانی میں کروڑوں سالمات (MOLECULES) ہوتے ہیں اور ہر سالمہ میں ایک ایٹم آکسیجن اور دو ایٹم ہائیڈروجن کے ہوتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا قطر، ایک سینٹی میٹر کا دس کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ اس ذرۂ ناچیز پر نگاہ رکھئے اور پھر اس کی اس عظمت پر کہ نظامِ شمسی کی طرح اس کا اپنا نظام ہے، جس میں ایک مرکزی ہیولیٰ ہوتا ہے اور اس کے گرد ایک برقیہ (ELECTRON) گردش کرتا ہے۔ یہ برقیہ سالمہ کے لاکھویں حصّے کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی رفتار کا اندازہ اس سے لگایئے کہ یہ اپنے محور کے گرد ایک سیکنڈ کے دس لاکھویں حصّہ میں، سات ارب دفعہ گردش کرتا ہے اور یہ گردش ایک غیر متبدّل قانون کے مطابق ہوتی ہے۔

یہ ہے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی نہایت خفیف سی جھلک۔

قرآنِ کریم نے اس تحیّر انگیز نظامِ کائنات کو ایک لفظ میں بیان کردیا ہے اور وہ لفظ ہے، اسلام۔ اور اسی کو اس نے دِیْنِ اللّٰہ کہا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔

یہ کائناتی اسلام ہے

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ ○ (۳/۸۳)

کیا یہ لوگ دین اللہ (نظامِ خداوندی) کے خلاف کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، سب طوعًا و کرہًا اس نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے ہے اور ہر ایک کی گردش اسی محور کے گرد ہے۔

یعنی وہ نظامِ زندگی جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے، دین اللہ کہلاتا ہے اور کائنات کی ہر شے اسی دین کو اختیار کئے ہوتے ہے۔ اس نظامِ زندگی کو اختیار کرنے کا نام الاسلام ہے۔ یہی اندازِ زندگی صحیح منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

(۳/۸۴)

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور نظامِ زندگی چاہتا ہے، تو وہ نظام کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور وہ آخر الامر نقصان اٹھائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ کائنات کی ہر شے کا دین (نظامِ زندگی) اسلام ہے۔ ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر رہی ہے۔ یہ اطاعت، ایک مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ہے جسے خدا نے تجویز کر رکھا ہے۔ ہر شے کی تگ و تاز اور جدّوجہد، خدا کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لئے ہے۔ بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ ○ (۲/۱۱۶) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب خدا کے تجویز فرمودہ پروگرام کی تکمیل کے لئے مصروفِ عمل ہے اور ہر ایک نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اسی مقصد کے لئے محفوظ اور وقف کر رکھا ہے۔ " قَانِتُوْنَ " کا لفظ بڑا معنی خیز ہے۔ " سِقَاءٌ قَنِيْتٌ " اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہ ہونے دے اور اسے برمحل صرف کرنے کے لئے روک کر رکھے۔ اشیائے کائنات میں لامحدود قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ ایک سورج کی توانائی ہی کو دیکھئے۔ وہ حرارت اور روشنی کا کیسا عظیم (RESERVOIR) ہے لیکن کیا مجال جو اپنی توانائی کی ایک رتی بھی، اس مقصد کے علاوہ کسی اور مقصد میں صرف کر جائے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس کے ذمے ایک فریضہ عائد کر دیا گیا ہے اور وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں رات دن سرگرداں ہے اسے عربی میں " تَسْبِيْحٌ " کہتے ہیں۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۵۷/۱) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب نظامِ خداوندی کی تکمیل میں پوری شدت اور تیزی سے سرگرم عمل ہے۔ اس خدا کے نظام کی تکمیل میں جو بڑی قوتوں اور عمدہ تدبیروں کا مالک ہے۔ نظامِ خداوندی کا یہی وہ دھاگہ ہے، جس میں اس نے اشیائے کائنات کے " تسبیح کے دانوں " کو اس حسن و خوبی سے پرو رکھا ہے کہ کوئی ذرا ادھر اُدھر نہیں ہٹ سکتا۔

تسخیرِ کائنات

ان عظیم عناصر کو اس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھنے سے مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے کام لے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳)

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کے لئے قانون کی زنجیروں سے مسخر کر رکھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ج

اللہ وہ ہے جس نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ وہ بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے پھل پیدا ہوتے ہیں جو تمہارے لئے سامانِ زیست ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ج

اس نے تمہارے لئے جہازوں کو قانون کی زنجیروں میں مسخر کر رکھا ہے جو اس کے قانون کے مطابق تیرتے پھرتے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ج اور اس نے تمہارے لئے دریاؤں کو بھی قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ج کشتیاں، سمندر اور نہریں ہی نہیں، اس نے تمہارے لئے سورج اور چاند تک کو قانون کے حلقوں میں باندھ رکھا ہے اور وہ مسلسل اور متواتر چل رہے ہیں۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ج (۱۴/۳۲-۳۳) اور اسی طرح اس نے دن اور رات کو تمہارے فائدے کے لئے ایک نظام کے تابع رکھ چھوڑا ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا، تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

کائنات کی طرف وحی

وہ قوانین، جن کے مطابق اشیائے کائنات نے اپنے فرائض کو سرانجام دینا ہے، ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیے گئے ہیں انہی کو قوانینِ فطرت (LAWS OF NATURE) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ وحیِ خداوندی ہے جو ان میں سے ہر ایک کی طرف براہِ راست ہوتی ہے۔ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲) اور اس نے ہر سماء (بلندی) میں اس کے قانون کو وحی کر دیا اور اسی طرح ارض میں بھی بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا (۹۹/۵) یہی وہ وحی ہے۔

جس کی رُو سے کائنات کی ہر شے اپنی اپنی صلوٰۃ اور تسبیح سے واقف ہے۔ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَ تَسۡبِیۡحَہٗ ط (۲۴/۴۱) ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائضِ زندگی کیا ہیں اور یہ بھی کہ ان کی ادائیگی کے لئے اس کے دوائرِ تگ وتاز کون سے ہیں۔ اسی کو خدا نے اپنی طرف سے عطا کردہ ہدایت یا راہ نمائی سے تعبیر کیا ہے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ رَبُّنَا الَّذِیۡۤ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (۲۰/۵۰) ہمارا نشوونما دینے والا وہ ہے جس نے ہر شے کو تخلیقی پیکر عطا کیا، اسے پیدا کیا اور پھر اسے وہ راہ نمائی عطا کر دی جس کے مطابق اس نے سفرِ زندگی طے کرنا ہے۔ اشیائے کائنات میں خدا کی یہ راہ نمائی کس محیرّ العقول انداز سے کارفرما ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنہوں نے ان چیزوں کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے میں اپنی عمریں صرف کی ہیں۔ ان کے مشاہدات کے نتائج ایسے تحیّر انگیز ہیں کہ انہیں دیکھ کر انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

اس راہ نمائی کی مثالیں

(مثلاً) یورپ اور شمالی افریقہ کی جھیلوں اور ندیوں میں ایک مچھلی پائی جاتی ہے جسے ایل (EEL) کہتے ہیں۔ ایک خاص عمر کو پہنچ جانے کے بعد یہ مچھلیاں اپنے اپنے مساکن سے باہر نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ رات کی تاریکیوں میں دلدل اور گھاس میں سے گزرتی ہوئی ایک سے دوسری جھیل اور ندی میں پہنچتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بحر اطلانٹک میں جزیرہ برموڈا کے قریب پہنچ جاتی ہیں، جہاں سمندر بہت گہرا ہے۔

دوسری طرف امریکہ کی ایل مچھلیاں بھی اسی طرح پہنچ جاتی ہیں۔ یہ مچھلیاں گہرے سمندر میں انڈے دے کر مر جاتی ہیں۔ ان کے بچے انڈوں سے نکلنے کے بعد اپنے اپنے آبائی وطن کی طرف چل نکلتے ہیں اور انہی راستوں سے ہوتے ہوئے، جن سے ان کے ماں باپ گزرے ہیں، اپنی اپنی جھیلوں اور ندی نالوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے نہ کوئی راستہ بھولتا ہے اور نہ ہی کسی غلط جگہ پہنچتا ہے۔ اس سفر میں انہیں تین سال کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔ مشاہدہ کرنے والے ان کے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن یہ راز کسی پر نہیں کھلتا کہ وہ کون سی قوّت ہے جو ان انڈوں سے پیدا ہونے والے بچوں کی جن کے ماں باپ ان کی پیدائش سے پہلے مر چکے تھے، ان کے آبائی وطن کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور وہ ہزاروں میل کی مسافت میں کہیں راستہ نہیں بھولتے۔

یہی کیفیت سامن مچھلی کی ہے۔ ہر لوزائیدہ سامن کچھ وقت کے لئے سمندر میں جا کر رہتی ہے۔ پھر واپسی پر سمندر سے اس دریا میں پہنچتی ہے جس سے وہ سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ اس دریا سے اس معاون ندی کا رُخ

کرلیتی ہے جو اسے اس دریا میں لائی تھی اور اس ندی سے پھر اپنی مرزبوم تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر آپ اسے راستے میں پکڑ کر کسی غلط ندی میں چھوڑ دیں تو وہ آگے بڑھنے کے بجائے فوراً پیچھے کی طرف لوٹ کر بڑے دریا میں پہنچ جاتی ہے اور وہاں سے اپنی صحیح ندی میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ اس میں کبھی غلطی نہیں کرتی۔

یہی کیفیت مہاجر پرندوں (MIGRATORY BIRDS) کی ہے۔ بحر الکاہل میں بہت سے جزیرے ہیں جہاں خاص قسم کے پرندوں کے سوا کوئی جاندار نہیں ملتا۔ یہ پرندے سردی کے موسم میں جزائر ہوائی (HAWAZ) میں چلے جاتے ہیں۔ انہیں یہ دو ہزار تین سو میل کا سفر، سمندر کے اوپر، ایک ہی اڑان میں کرنا ہوتا ہے۔ وہ وہاں انڈے دے کر واپس آجاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ان کے بچے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے ماں باپ کے "نقش قدم" پر (جن کا کوئی نشان نہیں ہوتا اور جنہیں انہوں نے دیکھا تک نہ تھا) سیدھے اپنے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ فضا کی پہنائیوں میں سمندر کے اوپر، وہ کون سے نشانات راہ ہیں جو ان کی راہ نمائی، ان کے مستقر کی طرف کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ راہ نمائی وہی ہے جو خدا کی "وحی" نے ان کے اندر رکھ دی ہے — رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ اسی سلسلہ میں ایک مبصر مسٹر (MR C.T HUDSON) نے اپنی کتاب (BIRDS AND MAN) میں اس قسم کے مہاجر پرندوں کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان مہاجرین کا قافلہ اڑ گیا تو پیچھے دو پرندے رہ گئے۔ ان میں سے ایک زمین پر چلتا تھا اور دوسرا اس سے ذرا آگے فضا میں اڑتا تھا۔ اڑنے والا پرندہ، تھوڑی دور جا کر، پیچھے مڑ کر دیکھتا، چلنے والے پرندے کو آواز دیتا لیکن جب وہ اپنی رفتار میں تیزی نہ کرتا، تو وہ بھی نیچے اتر آتا تا آنکہ وہ اس کے ساتھ آملتا۔ وہ پھر اڑتا — دونوں اس طرح افتاں و خیزاں، اپنے قافلے کے رُخ پر چلے جاتے۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک نر، اور دوسری مادہ ہے۔ مادہ کا ایک بازو ٹوٹا ہوا ہے اور وہ اڑنے کے قابل نہیں۔ نر اسے تنہا چھوڑ کر اکیلا نہیں جانا چاہتا، اس لئے کہ وہ اس کی رفیقۂ حیات ہے۔ (انسان کا بچہ ہوتا تو اپنی پَر شکستہ بیوی کو لات مار کر الگ کر دیتا اور خود دوسری لے آتا)

بہرحال یہ ضمنی بات تھی۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ کائنات میں ہر شے کو خدا کی طرف سے راہ نمائی ملتی ہے اور وہ بلا چون و چرا، اس راہ نمائی کا اتباع کرتی چلی جاتی ہے۔ اس میں سے کسی کو اس راہ نمائی سے مجالِ انکار یا رائے سرکشی

۱؎ اس کو توبہ کہتے ہیں۔

نہیں۔ اسی سے یہ عظیم القدر سلسلۂ کائنات اس حسن و خوبی سے سرگرم عمل ہے کہ اس میں کہیں کوئی سلوٹ،

کوئی سلوٹ یا جھول نہیں

کہیں کوئی جھول نظر نہیں آتی۔ مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِن تَفٰوُتٍ[1]۔ تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں، کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِن فُطُورٍ ــــ ذرا نگاہ کو پلٹ کر دیکھو تو سہی۔ کیا کہیں کوئی نقص، کوئی شگاف، کوئی عیب نظر آتا ہے؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ۔ ایک بار نہیں عقابِ نگاہ کو بار بار، کائنات کی پہنائیوں میں چھوڑ دو۔ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ۔ اُسے کہیں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا اور وہ خاسر و نامراد ہار تھک کر کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔ (۶۷/۳-۴)

یہ اس لئے کہ ساری کائنات دینِ خداوندی ــــ الاسلام ــــ کے مطابق چل رہی ہے۔ اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس میں کوئی خلل، کوئی فساد، کوئی فتنہ، کوئی فتور ہو۔ فتنہ و فساد تو غیر اسلامی زندگی میں ہوتا ہے۔ اسلامی نہجِ زندگی میں فتنہ و فساد کا کیا کام!

جب عالمِ موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانونِ زندگی اور ضابطۂ حیات متعین ہے تو کیا انسان جو اس

انسانی دنیا

خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی اور نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے، اس ضبط و آئین سے مستثنیٰ ہوگا؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ نظامِ کائنات کے خلاف ہوگا۔ جب کائنات کی ہر شے ایک نہج و اسلوب کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص ضابطۂ حیات کے مطابق دنیا میں رہے۔ یہ طریقِ حیات اور نہجِ زندگی وہی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی الاسلام کہہ کر پکارا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ــــ (۳/۸۲) انسانوں کے متعلق بھی کہا گیا کہ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ .... (۲/۱۱۲) اشیائے کائنات کے متعلق کہا گیا تھا کہ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ (۲/۱۱۶) انسانوں سے کہا گیا کہ وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ۔ (۲/۲۳۸)

انسان کی زندگی کے دو حصے یا دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح وہ ہے جسے طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE)

جسمانی زندگی

کہا جاتا ہے۔ یہ اس کے جسم کی زندگی ہے اور اس پر وہی قوانین نافذ ہیں، جن کے ماتحت حیوان زندگی بسر کرتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، افزائشِ نسل

وغیرہ ـــــ پانی جس طرح ایک بیل کی پیاس بجھاتا ہے، اسی طرح انسان کے لئے وجہِ تسکین ہوتا ہے۔ اچھی غذا جس طرح ایک گھوڑے کی پرورش کرتی ہے، اسی طرح انسان کے لئے بھی فربہی اور تقویت کا موجب بنتی ہے۔ سنکھیا جس طرح ایک کُتّے کو ہلاک کر دیتا ہے، اسی طرح انسان کو بھی مار دیتا ہے۔ یہ بھی قوانینِ خداوندی ہیں، جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو طبیعی زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی اس کے لئے مضرّت رساں ہوتی ہے لیکن انسانی زندگی کی دوسری سطح وہ ہے جو اسے حیوانات سے یکسر الگ اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اگر پہلی سطح کی زندگی کو اس کی حیوانی زندگی (ANIMAL LIFE) کہا جاتے تو اس دوسری سطح زندگی کو اس کی انسانی زندگی (HUMAN LIFE) سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس کی حیوانی سطح کا مدار اس کے طبیعی جسم پر ہے لیکن اس کی انسانی زندگی کا قیام اس کی ذات سے وابستہ ہے جسے ـــــ

انسانی زندگی

(HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کے جسم کی پرورش کے لئے قوانین مقرّر ہیں، اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول و ضوابط متعیّن ہیں۔ اگر ان اصول و ضوابط کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہو جائے تو جسم کی موت کے بعد بھی انسان، زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ اصول و قوانین، جن کے مطابق انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے، مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ یہ انسان کو، خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملے ہیں لیکن اِس وحی اور اُس وحی کے طریق میں بنیادی فرق ہے جو اشیائے کائنات کی طرف کی جاتی ہے اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

انسانی ذات کی بنیادی خصوصیّت، اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ یہی وہ خصوصیّت ہے، جس سے انسان حیوانات سے متمیّز ہوتا ہے اور جو اس کے لئے باعثِ صد شرف و افتخار ہے۔ اسی اختیار و ارادہ کا نتیجہ ہے کہ انسان کی طرف وحی بھیجنے کا طریق الگ تجویز کیا گیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بے جان اشیائے کائنات میں سے ہر شئے کے اندر اور جانداروں کی ہر نوع کے ہر فرد کے اندر، پیدائشی طور پر وہ راہ نمائی رکھ دی گئی ہے، جس کے متعلق انہوں نے اپنی زندگی بسر کرنی ہے۔ بالفاظِ دیگر، یہ چیز ان کی جبلّت میں داخل ہے اور جبلّت کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پیروی مجبوراً کی جائے۔ اس سے گریز اور مفر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ (انسان کے علاوہ) کائنات کی ہر شئے ان قوانین کی اطاعت از خود کئے جا رہی ہے جو اس کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کر دیئے گئے ہیں۔ اگر انسانی ذات سے متعلق اصول و قوانین بھی، ہر انسانی بچّے کے اندر، پیدائش کے ساتھ ہی ودیعت کر دئے جاتے، تو انسان بھی ان قوانین کی اطاعت پر مجبور ہو جاتا اور یہ چیز اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کے یکسر منافی ہوتی۔

اس کے لئے مشیّت نے یہ پروگرام مقرر کیا کہ یہ قوانین انسانوں میں سے ایک منتخب ہستی کو بذریعہ وحی دے دیے

سلسلۂ نبوّت

جاتے اور اس سے کہہ دیا جاتا کہ اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ چاہے انہیں اختیار کرلیں اور چاہے تو ان سے انکار کر کے اپنے لئے کوئی اور راستہ تجویز کرلیں لیکن اتنا سمجھ لیں کہ ان قوانین کے اتباع سے انہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہوجائیں گی اور ان کی خلاف ورزی کرنے سے وہ تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ مشیّت کی اس اسکیم کا نتیجہ ہے کہ جہاں، کائنات کی تمام اشیاء قوانینِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہیں، انسانوں میں سے بعض ان قوانین کو مانتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ۔

کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب قوانینِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت اور جاندار۔

لیکن جہاں تک انسانوں کا تعلق ہے، ان میں سے بعض ان قوانین کے سامنے جھکتے ہیں اور بعض ان سے انکار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر تباہی مسلّط ہوجاتی ہے۔ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَكَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ط

اختیار و ارادہ

.... (۲۲/۱۸) یہی وجہ ہے کہ جہاں (جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے) اشیائے کائنات کے متعلق کہا ہے کہ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (۳/۸۲) یہ سب طوعاً و کرہاً قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں۔ انسانوں کے متعلق کہا کہ

بَلٰی ق مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ص وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ع (۲/۱۱۲)

ہاں! جو کوئی ان میں سے اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکادے اور حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرے تو اس کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق ملے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔

دوسرے مقام پر اشیائے کائنات کے متعلق کہا کہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۲/۱۱۶) سب اس کے قوانین کی اطاعت

کرتی ہیں لیکن انسانوں سے کہا گیا کہ قُوْمُوْا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ (۲/۲۳۸) تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو۔ اسی کو حسین ترین نظامِ زندگی کہا گیا، یعنی انسانوں کا برضا و رغبت، بطیبِ خاطر، اپنے اختیار و ارادہ کو کام میں لا کر علیٰ وجہ البصیرت، قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا۔ وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ .... (۴/۱۲۵) انسان کو یہ اختیار طبیعی دنیا میں بھی حاصل ہے اور انسانی دنیا میں بھی۔ مثلاً پانی کے لئے قانون یہ مقرر ہے کہ اگر اس پر کوئی خارجی دباؤ نہ ہو تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ زمینیں، ندی کے نشیب کیطرف بھی ہوتی ہیں، فراز کی طرف بھی۔ جو کسان اپنا کھیت نشیب کی طرف بناتا ہے، وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتا ہے یا یوں کہیئے کہ وہ اپنی کوششوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے اور اس کا پھل پاتا ہے۔ یہ قوانین چونکہ انسان کی حیوانی سطح سے متعلق ہیں، اس لئے یہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

طبیعی زندگی کے مفاد

وہ لوگ جو نہ انسانی ذات کو تسلیم کریں، نہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھیں، نہ مستقل اقدار کو مانیں اور زندگی صرف اس دنیا کی طبیعی زندگی کو سمجھیں، وہ بھی اگر ان قوانین کی اطاعت کریں تو انہیں ان کے نتائج اسی طرح ملیں گے، جس طرح ان لوگوں کو جو مذکورہ بالا تمام امور پر یقین رکھیں۔ قرآنِ کریم نے اوّل الذکر طبقہ کو صرف "حیات الدنیا" کے ماننے والے اور دوسرے طبقہ کو "دنیا اور آخرت" دونوں کے ماننے والے قرار دیا ہے۔ پہلے طبقہ کی ساری کوششیں دنیاوی مفاد کے حصول میں صرف ہو جاتی ہیں اور ان میں انسانی اقدار کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ ہیں، جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

> فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (۲/۲۰۰)
>
> لوگوں میں وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں سب کچھ دنیاوی زندگی میں مل جائے۔ ان کا اُخروی مفاد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔
>
> وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱)
>
> اور وہ لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں اس دنیا کی خوشگواریاں بھی نصیب ہوں اور حیاتِ اخروی کی خوشگواریاں بھی۔

یہ لوگ قرآنِ کریم کی اصطلاح میں "مومن" کہلاتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو خدا کے مقرر فرمودہ قوانینِ طبیعی کی بھی اطاعت کرتے ہیں اور مستقل اقدار کی نگہداشت بھی۔ ان کے برعکس، جو لوگ صرف قوانینِ طبیعی کو تسلیم کرتے ہیں اور وحی کی رُو

سے عطا شدہ مستقل اقدار کو نہیں مانتے' انہیں کافر۔ یعنی نہ ماننے والے۔ کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قوانینِ طبیعی کا ماننا اور ان کے مطابق کوشش کرنا' مومن اور کافر دونوں کے لئے ضروری ہے۔ جو بھی ان کے

مومن و کافر

مطابق کوشش کرے گا' وہ ان کے نتائج سے بہرہ یاب ہوگا۔ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○

جو کوئی اس طبیعی زندگی کے مفادِ عاجلہ چاہتا ہے' ہم اسے اپنے قانونِ مشیّت کے مطابق' یہ مفاد دے دیتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تباہ و برباد ہوتا ہے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○

اور جو (دنیاوی مفاد کے ساتھ) مستقبل کے مفاد بھی چاہتا ہے اور اس کے لئے پوری پوری کوشش کرتا ہے اور خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے تو ان لوگوں کی کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتی ہیں۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۱۸-۲۰)

ہم دونوں گروہوں کو ان کی کوششوں کے مطابق بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ ہماری عطا کردہ نعمتوں کا دروازہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ ہم نے ان کے سامنے کوئی بند نہیں لگا دیا کہ فلاں لوگ اس کے اندر آسکیں گے اور فلاں نہیں۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا

قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (۴۵/۱۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے' سب کو خدا نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے' تو اس میں خطاب کسی خاص گروہ سے نہیں' خطاب تمام انسانوں

سے ہے۔ جو قوم بھی غور و فکر سے کام لے کر فطرت کی قوّتوں کو اپنے کام میں لائے گی، وہ ان سے متمتّع ہو جائے گی۔

مومن اور کافر کا فرق

مومن اور کافر کا فرق اس سے آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ کافر فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کرکے، انہیں اپنے فیصلوں کے مطابق صرف کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہیوں اور بربادیوں کا وہ جہنّم ہے جس میں اس وقت دنیا مبتلا ہے۔ جس قدر فطرت کی قوّتوں کی تسخیر بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر اس جہنّم کی آگ میں وسعت اور شدّت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے لیکن مومن فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کرکے، انہیں خدا کی متعیّن فرمودہ مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتا ہے جس سے یہ دنیا جنّت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدود اللہ کے اندر رہنا کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنی صلاحیّتوں اور فطرت کی قوّتوں کو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے صرف کرنا، جنھیں خدا نے تمام نوعِ انسان کے عالمگیر مفادِ کُلّی کو سامنے رکھ کر متعیّن کیا ہے۔

مثلاً جب ''قومِ کافر'' فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کرتی ہے تو وہ انہیں اپنے مفاد اور دوسری اقوام کی تخریب کے لئے استعمال کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مختلف اقوامِ عالم ان قوّتوں کو اپنے اپنے مفاد اور دوسروں کی تخریب کے لئے استعمال کریں گی، تو اس سے دنیائے انسانیّت میں عالمگیر فساد برپا ہو جائے گا لیکن جب ''قومِ مومن'' ان قوّتوں کو مسخّر کرے گی، تو وہ انہیں تمام نوعِ انسان کی پرورش اور نشو و نما کے لئے صرف کرے گی، کیونکہ ربوبیّتِ عالمینی ایک مستقل قدر ہے جسے یہ ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتی۔ یا مثلاً جب حکومت ''قومِ کافر'' کے ہاتھ میں آئے گی، تو وہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرے گی، اسے مختلف طبقات میں تقسیم کردے گی، جس سے غریب، غریب تر، اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جائیں گے۔ عدل و انصاف مٹ جائے گا اور تمام فیصلے حکمران طبقے کے مفاد کے ماتحت ہوں گے۔ لیکن جب یہی حکومت، قومِ مومن کے ہاتھ میں آئے گی، تو وہ معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کرے گی۔ تمام افرادِ معاشرہ کے لئے سامانِ زیست اور اسبابِ نشو و نما ضرورت کے مطابق مہیا ہوں گے۔ ہر انسان کی بہ حیثیتِ انسان عزّت و تکریم ہوگی۔ ہر معاملہ کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ اس میں نہ کسی کی رعایت ہوگی نہ کسی کے خلاف زیادتی، اس لئے کہ ان تمام امور کے لئے خدا کی طرف سے دیئے ہوئے اصول و قوانین پر ان کا ایمان ہوگا اور انہی کے مطابق زندگی بسر کرنا ان کا نصب العینِ حیات۔ اس سے جہاں اس دنیا میں جنّتی معاشرہ قائم ہو جائے گا، اس کے ساتھ ان کی اپنی ذات کی نشو و نما ایسے انداز سے ہوتی جائے گی، جس سے وہ مرنے کے بعد کی زندگی میں ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں گے، یعنی یہاں بھی جنّت وہاں بھی جنّت۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی نشو و نما کا راز، نوعِ انسان کی عالمگیر ربوبیّت اور نظامِ عدل و احسان میں پوشیدہ ہے۔

اسلام کیا ہے

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اسلام نام ہے طبیعی دنیا سے متعلق قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اور وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار و اصولِ حیات کے مطابق زندگی۔ بالفاظِ دیگر، فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کر کے، انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف میں لانا اسلام ہے۔

اب ہمارے سامنے تین قسم کے گروہ آ گئے۔

(۱) پہلا گروہ ان لوگوں کا جو قوانینِ فطرت کی متابعت سے (جسے فزیکل سائنس کہتے ہیں) کائناتی قوّتوں کو مسخّر کر لیتے ہیں لیکن مستقل اقدار پر ایمان نہیں رکھتے۔ انھیں دنیا کے مادی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ان کا معاشرہ جہنّمی ہوتا ہے اور جن لوگوں کا یہاں معاشرہ جہنّمی ہو، ان کا مستقبل بھی جہنّمی ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ ان لوگوں کا جو فزیکل سائنس کی رُو سے فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کر لیتے ہیں اور پھر انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ان کی زندگی یہاں بھی جنّتی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی جنّتی۔

(۳) تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو فطرت کی قوّتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی موجودہ دنیا کی زندگی، ذلّت و خواری اور محتاجی و کس مپرسی کی زندگی ہوگی۔ وہ سامانِ زیست تک کے لئے دوسری قوموں کے دست نگر ہوں گے۔

اس سے یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ اگر یہ گروہ، خدا، وحی، آخرت پر ایمان کا مدعی ہو تو کیا ان کی اُخروی زندگی کامیاب و کامران ہو جائے گی؟ اس کا جواب واضح ہے۔ خدا، وحی، آخرت، یا مستقل اقدار پر

دنیا اور آخرت

ایمان کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کی قوّتوں کو مسخّر کر کے انہیں مستقل اقدار کے مطابق صرف کیا جائے۔ اب جو قوم فطرت کی قوّتوں سے محروم ہے اس کے لئے ان قوّتوں کے صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا خدا۔ وحی ۔ آخرت ۔ مستقل اقدار وغیرہ پر اس کا ایمان محض لفظی دعویٰ ہے جو کبھی عمل میں نہیں آتا اور جو ایمان عمل میں نہیں آتا، وہ اپنے نتائج کیا پیدا کرے گا۔ یہ خیال غلط ہے کہ اس دنیا میں یہ لوگ خواہ تباہ حال ہی کیوں نہ ہوں، ان کی عاقبت بہرحال سنور جائے گی۔ یہ خیال رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جو انسانی ذہن کی اپنی اختراع ہے۔ اس سے انسان اس فریب میں مبتلا رہتا ہے کہ یہاں کی تباہ حالی اور زبوں حالی کا عاقبت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ جو یہاں، جتنا زیادہ زبوں حال ہوگا، وہ عاقبت میں اتنا ہی خوش بخت ہوگا۔ قرآنِ کریم اس کی کھلے الفاظ میں تردید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس قوم پر اس دنیا

میں مادی سامانِ زیست کے دروازے نہیں کھلتے، اس کی عاقبت کبھی سنور نہیں سکتی۔ وہ کھلے الفاظ میں بتاتا ہے کہ
وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا ۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے
اس کی معیشت تنگ ہو جاتی ہے۔ یہ یہاں کی بدحالی ہے۔ وَنَحْشُرُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَعْمٰی۔ (۲۰/۱۲۴)
اور اسے ہم قیامت میں بھی اندھا اٹھائیں گے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قوانینِ فطرت بھی خدا ہی کے متعین کردہ قوانین
ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے، یا ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔ قرآنِ کریم کا ایک بڑا حصّہ
ان قوانین کی اہمیّت پر زور دیتا ہے۔ اگر ہم قرآنِ کریم کے اس حصّے سے انکار کرتے ہیں تو دوسرے حصّے کا زبانی
اقرار ہمیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ
بِبَعْضٍ ۔ کیا تم ایسی روش اختیار کرنا چاہتے ہو کہ قوانینِ خداوندی کے ایک حصّے پر ایمان رکھو اور دوسرے
حصّے سے انکار کرو۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ .... (۲/۸۵) جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا
نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اسے اس دنیا میں بھی ذلّت و خواری نصیب ہوگی اور وہ قیامت میں شدید ترین
عذاب میں مبتلا ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ قوانینِ خداوندی کے ایک حصّے سے انکار کرنے اور دوسرے حصّے پر ایمان رکھنے
کا نتیجہ صرف اسی دنیا کی ذلّت و خواری نہیں بلکہ آخرت کی تباہی اور بربادی بھی ہے۔ یہ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا
جا چکا ہے) دوسرے حصّے (یعنی مستقل اقدار) پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ اسے پہلے حصّے (دنیاوی معاشرہ) میں
عملاً نافذ کیا جاتے۔ قرآنِ کریم کے احکام و قوانین 'دنیاوی زندگی کو وحیٔ الٰہی کے مطابق صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے
ہیں۔ حتیٰ کہ صلوٰۃ جیسی "عبادت" بھی اسی حقیقت کی یاد تازہ کرانے اور اس آرزو کو بیدار کرنے کے لئے ہے کہ ہم زندگی
کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کی محکومیّت اختیار کریں گے، ہم اس کے قوانین کے سامنے جھکیں گے۔ لہٰذا دنیاوی
زندگی کو قابلِ اعتنا نہ سمجھنا اور خیال کرنا کہ ہم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کر رہے ہیں' اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔
یاد رکھئے! جسے اس دنیا کی خوشگواریاں حاصل نہیں یا وہ ان کے حصول کی کوشش نہیں کرتا، وہ قوانینِ خداوندی کی
اطاعت نہیں کرتا اور اسی لئے اسے اس دنیا کی خوشگواریاں بھی حاصل نہیں ہو سکتیں۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا
حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً ــــــ مومن کا صحیح شعارِ زندگی ہے اور جس روش کا نتیجہ یہ نہیں' وہ اسلام
نہیں' کچھ اور ہے۔ ایمان و عملِ صالح کا لازمی نتیجہ اس زمین کی سرفرازی و سربلندی' حکومت و سطوت ہے۔
(۲۴/۵۵) یہ خدا کا اٹل وعدہ ہے۔ جس کی دنیا خراب ہے اور وہ اس خرابی کو دُور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اس

کی آخرت بھی تباہ و برباد ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا جو آج جگر سوز و خود افروز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

دین اس لئے آتا ہے کہ وہ انسان کے دنیاوی معاملات سنوار دے۔ انہی معاملات کے سنورنے سے اس کی عاقبت سنورتی ہے۔ جس قوم کے دنیاوی معاملات سنورے ہوئے نہ ہوں اور وہ عالم انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات کو سنوارنے کی فکر نہ کرے، سمجھ لیجئے کہ اس قوم کی عاقبت سنوری ہوئی نہیں۔ دین ایک ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جو انسانی زندگی میں حُسن پیدا کر دیتا ہے۔ آپ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے۔ یہاں سے وہاں تک ایک سلسلۂ صید و صیّاد نظر آئے گا، جس میں ہر فرد اور ہر قوم کی کوشش یہ ہوگی کہ وہ دوسرے فرد اور دوسری قوم کو اپنا شکار بنالئے۔ اس

دین کی غایت

کے لئے طرح طرح کی تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔ قسم قسم کے جال بچھائے جائیں گے۔ کوئی ہمرنگِ زمین، کوئی مقدّس پردوں کی اوٹ میں۔ ہر طاقتور کمزوروں کا خون چُوسے گا۔ ہر زیرک، دوسروں کو بے وقوف بنا کر ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرے گا۔ یوں تو ان شکاریوں کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اگر ان کی اصولی تقسیم کی جائے تو تین بڑی بڑی شاخیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ مستبد حکومت ــــ باطل مذہبی پیشوائیت اور خون آشام نظامِ سرمایہ داری ــــ دین، ان تینوں لعنتوں کو مٹا کر ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے، جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم اور محتاج نہ رہے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس میں ہر فرد وہ کچھ بن سکے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔ غلط معاشرے میں، جوہرِ انسانیت کے کروڑوں غنچے بن کھلے مرجھا جاتے ہیں لیکن دین کی رُو سے قائم کردہ معاشرے میں ایک فرد بھی ایسا نہیں رہتا، جس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر برومند نہ ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا انقلاب ہے جو عالمِ انسانیت میں دین کی رُو سے برپا ہوتا ہے۔ وہ پہلے اس معاشرہ کو ایک خطۂ زمین میں متشکّل کرتا ہے اور پھر اس کے دائرے کو وسیع کرتا چلا جاتا ہے تاکہ یہ پوری عالمگیر انسانیت کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے پورے کے پورے صفحۂ ارض سے، سلب ونہب اور ظلم و جَور کو مٹا کر، عدل و احسان کا نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ساری نوعِ انسان کو ایک عالمگیر برادری بنا کر اسے اخوّت کے رشتے میں پرو دیتا ہے۔ یہ ہے دین کا مقصود، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

نبوّتِ محمدیہؐ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایسی ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ قائم کی جائے، جس کی تشکیل

اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوّتِ محمدیہؐ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوع انسان کو باوجود شعوب و قبائل اور الوان و اَلسِنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، انہیں ان تمام آلودگیوں سے منزّہ کیا جاتے جو زمان، مکان، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیّل عطا کیا جاتے، جو اپنے وقت کے ہر لمحہ میں ابدیّت سے ہمکنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ، یہ ہے نصب العین ملّتِ اسلامیہ کا (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے نام)

یہ تھا وہ اسلام جسے نبیؐ اکرمؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنے بے مثال عمل سے اسے متشکل کر کے دکھا دیا۔ اس "بے مثال عمل" کا مفہوم یہ ہے کہ حضورؐ اس دین کو لوگوں کے سامنے علی وجہ البصیرت پیش کرتے تھے۔ اس کی غایت اور حکمت کو دلائل و براہین سے سمجھاتے تھے۔ مخالفین کے اعتراضات کا علم و دانش کی رُو سے جواب دیتے تھے۔ انہیں اس پر تدبّر و تفکّر کی رُو سے غور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ جو اس طرح دل و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اسے بہ طیبِ خاطر قبول کرتا تھا، اسے اپنی جماعت میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ تھی وہ جماعت جس نے دین کا معاشرہ متشکل کیا۔ اس جدید معاشرہ نے چند دنوں میں ایسے انسانیّت ساز درخشندہ نتائج پیدا کئے جو اس کی صداقت کا زندہ ثبوت بنتے چلے گئے۔ اس طرح اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور دنیا نے ایک ایسا نظام دیکھ لیا، جس میں نہ کوئی انسان دوسرے

اسلامی معاشرہ

انسان کا محکوم تھا نہ محتاج۔ ہر فرد قوانینِ خداوندی کے حدود کے اندر رہتے ہوتے، سرفرازی اور آزادی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہی وہ آزادی ہے، جس سے اس کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اس انداز سے ہو جاتی تھی کہ وہ اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ اسی کو عاقبت سنورنا کہتے ہیں۔ دین کے اس نظام میں، نہ ملوکیّت کا کوئی تصوّر تھا، نہ سرمایہ داری کا، نہ خانقاہیّت کا کوئی دخل تھا نہ مذہبی پیشوائیت کا۔ احترامِ آدمیّت اس کا شعار تھا اور شرفِ انسانیت، سوسائٹی میں مدارج اس کا معیار۔ اس میں، (حضرت عمرؓ کے الفاظ میں) بڑے سے بڑا طاقتور کمزور ترین انسان تھا، جب تک اس سے مظلوم کا حق نہ دلوا دیا جاتے، اور کمزور سے کمزور انسان، سب سے زیادہ طاقتور تھا، جب تک اس کا چھینا ہوا حق اسے واپس نہ مل جاتے۔

یہ تھا وہ اسلام جسے خدا نے انسانوں کے لئے بطور نظامِ حیات تجویز کیا تھا لیکن اس کے بعد، اس قوم نے اس اسلام کی ایک ایک شق کو پسِ پشت ڈال دیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خودساختہ مذہب نے لے لی، جس میں ملوکیّت

سرمایہ داری، خانقاہیت، پیشوائیت، غرضیکہ وہ تمام عناصر ایک ایک کرکے آ گئے، جنہیں اسلام نے آ کر مٹایا تھا۔

بعد کا اسلام

علامہ اقبال کے الفاظ میں، اس قوم میں یہ عجیب انقلاب آیا کہ

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

ان کے دنیاوی معاملات، اربابِ حکومت نے اپنے زیرِ اقتدار لے لئے اور مذہب نام رہ گیا چند نظری عقائد اور بے جان رسومات کے مجموعے کا۔ معتقدات میں اسی قسم کی بحثیں شروع ہو گئیں (اور ان کے اختلاف پر خون کی ندیاں بہنے لگیں) کہ آدم کی روح درحقیقت خدا کی رُوح ہے یا اس سے الگ ہے۔ خدا کی صفات قدیم ہیں یا حادث۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ خدا اپنی معلومات کے خلاف بھی ارادہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ انسان اپنے اعمال کے آپ خالق ہیں یا نہیں۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ اہلِ جنت کو خدا کا دیدار ہو گا یا نہیں۔ کیا خدا کو اس کی قدرت ہے یا نہیں کہ اہلِ بہشت کی نعمتوں اور اہلِ دوزخ کے عذاب میں کمی بیشی کر سکے۔ ایمان گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں۔ عذاب و ثواب کا دیا جانا خدا کی مرضی پر ہے یا انسان اپنے عمل سے اس میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ حوضِ کوثر کی لمبائی چوڑائی کتنی ہے۔ جنت کے آبخوروں کی ضخامت کتنی بڑی ہے۔ وہاں کے انگوروں کا خوشہ کتنا کتنا بڑا ہے۔ یہ معتقدات کی بحثیں تھیں۔ مسائل اس قسم کے داخلِ تعلیم ہو گئے کہ مسواک کو مٹھی بھر پکڑنے سے بواسیر ہو جاتی ہے۔ مسواک کو چوسنے سے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ دہ دردہ (۱۰×۱۰) حوض میں آدمی کا پیشاب پڑ جائے تو وہ پاک رہتا ہے؟ کنوئیں میں چوہے کی دم کٹ کر گر جائے تو اس کا پانی کس قدر نکالنا چاہیئے؟ چوہے کا پیشاب پاک ہے یا نہیں؟ سور اگر نمک سار میں گر کر نمک بن جائے تو اسے کھا لینا چاہیئے یا نہیں؟ لونڈی کا دودھ فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

یا اس قسم کے مسائل کہ غسل، پانی کے کتنے لوٹوں سے کرنا چاہیئے۔ سر کے مسح میں ہاتھ کہاں تک پہنچنے چاہئیں۔ اگر قرأت میں ض اور ظ، ص اور س، ط اور ت میں فرق نہ کیا جائے تو نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں وغیرہ۔

یہ ہیں وہ معتقدات، نظریات اور مہماتِ مسائل جن کے حل کرنے میں قوم کی ساری توانیاں، وقت اور روپیہ صرف ہونے لگا۔ آج تک اُمت انہی مباحث میں اُلجھے چلی آ رہی ہے اور اس کا نام دین کی خدمت اور جہادِ عظیم قرار پا چکا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی آخری کتاب "ارمغانِ حجاز" میں (جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی)، ابلیس کی

ابلیس کی مجلسِ شوریٰ

مجلسِ شوریٰ کے عنوان سے ایک طویل، لیکن بڑی دلچسپ اور پُرمعنی نظم لکھی ہے، جس میں قوم کی اس حالت پر خون کے آنسو بہائے گئے ہیں۔ ابلیس

اپنے تمام مشیروں کو جمع کرکے ایک کانفرنس منعقد کرتا ہے تاکہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ ابلیسی پروگرام کو کس گوشے کی طرف سے سب سے زیادہ خطرہ ہے اور اس خطرہ کی روک تھام کس طرح کی جائے۔ لمبی چوڑی بحث کے بعد ابلیس اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمّت سے ہے　　جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

اس کے بعد وہ اپنا مطلب ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں　　ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں　　بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

وہ شرعِ پیغمبر جو ہر طاغوتی قوّت کے لئے سامانِ موت ہے۔

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر　　حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

اس کے بعد وہ مشیروں سے کہتا ہے کہ

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب　　یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

مشیروں نے پوچھا کہ اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا کہ اس کا علاج بہت سہل ہے۔ تم اس قوم کو اس قسم کے مسائل میں الجھائے رکھو کہ

ابنِ مریمؑ مر گیا یا زندۂ جاوید ہے　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے　　یا مجدّد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم　　اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دَور میں　　یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے　　تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام　　چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

تمہارے کرنے کا کام یہ ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اُسے　　پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اُسے

برادرانِ عزیز! ایک اسلام وہ تھا جسے محمد رسول اللہؐ والذین معہٗؓ نے پیش کیا تھا، جس سے اقوامِ عالم کی امامت ہمارے حصے میں آگئی تھی اور ایک اسلام ہمارا آج کا ہے، جس سے ہمارا (یعنی مسلمانانِ عالم) کا شمار دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست　　یہ مذہبِ مُلّا و نباتات و جمادات

لیکن وہ اسلام، جس نے اس وقت ہمیں وہ سرفرازیاں عطا کی تھیں، ہمارے پاس آج بھی خدا کی زندہ و پائندہ کتاب میں محفوظ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسے ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔

والسلام

شرک

(ایک درسِ قرآن)

دسمبر ۱۹۶۲ء

شرک کو اللہ تعالےٰ نے جرمِ عظیم قرار دیا ہے ــــ ایسا جُرم "جس کی بخشش نہیں ہو سکتی"۔ (۴/۴۸) سوال یہ ہے کہ شرک کیا ہے اور وہ کیوں اس قدر سنگین جرم ہے؟ شرک کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ خدا کے سوا دوسروں کی پرستش کرنا شرک ہے اور اس کی محسوس اور بیّن مثال بُت پرستی ہے ــــ اور چونکہ مسلمان بُتوں کو نہیں پوجتا، اس لئے وہ مطمئن رہتا ہے کہ میں شرک کا مرتکب نہیں ہوتا۔ یہ ہؤا شرک۔ اب رہی یہ بات کہ اسے اللہ تعالےٰ نے ایسا سنگین جرم کیوں قرار دیا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جاتا ہے کہ خدا بھلا اسے کس طرح برداشت کر سکتا ہے کہ اس کے ساتھ اوروں کی بھی پرستش کی جائے۔ یعنی اس سے چونکہ (معاذ اللہ) خدا کا کچھ بگڑتا ہے یا اس کی غیرت اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی کو اس کا ہمسر بنا دیا جائے، اس لئے وہ اس جرم کو کبھی نہیں بخشتا۔ آپ غور کیجئے کہ اس توجیہہ کی رُو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے؟

شرک کا عام تصور

حقیقت یہ ہے کہ ایک شرک پر ہی کیا موقوف ہے، خدا کی عبادت، اس کے احکام کی فرماں برداری، حقوق اللہ کی ادائیگی وغیرہ کے سلسلے میں جو عام عقیدہ ہمارے ہاں رائج ہے، اس کی رُو سے خدا کے متعلق تصور ہی یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے کچھ اپنے مقاصد ہیں، جنہیں وہ اس طرح ہم سے پورے کرانا چاہتا ہے۔ جب ہم قرآنِ کریم کی وہ آیت سنتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱/۵۶) تو اس سے ہمارے اس عقیدہ کو اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے کہ خدا کے سامنے کوئی اپنا پروگرام تھا، جس کی تکمیل کے لئے اس نے ہمیں پیدا کر کے یہ فریضہ عائد کر دیا کہ ہم اس کی عبادت کرتے رہیں۔ خدا کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ وہ اپنے کسی پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ (فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ (۳/۹۶) وہ جو احکام ہمیں دیتا ہے اس لئے نہیں کہ ان کی بجا آوری سے کچھ اس کا سنورتا ہے۔

خدا کے متعلق تصور

اور اگر ان کی تعمیل نہ کی جائے تو اس سے کچھ اس کا بگڑتا ہے۔ قطعاً نہیں۔ ان احکام کی بجا آوری سے کچھ ہمارا ہی سنورتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے۔ اس طرح خدا پر ایمان لانے سے بھی ہمارا ہی ایک عظیم مقصد حاصل ہوتا ہے اور اس سے انکار کرنے سے ہمارا ہی نقصان ہوتا ہے۔ خدا تو اس وقت بھی خدا تھا جب اسے کوئی ماننے والا نہیں تھا اور اگر آج بھی دنیا کے تمام انسان اس کی ہستی سے انکار کر دیں تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ (بلا تمثیل) سورج اس زمانے میں بھی اسی طرح روشنی دیتا تھا جب کوئی آنکھ اسے دیکھنے والی نہیں تھی اور آج اگر ساری دنیا کے انسان اپنی آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں تو اس سے سورج کا قطعاً کوئی نقصان نہیں ہوگا، خود انسانوں ہی کا نقصان ہوگا۔ لہٰذا خدا کو وحدہٗ لاشریک ماننے سے بھی خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا' نہ ہی اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنے سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ "ایک خدا" ماننے میں ہمارا ہی فائدہ ہے اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک کرنے سے ہمارا ہی نقصان۔ اور یہ نقصان اتنا بڑا ہے کہ اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ یہی مفہوم ہے اس ارشادِ خداوندی کا کہ شرک بخشا نہیں جا سکتا۔ شرک کے اس "نقصانِ عظیم" کی تفصیل تو طول طویل ہے لیکن قرآن نے اپنے مخصوص معجزانہ انداز سے اس تفصیل کو دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا۔ جب کہا کہ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا (۳/۱۵۰) جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں، ہم ان کے دلوں

شرک اور خوف

میں رعب ڈال دیں گے۔ ان پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اس لئے کہ وہ خدا کے ساتھ اسے شریک ٹھہراتے ہیں، جس کی کوئی سند خدا نے نازل نہیں کی۔ بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ شرک سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں۔

ہر کہ رمزِ مصطفیٰ فہمیدہ است — شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اس کے برعکس ایک خدا کو ماننے والے (مومنین) کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸)

ان پر کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ یعنی شرک سے خوف پیدا ہوتا ہے اور توحید کا لازمی نتیجہ بے خوفی ہے اور یہ مومن اور مشرک کا بنیادی خطِ امتیاز ہے۔ آیئے ہم قرآنِ کریم سے اس اجمال کی تفصیل دیکھیں۔

مظاہرِ فطرت کی پرستش

جب ذہنِ انسانی عہدِ طفولیت میں تھا (اور اب بھی دنیا کی بیشتر آبادی کا یہی عالم ہے) تو وہ فطرت کی مختلف قوتوں کو دیوی دیوتا سمجھ کر ان کے حضور جھکتا اور گڑگڑاتا تھا۔ بجلی چمکی اور وہ سہم کر ہاتھ باندھنے لگ گیا۔ بادل گرجا اور وہ ڈر کر سجدے میں گر گیا۔ دریا کی طغیانیوں کو دیکھا تو وہ کانپ اٹھا۔ چیچک یا طاعون جیسی وبائی بیماریاں پھوٹیں اور اس نے کسی ان دیکھی قوت کے سامنے ڈنڈوت بجا لانا شروع کر دیا۔ غرضیکہ ایک انسان تھا اور اسے چاروں طرف بلاؤں کا ہجوم نظر آتا تھا، جن سے وہ ہر وقت ڈرتا' کانپتا رہتا تھا۔ خوف' ہر طرف سے خوف' ڈر' چاروں طرف سے ڈر، یہ تھی اس وقت انسان کی زندگی۔ اس سے بچنے کے لئے اسے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا تھا کہ وہ اِن اَن دیکھی قوتوں کو "خدا" سمجھ کر انہیں راضی رکھنے کے لئے کوشش کرے۔ انہی ان دیکھی قوتوں کو اس نے محسوس شکلوں میں تراش کر بت پرستی شروع کر دی۔

انسان یہ کچھ کیوں کرتا تھا؟ اس لئے کہ وہ اپنے مقام سے آشنا نہیں تھا۔

قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳)

قرآن کا پیغام

کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، وہ سب قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے تاکہ انسان ان سے کام لے سکے۔ اس نے داستانِ آدم کے تمثیلی انداز میں بتایا کہ ملائکہ سب انسان کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ فطرت کی کوئی قوت ایسی نہیں جو انسان کے سامنے نہ جھک سکے۔ قرآن کی اس ایک انقلابی آواز نے ساجد کو مسجود اور مسجود کو ساجد بنا دیا۔ اس نے بتا دیا کہ جو انسان اپنے آپ کو فطرت کی ان قوتوں سے فروتر اور کمزور سمجھتا ہے' وہ مقامِ آدمیت سے گرا ہوا ہے۔ انسان ان قوتوں (دیوی' دیوتاؤں) کو اپنے سامنے جھکانے کے لئے آیا ہے، ان کے سامنے جھکنے کے لئے نہیں آیا۔ جو ان کے سامنے جھکتا ہے' اپنی تذلیل کرتا ہے۔ جو انہیں اپنے سے بڑا مانتا ہے، اپنے شرف اور فضیلت سے انکار کرتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھا کہ فطرت کی قوتوں کو خدا ماننے والا اور ان کے محسوس مظاہر (مٹی اور پتھر کی مورتیوں' بتوں) کے سامنے جھکنے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا' اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے۔

فطرت کی قوتوں سے آگے بڑھے تو بعض انسانوں نے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنا شروع کر دیا۔ راجہ کو

ایشور کا اوتار، سلطان کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) بادشاہوں کو خدائی اختیارات کا حامل سمجھ کر ان کے حضور گڑگڑانا شروع کر دیا۔ انہیں اَن داتا (رزق دینے والا) تصوّر کر کے ان سے ڈرنے اور کانپنے لگا۔ راجہ اور بادشاہ تو خیر پھر بھی محسوس قوّتوں کے مالک تھے، اس نے مذہبی پیشواؤں اور روحانی مقتداؤں کو قضا و قدر کے احکامات کا مالک سمجھ کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ وہ انہیں راضی رکھنے کے لئے ان کے آستانوں پر جبّہ سائی کرنے لگا اور ان کے احکام کی خلاف ورزی کے تصوّر تک سے کانپنے لگا۔ "خلافِ ورزیِ احکام" تو ایک طرف، اگر ان کی شان کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال گزرا تو سہم گیا کہ نہ معلوم اب کیا قیامت آجائے گی۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھ گیا کہ زندہ انسان تو ایک طرف، مُردوں تک کے متعلق یہ عقیدہ قائم کر لیا گیا کہ وہ بڑی قوّتوں کے مالک ہیں۔ ان کے اختیارات بڑے وسیع ہیں۔ ان کو خوش کر دینے سے انسان کی مرادیں بر آتی ہیں۔ ان کی ناراضگی سے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، جن سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔

انسانوں کی پرستش

مُردوں کی پرستش

قرآن آیا اور اس نے کہا کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو خدا بنا کر اس سے ڈرنا اور کانپنا انسانیّت کی انتہائی تذلیل ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار حاصل نہیں۔ انسان ہونے کی جہت سے سب برابر اور یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ (۷/۱۹۴) جن لوگوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ تمہارے جیسے (خدا کے) بندے ہیں۔ تم انہیں جن قوّتوں کا مالک سمجھتے ہو ان کی حیثیت مکڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں۔ مکڑی کے جالے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے لیکن صاحبِ قوّت کے سامنے ایک سیکنڈ کے لئے نہیں ٹھہر سکتا۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَوْلِیَآءَ کَمَثَلِ الْعَنْکَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا وَ اِنَّ اَوْھَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْکَبُوْتِ (۲۹/۴۱) جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو اپنا کارساز و کارفرما سمجھ لیتے ہیں، ان کی مثال مکڑی سی ہے۔ وہ ایک گھر بناتی ہے لیکن کیسا گھر؟ دنیا میں سب سے زیادہ کمزور گھر۔ انسان، جن اپنے جیسے انسانوں کو اپنا "خدا" بنا لیتا ہے، ان کی اپنی قوّت کچھ نہیں ہوتی۔ جب تک انہیں خدا مانتے رہیئے وہ خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب انہیں ایسا ماننا چھوڑ دیجئے، ان کی خدائی ختم ہو جاتی ہے۔

مساواتِ انسانیہ

ایں خدا تا سجدہ اش کردی خداست چو یکے اندر قیام آئی فناست

لہٰذا کسی انسان کو خدا بنا کر اس کے سامنے جھکنا شرفِ انسانیّت کی انتہائی تذلیل ہے اور جب زندہ انسان کے سامنے جھکنے کی یہ کیفیت ہے تو مُردہ انسان کے حضور، زندہ انسان کا جھکنا اور اس کے سامنے گڑگڑانا انسانیّت کی ایسی ذلّت ہے، جس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کو خدا بنا لینے والا خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا، اپنے ہاتھوں آپ ذلیل ہوتا ہے۔

مقامِ آدم

قرآن نے انسان سے کہا کہ تیری دنیا میں تجھ سے بلند مقام کسی کا نہیں۔ فطرت کی قوّتیں سب تیری خادم ہیں، تو ان کا مخدوم اور مسجود ہے۔ باقی رہے انسان، سو انسان ہونے کی حیثیت سے سب ایک جیسے ہیں۔

ہاں! انسان سے بلند اور بالا مقام صرف ایک ہستی کا ہے اور وہ ہے ذاتِ خداوندی، جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور خود انسان کو بھی، لیکن خدا کی ذات بھی ایسی نہیں جس سے انسان ڈرے اور سہمے۔ ڈرنا اور کانپنا اس سے

قانون والا خدا

ہوتا ہے جس کے پاس قوّت بے پناہ ہو لیکن وہ کسی قاعدے اور قانون، ضابطے اور اصول کا پابند نہ ہو۔ جس کے متعلق معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کس بات سے ناراض ہو جائے گا اور کس سے خوش، وہ کب خلعت بخش دے گا اور کب کھال کھنچوا دے گا۔ قرآن نے بتایا کہ خدا کی ذات ایسی نہیں۔ اس کی قوّتیں بے شک لامحدود ہیں لیکن وہ ان کا استعمال (معاذ اللہ) اندھا دھند نہیں کرتا۔ ان اصولوں کے ماتحت کرتا ہے جو اس نے خود وضع کیے ہیں اور جن پر وہ خود اپنی مرضی سے پابند ہے اور پابند بھی ایسا کہ ان سے کبھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹتا۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۔ (۳۵/۴۳) اور تم خدا کے اصولوں میں کبھی تغیّر و تبدّل نہیں دیکھو گے۔ اگر تم اس کے مقرّر کردہ قوانین کے مطابق کام کرتے جاؤ گے تو تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا اور اگر ان کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کے تباہ کن نتائج سے تمہیں کوئی بچا نہیں سکے گا۔ وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗٓ اِلَّا ھُوَ ج وَاِنْ یُّرِدْکَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِہٖ (۱۰/۱۰۷) اگر قانونِ خداوندی کے مطابق تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچ رہا ہو تو کوئی نہیں جو اسے رفع کر سکے اور اگر اس کے قانون کے مطابق کچھ فائدہ پہنچ رہا ہو تو کسی کی طاقت نہیں جو اس نفع کو تم تک پہنچنے سے روک لے۔

خوف سے مامون

غور کیجئے۔ جس صاحبِ اقتدار کی کیفیّت یہ ہو کہ اس نے ہر کام کے نتیجے کے لئے غیر متبدّل قوانین مرتّب کر دیئے ہوں اور اس میں کبھی، کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوتی ہو،

اس کی مملکت میں رہنے والے انسان کس قدر خوف سے مامون ہوں گے۔ انہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔ وہ ڈریں گے تو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈریں گے۔ (اس کو خَشْيَةُ اللهِ۔ یا خدا سے ڈرنا کہتے ہیں) ــ جیسے ہم آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ڈرتے ہیں۔ اگر ہم ان قوانین کی خلاف ورزی نہیں کرتے تو ہمارے لئے ڈرنے اور خوف کھانے کی کوئی بات نہیں ــــ اور چونکہ ساری کائنات میں قانون صرف خدا کا کارفرما ہے، اس میں کوئی اور قوت شریک نہیں۔ (وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ــ ۱۸/۲۶) اس لئے قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والے کو نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے نہ کسی کے سامنے جھکنے اور گڑگڑانے کی حاجت ــــ خواہ وہ فطرت کی کوئی قوت ہو یا کوئی مُردہ یا زندہ انسان، وہ کسی سے نہیں ڈرتا، کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ وہ کائنات میں سَر اُٹھا کر چلتا ہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی چوکھٹ سے مستانہ وار گزر جاتا ہے۔ اس کے شرفِ انسانیت کو کہیں ٹھیس نہیں لگتی۔ کسی مقام پر اس کی تذلیل نہیں ہوتی۔ وہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کی زندہ شہادت ہوتا ہے۔ اسے ہر طرح کا امن حاصل ہوتا ہے۔ (ایمان کا لازمی نتیجہ امن ہے۔ اس کا مادہ ہی ا۔م۔ن ہے۔ مومن وہ ہے جو خود بھی امن میں ہو اور دوسروں کو بھی امن میں رکھے۔ وہ نہ خود کسی کے سامنے جُھکے، نہ کسی کو اپنے سامنے جھکائے)

شرک کی دیگر اقسام

لوگوں کے سامنے عام طور پر شرک کی ایک ہی شکل تھی یعنی بت پرستی لیکن قرآنِ کریم کی نگہ دوررس اور جزرس نے ان محسوس پیکروں سے آگے بڑھ کر ان "خداؤں" کی بھی نشاندہی کر دی جو انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پوشیدہ اور اس کے خون کے ذرات میں حلول کردہ ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ توحید نام ہے خالصتاً قوانینِ خداوندی کے اتباع کا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کو قانون کے اتباع سے کون سی چیز روکتی ہے؟ اس کے جذبات! لہٰذا جو انسان قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے، قرآنِ کریم اس کو بھی مشرک قرار دیتا ہے۔ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰىهُ ط (۲۵/۴۳) کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا، جس نے خود اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنالیا۔ جب انسانی جذبات قوانینِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنی من مانی کرنے لگیں تو قرآن اسے شیطنت سے تعبیر کرتا ہے اور شیطان کے متعلق واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کا غلبہ مشرکین پر ہوتا ہے۔ (۱۶/۱۰۰) یعنی انسان کا، قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر خود اپنے جذبات کے پیچھے لگ جانا شرک ہے اور ایسا کرنے والا مشرک۔

اسی طرح قرآن نے فرقہ پرستی کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۱) اس لئے کہ اس میں بھی انسان، قوانینِ خداوندی کے اتباع کی بجائے اس انسان یا انسانوں کے گروہ کا اتباع کرتا ہے، جن کی طرف وہ فرقہ منسوب ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے

کہ ایسا شخص خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے اس قدر نہیں ڈرتا جس قدر اپنے فرقہ کے بانی یا اس کے نمائندے کے کسی حکم کی نافرمانی سے خوف کھاتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم کی رُو سے شرک کیا ہے؟ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنا شرک ہے۔ مثلاً

۱۔ فطرت کی قوتوں کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کی خادم اور تابعِ تسخیر ہیں۔ انہیں انسان سے بلند و بالا سمجھنا انہیں ان کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

۲۔ تمام انسان، انسان ہونے کے اعتبار سے یکساں طور پر واجب التکریم ہیں۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان کو اپنے سامنے جھکائے۔ لہٰذا کسی انسان کو یہ حیثیت دے دینا کہ دوسرے انسان اس کے سامنے جھکیں اسے اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

۳۔ "مُردہ بدستِ زندہ" عام محاورہ ہے اور حقیقت پر مبنی لیکن مُردوں کو ایسا صاحبِ اقتدار سمجھ لینا کہ وہ زندہ انسانوں کے مقدّرات کو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں، مُردہ کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دینا ہے۔

۴۔ خدا کی ذات ایسی ہے کہ انسان اس کے قوانین کا اتباع کرے اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔ اس اطاعت اور اتباع میں کسی اور کو شریک سمجھ لینا خدا کو اس کے صحیح ــــ بلند و بالا مقام سے نیچے لے آنا ہے۔

"کسی شے کو اس کے اصلی مقام پر نہ رکھنے" کو عربی میں ظلم کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم کی رُو سے سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور اسی حقیقت کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے، جب کہا ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۳۱/۱۳)

شرک ظلمِ عظیم ہے۔ اس میں کوئی شے اپنے اصلی مقام پر نہیں رہتی۔ باقی چیزوں کو تو چھوڑیئے، اس میں انسان اپنے بلند اور رفیع مقام سے اس بُری طرح گرتا ہے کہ اس کے شرف و مجد کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ دیکھئے قرآن نے اس حقیقت کو کیسے دل نشیں انداز سے بیان کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ ــــ جو اللہ سے شرک کرتا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کوئی شخص آسمان کی بلندیوں سے

شرک سے پستی

زمین کی پستیوں پر آ گرے۔ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ۔ پھر اسے کوئی (عقاب یا چیل) اُچک کر لے جائے۔ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲/۳۱)

یا جیسے گھاس کا کوئی تنکا ہو، جسے تُند و تیز ہوا اِدھر اُدھر اڑائے پھرے اور کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پھینک دے۔

آپ نے دیکھا کہ شرک انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے۔ یہ اسے اس کے مقامِ آدمیت سے گرا کر ذلت و خواری

کی انتہائی پستیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ یوں ڈرا سہما ہوا رہتا ہے جیسے چڑیا کا نوزائیدہ بچہ گھونسلے سے نیچے گر پڑا ہو اور جس تیز چنگل والے پرندے کا جی چاہے اسے اچک کر لے جائے۔ وہ اس قدر بے وزن اور بے حقیقت ہو جاتا ہے کہ ہوا کا ہر تیز و تند جھونکا اسے جدھر چاہے اڑاتے اڑاتے پھرتا ہے۔ شرک سے یہ کیفیت ہو جاتی ہے اس انسان کی جسے خالقِ کائنات نے ایسا بلند اور مستحکم مقام عطا کیا تھا۔

اختیار و ارادہ

قرآنِ کریم نے انسان کا سب سے بڑا شرف یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے اور پھر اس کے اس شرف کا اس قدر احترام کیا ہے کہ وہ اس کے اس اختیار و ارادہ کو اس سے کبھی نہیں چھینتا۔ وہ اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ اس سے کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (۴۱/۴۰) تم اپنے دائرۂ اختیارات میں اپنی "مشیّت" کے مطابق کام کرو۔ تم اپنے فیصلوں کے مطابق جس طرح جی میں آئے کرو۔ یہ ہے انسان کا مقام بلند۔ لیکن شرک میں انسان اپنے اختیار و ارادہ کو دوسروں کے سپرد کر دیتا ہے اور اس طرح شرفِ انسانیّت سے عاری ہو جاتا ہے۔ دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کہاں تک آگے جاتا ہے اور انسان کو کس قدر بلند مقام تفویض کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شرک سے انسان کی کیفیّت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں اور کاموں کی ذمّہ داری لینے سے ڈرتا ہے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں رہتی کہ وہ مردانہ وار کہے کہ ہاں! میں نے یہ کیا ہے اور میں اس کا خمیازہ بھگتنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔ اس کے برعکس، وہ چاہتا ہے کہ اپنے اعمال کی ذمّہ داری دوسروں کے سر تھوپ دے۔ سورۂ نحل میں ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ (۱۶/۳۵) اور جو لوگ شرک کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبودیّت اختیار نہ کرتے۔ دیکھا آپ نے! شرک سے انسان کے حوصلے کس قدر پست ہو جاتے ہیں۔

شرک کی خرابیاں

تصریحاتِ بالا سے یہ نکتہ واضح ہو گیا ہوگا کہ شرک سے مفہوم کیا ہے اور اس سے قرآنِ کریم نے اس شدّت سے کیوں منع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کائنات میں بہت بلند مقام عطا کیا ہے لیکن شرک سے انسان اپنے آپ کو اس بلند مقام سے گرا کر ذلّت و پستی کے عمیق گڑھے میں جا پہنچتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا اگر انسان ہمارے پروگرام کے مطابق چلتا تو یہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جاتا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ۔ لیکن یہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک جاتا ہے وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (۷/۱۷۶) یعنی ہمارے قوانین کا اتّباع کر کے دنیا میں سرفرازی سے چلنے کے بجائے اپنے جذبات کا اتّباع کرتا ہے اور یوں شرف و

مجد کی بلندیوں سے گر کر ذلّت و خواری کی پستیوں میں جا پہنچتا ہے۔ یہ ہے شرک کا نتیجہ، یعنی اس سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا، خود انسان اپنے بلند مقام کو کھو دیتا ہے اور یہ بہت بڑا نقصان ہے اور کوئی نقصان بھی ہو اس کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن جب انسان اپنے مقامِ انسانیّت ہی سے گر جائے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کے اس ارشاد کا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ (۴/۱۱۶) خدا کے قانونِ مشیّت کے مطابق انسان کے ہر غلط اقدام کے نقصان رساں نتیجہ سے حفاظت کا سامان مل سکتا ہے لیکن جو نقصان شرک سے مرتّب ہوتا ہے، اس سے حفاظت نہیں مل سکتی۔ انسان اپنے مقام کو نہ کھوتے تو اس کی لغزشوں کی تلافی ہو سکتی ہے لیکن جب وہ اپنے مقامِ بلند ہی کو کھو بیٹھے تو اس نقصان کی تلافی کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ انسانیّت کی دنیا میں شرک سے بڑا کوئی جرم نہیں۔ اس سے انسان اپنے بلند مقام سے گر جاتا ہے۔ قرآن کی ساری تعلیم کا مقصود و منتہیٰ انسان کو اس کے صحیح مقام تک پہنچا دینا ہے اور یہ توحید کے سوا ممکن ہی نہیں۔ یعنی اس ایمان کے سوا کہ جھکنا صرف قوانینِ خداوندی کے سامنے ہے، کسی اور کے سامنے نہیں۔

یہ ہے صحیح مقامِ انسانیّت۔!